بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامیات

انشائیہ

افسانے

انٹرویو

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

مستقل سلسلے

☆☆☆

سردار طاہر محمود نے نواز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ، **ماھنامه حنا** پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ اردو بازار لاہور فون: 042-37321690, 042-37310797 ای میل ایڈریس،
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com

قارئین کرام! مارچ 2016ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

آج کل ملک میں کرپٹ عناصر کے خلاف نیب کی کاروائیوں پر احتجاج کا طوفان اُٹھا ہوا ہے۔ تمام سیاسی پارٹیاں نیب کے خلاف یکجان نظر آ رہی ہیں۔ حالانکہ دیکھا جائے تو ہر شخص کرپشن کے خلاف بیان دے گا اور یہی کہے گا کہ کرپشن میں تمام برائیوں کی جڑ ہے اور اگر ملک سے اس کا خاتمہ کر دیا جائے تو بہت سے مسائل سے نجات مل سکتی ہے۔ لیکن یہ بات ہر شخص دوسرے کے بارے میں کہتا ہے اور جب اس کا احتساب کیا جائے تو شور مچانا شروع کر دیتا ہے کہ اس کے خلاف انتقامی کاروائی ہو رہی ہے۔

ہماری نظر میں یہ بات بالکل درست ہے کہ اوپر سے نیچے تک سب کا احتساب ہونا چاہیے اور بلا امتیاز ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ کرپشن کا ملزم کوئی صاحب حیثیت ہے یا کوئی عام آدمی۔ ملک میں کرپشن کا جو حال ہے اس میں چھوٹے بڑے کی تخصیص نہیں ہونی چاہیے۔ ملک کی بقاء کے لئے کسی نہ کسی کو تو یہ کام کرنا ہے اس لئے اگر نیب بڑی مچھلیوں پر ہاتھ ڈالتی ہے تو اس کا راستہ روکنے کی بجائے اس کی تحسین کرنی چاہیے اور اس کا حوصلہ بڑھانا چاہیے۔ ملک میں اگر بے یقینی کی حالت ہے اور جرائم کی شرح بڑھ رہی ہے تو اس کی ایک وجہ کرپشن بھی ہے۔ جس سے قومی وسائل کی لوٹ مار ہوتی ہے اور ان کی منصفانہ تقسیم ممکن نہیں رہتی۔ دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ جاتی ہے جس سے ملک کی ترقی متاثر ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس امر کو بھی یقینی بنانا چاہیے کہ احتساب منصفانہ ہو، یہ نہ ہو کہ افسران لوگوں کو دھمکانے کے لئے بلاوجہ ان کو احتساب کے نام پر بلا کر دفتروں میں ذلیل کریں۔ ضروری یہ ہے کہ کرپشن کے خلاف مقدمات کی تحقیقات جلد از جلد مکمل کی جائیں اور مقدمات عدالت میں پیش کیے جائیں کیونکہ اگر دیر کی جائے تو ملزمان مل ملا کر شواہد مٹانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اس طرح صاف چھوٹ جاتے ہیں۔ اگر نیک نیتی سے کوشش کی جائے تو ملک میں کرپشن سے پاک معاشرے کے قیام کا دیرینہ خواب پورا ہو سکتا ہے۔

اس شمارے میں:۔ ایک دن حنا کے ساتھ میں مہمان نازش امین، صدف اعجاز اور فلک ارم ذاکر کے مکمل ناول، فرح بخاری اور رمشا احمد کے ناولٹ، شگفتہ شاہ، قرۃ العین ہاشمی، عمارا امداد، تمثیلہ زاہد، حمیرا نوشین، شبانہ شوکت اور فاطمہ خان کے افسانے، سدرۃ المنتہیٰ، نایاب جیلانی اور اُم مریم کے سلسلے وار ناولوں کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر

سردار محمود

ہے نرغۂ اعدا میں کہ تنہا بھی بہت ہے
دل کو تری رحمت پہ بھروسا بھی بہت ہے

ہے کسی غیر کی چاہت کا ٹھکانہ بھی دلوں میں
اور ان کو ترے عشق کا دعوا بھی بہت ہے

دے ان کو مگر کوئی بشارت ہی کا موسم
دکھ جن کے مقدر میں لکھا بھی بہت ہے

کیوں کر وہ سمجھ پائیں ترے حسن کو یارب
دل جن کے مقدر میں لکھا بھی بہت ہے

رک جائے قلم حرف ثنا پر مرا آ کر
ہر چند سخن کا یہ سلیقہ بھی بہت ہے

سمجھو نہ تو دریا و سمندر نہیں کافی
گر سمجھو تو مکڑی کا یہ جالا بھی بہت ہے

بخشش کہ یہ لائق نہیں تو پھر بھی کرم کر
نعمان اکیلا بھی ہے پیاسا بھی بہت ہے

نعمان فاروق

نعت رسول مقبول ﷺ

ٹھے نگاہ تو دیکھیں جدھر مدینے میں
نا رکھے ہیں فرشتوں نے گھر مدینے میں

نبیؐ کے نور کی پاکیزگی ایسی طلب
کہ ہیں طواف میں شمس و قمر مدینے میں

ہوا میں پاک و مطہرہ اثر رکھیں پیہم
رم سے آئے ہوئے ہیں شجر مدینے میں

بیان کرتے ہیں تفسیر سورۂ رحمٰن
گل و شگوفہ و برگ و ثمر مدینے میں

وہاں سے منزل عرفان بلانے لگتی ہے
تمام ہوتا نہیں ہے سفر مدینے میں

ملے کچھ اس طرح دست طلب دراز نہ ہو
کہیں بھی ایسا نہیں ہے مگر مدینے میں

وہ چند روز سہی زندگی کا حاصل ہیں
جو ہو گئے ہیں تصور بسر مدینے میں

یعقوب تصور

پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں

سیدہ اختر ناز

اللہ کی محبت

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''بے شک اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرئیل علیہ السلام کو بلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں پس تو بھی اس سے کر، پھر جبرئیل علیہ السلام اس سے محبت کرتے ہیں اور آسمان میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو، پھر آسمان والے فرشتے اس سے محبت کرتے ہیں، اس کے بعد زمین والوں کے دلوں میں وہ مقبول ہو جاتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی آدمی سے دشمنی رکھتا ہے جو جبرئیل علیہ السلام کو بلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ میں فلاں کا دشمن ہوں تو بھی اس کا دشمن ہو تو پھر وہ بھی اس کے دشمن ہو جاتے ہیں پھر آسمان والوں میں منادی کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے دشمنی رکھتا ہے، تم بھی اس کو دشمن رکھو، وہ بھی اس کے دشمن ہو جاتے ہیں، اس کے بعد زمین والوں میں اس کی دشمنی جم جاتی ہے۔'' (یعنی زمین میں بھی اللہ کے جو نیک بندے یا فرشتے ہیں، وہ اس کے دشمن رہتے ہیں۔) (مسلم)۔

بھائی چارہ

سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''مومن (دوسرے) مومن کے لئے ایسا ہے جیسے عمارت میں ایک اینٹ دوسری اینٹ کو تھامے رہتی ہے (اسی طرح ایک مومن کو لازم ہے کہ دوسرے مومن کا مددگار رہے۔)

سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''مومنوں کی مثال ان کی دوستی، اتحاد اور شفقت میں ایسی ہے جیسے ایک بدن کی، (یعنی سب مومن مل کر ایک قالب کی طرح ہیں) بدن میں سے جب کوئی عضو درد کرتا ہے تو سارا بدن اس (تکلیف) میں شریک ہو جاتا ہے، نیند نہیں آتی اور بخار آ جاتا ہے۔'' (اسی طرح ایک مومن پر آفت آئے خصوصاً وہ آفت جو کافروں کی طرف سے پہنچے تو سب مومنوں کو بے چین ہونا چاہیے اور اس کا علاج کرنا چاہیے۔) (مسلم)۔

پردہ پوشی کے بیان میں

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''جب کسی بندے پر اللہ تعالیٰ دنیا میں پردہ ڈال دیتا ہے تو آخرت میں بھی پردہ ڈالے گا۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''جو کوئی شخص دنیا میں کسی بندے کا عیب چھپائے گا، اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) اس کا

عیب چھپائے گا۔'' (مسلم)

نرمی کے بارے میں

سیدنا جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے۔

''جو شخص نرمی سے محروم ہے، وہ بھلائی سے محروم ہے۔''

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتی ہیں، کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''جب کسی میں نرمی ہو تو اس کی زینت ہو جاتی ہے اور جب نرمی نکل جائے تو عیب ہو جاتا ہے۔'' (مسلم)

تکبر کرنے والے کے بارے میں

سیدنا ابو سعید خدری اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''عزت اللہ تعالیٰ کی چادر ہے اور برائی اس کی چادر ہے (یعنی یہ دونوں اس کی صفتیں ہیں) پھر اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ جو کوئی یہ دونوں صفتیں اختیار کرے گا میں اس کو عذاب دوں گا۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تین آدمیوں سے بات تک نہ کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا، نہ ان کی طرف (رحمت کی نظر سے) دیکھے گا اور ان کو دکھ کا عذاب ہے، ایک تو بوڑھا زنا کرنے والا، دوسرے جھوٹا بادشاہ، تیسرے مغرور محتاج۔'' (مسلم شریف)

اللہ تعالیٰ پر قسم اٹھانے والے کے متعلق

سیدنا جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا۔

''ایک شخص بولا کہ اللہ کی قسم، اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو نہیں بخشے گا۔''

''اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ کون ہے جو قسم کھاتا ہے کہ میں فلاں کو نہ بخشوں گا، میں نے اس کو بخش دیا اور اس کے (جس نے قسم کھائی تھی) سارے اعمال لغو (بیکار) کر دیئے۔'' (مسلم شریف)

برے شخص کا بیان

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اندر آنے کی اجازت مانگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''اس کو اجازت دو یہ اپنے کنبے میں ایک برا شخص ہے۔''

جب وہ اندر آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے نرمی سے باتیں کیں تو ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا۔

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو اس کو ایسا فرمایا تھا پھر اس سے نرمی سے باتیں کیں۔''

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''اے عائشہ! برا شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیامت میں وہ ہو گا جس کو لوگ اس کی بدگمانی کی وجہ سے چھوڑ دیں۔'' (مسلم شریف)

درگزر کرنے کے بیان میں

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''صدقہ دینے سے کوئی مال نہیں گھٹتا اور جو بندہ معاف کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی عزت بڑھاتا ہے اور جو بندہ اللہ تعالیٰ کے لئے عاجزی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کا درجہ بلند کرتا ہے۔'' (مسلم شریف)

غصہ کے وقت پناہ مانگنے کا بیان

سیدنا سلیمان بن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ دو آدمیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے گالی گلوچ کی، ایک کی آنکھیں لال ہو گئیں اور گلے کی رگیں پھول گئیں۔
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''مجھے ایک کلمہ معلوم ہے کہ اگر یہ شخص اس کو کہے تو اس کا غصہ جاتا رہے، وہ کلمہ یہ ہے اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔'' (مسلم شریف)

راستہ صاف کرنے کا بیان

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''ایک شخص نے راہ میں کانٹوں کی ڈالی دیکھی تو کہا کہ اللہ کی قسم میں اس کو مسلمانوں کے آنے جانے کی راہ سے ہٹا دوں گا تاکہ ان کو تکلیف نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے اس کو جنت میں داخل کیا۔''

سیدنا ابو برزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ ''یا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جس سے میں فائدہ اٹھاؤں۔''
تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''مسلمانوں کی راہ سے تکلیف دینے والی چیز کو ہٹا دے۔''

مومن کی مصیبت کا بیان

اسود کہتے ہیں کہ قریش کے چند جوان لوگ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس گئے اور وہ منیٰ میں تھیں وہ لوگ ہنس رہے تھے۔

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پوچھا۔
''تم کیوں ہنستے ہو؟''
انہوں نے کہا کہ ''فلاں شخص خیمہ کی طناب پر گرا اور اس کی گردن یا آنکھ جاتے جاتے بچی۔''
ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا ''مت ہنسو اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مسلمان کو ایک کانٹا لگے یا اس سے زیادہ کوئی دکھ پہنچے تو اس کے لئے ایک درجہ بڑھے گا اور ایک گناہ اس کا مٹ جائے گا۔'' (مسلم شریف)

مومن کی تکلیف

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے۔
''مومن کو جب کوئی تکلیف یا ایذا یا بیماری یا رنج ہو یہاں تک کہ فکر جو اس کو ہوتی ہے تو اس کے گناہ مٹ جاتے ہیں۔''
سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری کہ۔
''جو کوئی برائی کرے گا اس کو اس کا بدلہ ملے گا۔'' تو مسلمانوں پر بہت سخت گزرا (کہ ہر

گناہ کے بدلے ضرور عذاب ہوگا)۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''میانہ روی اختیار کرو اور ٹھیک راستہ کو ڈھونڈو اور مسلمان کو (پیش آنے والی) ہر ایک مصیبت (اس کے لئے) گناہوں کا کفارہ ہے، یہاں تک کہ ٹھوکر اور کانٹا بھی۔'' (گویا بہت سے گناہوں کا بدلہ دنیا ہی میں ہو جائے گا اور امید ہے کہ آخرت میں مواخذہ نہ ہو۔ (مسلم شریف)

دوسرے مسلمان سے برتاؤ

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''ایک دوسرے سے بغض مت رکھو اور ایک دوسرے سے حسد مت رکھو اور ایک دوسرے سے دشمنی مت رکھو اور اللہ کے بندو بھائیوں کی طرح رہو اور کسی مسلمان کو حلال نہیں ہے کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ تک (بغض کی وجہ سے) بولنا چھوڑ دے۔'' (مسلم شریف)

سلام میں پہل

سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''کسی مسلمان کو یہ بات درست نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین راتوں سے زیادہ تک (بولنا) چھوڑ دے، اس طرح کے وہ دونوں ملیں اور ایک اپنا منہ ادھر اور دوسرا اپنا منہ ادھر پھیر لے اور ان دونوں میں بہتر وہ گا جو سلام میں پہل کرے گا۔''

کینہ رکھنا اور آپس میں قطع کلامی

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''جنت کے دروازے پیر اور جمعرات کے دن کھولے جاتے ہیں، پھر ہر ایک بندے کی مغفرت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا لیکن وہ شخص جو اپنے بھائی سے کینہ رکھتا ہے، اس کی مغفرت نہیں ہوتی اور حکم ہوتا ہے کہ ان دونوں کو دیکھتے رہو جب تک کہ صلح کر لیں۔'' (جب صلح کر لیں گے تو ان کی مغفرت ہوگی)۔

بدگمانی سے بچنے کا حکم

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''تم بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی بڑا جھوٹ ہے اور کسی کی باتوں پر کان مت لگاؤ اور جاسوسی نہ کرو اور (دنیا میں) رشک مت کرو (لیکن دین میں درست ہے) اور حسد نہ کرو اور بغض مت رکھو اور دشمنی مت کرو اور اللہ کے بندے اور (آپس میں) بھائی بھائی بن جاؤ۔'' (مسلم شریف)

☆☆☆

ابن انشاء

ایک اخبار کے ایک مضمون سے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ جناب جوش ملیح آبادی کی پوتی کو شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ ستار بجاتی ہیں، ہماری خوشی یا اطمینان کا باعث یہ نہیں کہ خدانخواستہ ہم جوش مدظلہ کے مداح یا قدر شناس نہیں، بلکہ یہ ہے کہ ہم اپنے بھتیجے بابر میاں سے آزردہ تھے جس کا رویہ ہماری نظم و نثر کے بارے میں کچھ اس قسم کا ہے، ہم نے اس عزیز مکرم کو کئی بار اپنی آزاد نظمیں سنائیں، افلاطون کی مابعد الطبیعات پر لیکچر دیا، علم عروض اور زمافات کے نکات سمجھانے کی سعی بھی کی حتیٰ کہ ایک بار یورپ کی مشترکہ منڈی اور اس کے دور رس اثرات کو بھی موضوع بحث بنایا، لیکن اس نے ہمیشہ جمائی لے کر ٹالا اور اپنا گلی ڈنڈا اٹھا کر گلی میں بھاگ گیا، حالانکہ وہ اب کوئی بچہ نہیں، اگلے ستمبر میں پورے دس سال کا ہو جائے گا۔

لیکن لوگوں نے اس صورت حال سے ایک نہایت غلط رائے بھی قائم کی اور وہ یہ کہ عزیز مذکور کو ادب عالیہ اور دقیق معاشی مسائل سے عدم دلچسپی بلکہ پڑھنے لکھنے سے گریز کی وجہ ہم خود ہیں، نہ ہم اس کو ان مسائل میں الجھا کر اور بڑی بڑی اصطلاحیں بول کر ڈراتے نہ وہ گلی ڈنڈے سے اتنی شیفتگی کا اظہار کرتا، ایسے نکتہ چینوں سے کسی کو پناہ نہیں، کیا عجب وہ کل جوش صاحب سے بھی یہی کہیں کہ جناب اگر آپ نعت ہائے حجازی سے زبان کو اتنا گراں مایہ نہ بناتے اور سیدھے زبان میں شعر کہتے اور اک رنگ کا مضمون سو ڈھنگ سے باندھنے پر اصرار نہ کرتے تو آج آپ کی پوتی ادب سے اتنی دور نہ ہوتیں کہ ستار لے بیٹھتیں۔

اب رہی یہ دلیل کہ ستار بجانا کوئی بری بات نہیں ایک بڑا محترم آرٹ ہے اور جوش صاحب خضوع و خشوع سے بیٹھ کر پوتی کا الاپ سنتے ہیں تو ہم بھی انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے ہوئے عرض کریں گے کہ گلی ڈنڈا بھی اسپورٹس کے زمرے میں آتا ہے اور جب ہمارا لائق بھتیجا ڈنڈے سے مزے کا ٹل لگاتا ہے (ٹل کی اصطلاح جوش صاحب کیا سمجھیں گے یہ ستار یا علم موسیقی نہ باشد) تو ہم بھی واہ واہ کرتے ہیں اور جب میچ ہوتے ہیں تو اتنے لوگ اسپورٹس دیکھنے کو جمع ہوتے ہیں کہ ستار نوازی کی کسی محفل کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتے، اس موقع پر ہم اس امر سے بے خبر نہیں کہ بعض لوگ گلی ڈنڈے کو اسپورٹس میں شمار نہیں کرتے، لیکن لوگوں کا کیا ہے، وہ تو بیر

کو بھی پھل ہیں سمجھتے۔

ان مثالوں سے اس راز پر سے بھی پردہ اٹھ جائے گا کہ بڑے بڑے علماء فضلاء کے لڑکے ڈاکٹر یا انجینئر کیوں بنتے ہیں اور بڑے بڑے شعرا یعنی تلامیذ الرحمٰن کے صاحبزادگان کیوں تمباکو، صابن، کٹ پیس بیچتے نظر آتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کو جب بیرون در کوئی سامع نہیں ملتا اور غزل لکھی رکھی ہے، لیکن کوئی مشاعرہ ہونے کی خبر نہیں تو وہ گھر سے خیرات شروع کرنے کا اصول برتنا شروع کر دیتے ہیں، بس یہیں سے خرابی کا آغاز ہو جاتا ہے، کلام کوئی ایسا بار تو نہیں کہ ہر کوئی اس کا متحمل ہو سکے، ہمارے ایک بزرگ دیوانہ ناگپوری اپنے ایک فرزند سے اپنے اشعار کی تقطیع کرایا کرتے تھے اور اپنی غزل اور قصیدے پر داد طلب کیا کرتے تھے، وہ گھر سے ایسا بھاگا کہ پھر واپس نہ آیا، دیوانہ صاحب ہمارے مشورے پر کئی بار اشتہار بھی دے چکے ہیں کہ ”عزیزم واپس آ جاؤ، اب تمہیں کوئی غزل نہ سنائی جائے گی۔“ لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا، اس کا راز حال میں کھلا، صاحبزادے کراچی کے ایک مشہور سینما میں گیٹ کیپر ہیں اور کتاب تو ایک طرف اخبار دیکھ کر کانپنے لگتے ہیں کہ اس میں کہیں ابا میاں کی غزل نہ چھپی ہو۔

ہماری نثر تو آپ لوگوں کے سامنے آتی ہی ہے، لیکن اگر ادارہ حنا ہماری غزلیں چھاپنے میں صاف انکار نہ کرتا تو قارئین حضرات دیکھتے کہ شاعری میں ہمارا کیا مقام ہے، یہ قدر ناشناسی حنا والوں تک محدود نہیں، کئی بار ایسا ہوا کہ کوئی آل پاکستان مشاعرہ ہوا اور منتظمین نے ہمارا نام شاعروں کی فہرست میں دے دیا، اشتہار کے چھپنے کا فوری اثر ہم نے یہ دیکھا کہ مشاعرے کے ٹکٹ بکنا بند ہو گئے اور جن لوگوں نے پہلے خرید رکھے تھے انہوں نے اپنی رقم کی واپسی کا تقاضا شروع کر دیا۔

ہمیں اس صورت حال پر ہمیشہ ملال ہوتا تھا، لیکن ہمارے ایک ناصح مشفق نے کہا کہ بڑے آدمی کی قدر اس کے اپنے ملک میں کبھی نہیں ہوتی کسی اور ملک میں جا کر کوشش کرو، ہمارا چین جانا ایک طرح سے اسی پلان کے تحت تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے سب ہی مقولے ہمیشہ ٹھیک ثابت نہیں ہوتے، پیکنگ میں ڈاکٹر عالیہ امام نے ایک روز ایک محفل کا بندوبست کیا جس میں پاکستانی سفارت خانے کے کچھ افسر اور ان کی بیگمات بھی تھیں، ہم نے اپنی طرف سے اپنی بہترین غزل نکال کر پڑھی، کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی، تھوتھا سا منہ بنا کر بیٹھے دیکھتے رہے، عالیہ بیگم نے ضرور بے دلی سے ایک بار واہ واہ کی، اب ہم نے ایک اور غزل عرض کی، اس کا نتیجہ بھی یہی نکلا، غزلیں تو ہم اپنی جیب میں حسب عادت بارہ چودہ لے کر گئے تھے، لیکن یہ رنگ محفل دیکھ کر معذرت کر لی کہ اب کچھ یاد نہیں، کچھ صاحبان نے اس پر اطمینان کا سانس لیا، البتہ ہمارے بالکل قریب جو بیگم صاحبہ بیٹھی تھیں ان کو کچھ ہمارا خیال ہوا اور ہمارے کان کے پاس منہ لا کر پوچھنے لگیں۔

”غزلیں جو آپ نے پڑھیں، کیا آپ کی اپنی لکھی ہوئی تھیں، آپ شاعر ہیں کیا؟“

ہمارا خیال ہے، ہم کچھ دیر اور بیٹھتے تو لوگ ہم سے جگر یا شکیل بدایونی کا کلام خوش الحانی سے پڑھنے کی فرمائش کرتے، بلکہ کیا عجب ہمیں حاضرین کے پرزور اصرار پر کسی تازہ پاکستانی فلم کے گانے بھی سنانے پڑتے۔

☆☆☆

ڈاکٹر نازش امین

قاری کا منصف سے دلی و جذباتی تعلق ہوتا ہے، ایسا تعلق جو ان کے دلوں کو جکڑے رکھتا ہے، ہماری قارئین بھی مصنفین سے ایسی ہی دلی وابستگی رکھتی ہیں اور وہ مصنفین کے بارے میں جاننا چاہتی ہیں کہ ان کی ذاتی زندگی، خیالات، احساسات وہ جاننا چاہتی ہیں کہ کیا مصنفین بھی عام لوگوں کی طرح ہوتے ہیں یا ان کے شب و روز میں کچھ انوکھا ہے ہم نے قارئین کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک سلسلہ شروع کیا ہے "ایک دن حنا کے نام" جس میں ہر ماہ ایک مصنفہ اپنے ایک دن کا احوال لکھیں گی کو صبح آنکھ کھلنے سے لے کر رات نیند کو خوش آمدید کہنے تک وہ کون کون سی مصروفیات ہے لکھنے کے علاوہ جو وہ انجام دیتی ہے، امید ہے آپ کو یہ سلسلہ پسند آئے گا۔

فوزیہ شفیق

رات باقی تھی ابھی
جب سر بالیں آ کر
چاند نے مجھ سے کہا
جاگ سحر آئی ہے

پھر ایک اور دن تمام ہوتا ہے اور رات ہوتی ہے، رات جس کا پورے دن میں شدت سے انتظار کرتی ہوں، کیونکہ یہ وہ واحد وقت ہوتا ہے جو میں اپنے ساتھ بسر کرتی ہوں۔

رات میری سہیلی ہے، میرے اچھے برے لمحوں کی راز دار، رات جس سے میں سب کہہ دیتی ہوں اور اس میں، میں وہ نہیں ہوتی جو دن بھر ہوتی ہوں۔

دن بھر میں ڈاکٹر نازش جو ایک پتھولوجسٹ بھی ہے اور میڈیکل کے طلبہ اور طالبات کو پڑھانے والی ٹیچر بھی جو ایک M.Phil سکالر بھی ہے اور ایک بیوی اور ماں بھی، بہت سے کردار ہیں میرے جو میں دن بھر نبھاتے جب تھک کر چور ہو جاتی ہوں تو رات کا انتظار کرتی ہوں، جب میں صرف نازش امین ہوتی ہوں، جو کہ شاعرہ بھی ہے اور ایک لکھاری بھی۔

میں نے انگریزی زبان میں شاعری لکھی اور اس قدر تو لکھ چکی ہوں کہ کتاب چھپنے کو ہے مگر وقت کی قلت اور ذمہ داریوں کی شدت کے بیچ

میں کہیں ٹھہر گئی ہے، اردو میں بہت کم لکھا ہے اور جو کچھ لکھا وہ حنا کے توسط سے آپ تک طویل وقفوں سے پہنچتا رہا اور یقین جانئیں تو بہت ہاتھ فوزیہ شفیق کی محبت کا بھی ہے ورنہ اتنا لکھنا بھی محال تھا۔

باقاعدگی سے آن لان بلاک لکھتی ہوں اور اچھی کتابیں پڑھتی ہوں، انگریزی میں پہلا ناول لکھنا شروع کیا تو کافی لکھ ڈالا مگر پھر پوسٹ گریجویشن کی پڑھائی نے سلسلہ روک لیا سو اب با آسانی سے مجھے ان لوگوں میں شامل کر لیں جن کے لئے فیض نے کہا تھا، کچھ عشق کیا کچھ کام کیا۔

سو رات مجھے جگاتی ہے، سبز چائے یا سرخ کافی کی وجہ سے نیند کم لے پاتی ہوں، صبح نماز کے وقت جاگ جاتی ہوں، بیٹی کو اسکول روانہ کر کے کوئی آدھ گھنٹہ واک کرتی ہوں، ساتھ میں وہی سبز چائے ہوتی ہے جس کے بغیر نیند سے بوجھل آنکھیں کھلتی بھی نہیں۔

کمرہ سمیٹنا، ناشتہ بنانا، میاں صاحب اور میں ناشتہ اکٹھے کرتے ہیں پھر وہ اپنے دفتر اور میں اپنی یونیورسٹی روانہ ہو جاتے ہیں، اپنے دفتر پہنچ کر پہلے تلاوت قرآن پاک کرتی ہوں، پھر اگر کوئی میٹنگ یا پیپر ورک ہو، وہ نبٹاتی ہوں، میں میڈیکل کے طالب علموں کو پڑھاتی ہوں، ساتھ ہی پوسٹ گریجویشن کا سلسلہ ہے، تھیسس پر کام جاری ہے، سپروائزر سے ملنے جناح ہسپتال بھی جانا ہوتا ہے یوں کافی بھاگ دوڑ میں دن گزرتا ہے۔

واپسی کوئی تین بجے تک ہوتی ہے، پھر گھر کی ذمہ داریاں، بیٹی سے گپ شپ، اسکول کا ہوم ورک، کھانا بنانا، لانڈری، صفائی کے کچھ باقی ماندہ کام، کچن دیکھنا، جو کچھ بھی چھوٹے موٹے گھر میں کام ہو سکتے ہیں، اس سب میں مصروف رہتی ہوں، کبھی کبھی لگتا ہے دن کی مشینی رفتار میں اگر نماز نہ ہو تو انسان خود کو اپنی ذات کو اپنی روح کو کیسے سیراب کرے، مجھے نماز یہ یاد دلاتی ہے کہ سب سے اہم ذمہ داری تو میری اللہ سے ملاقات ہے، جو مجھے تھکاتی نہیں بلکہ نیا حوصلہ دیتی ہے۔

رات نو کے بعد جب بیٹی سو جاتی ہے، میں پھر اگلے دن کی تیاری کرتی ہوں، تھیسس کا کام، کچھ دیر چہل قدمی، یا پھر آن لائن دوستوں سے رابطہ، یا پھر پڑھنے لکھنے کا سلسلہ۔

میری زندگی میں ٹی وی اور موویز کا بہت کم وقت ہے، لیکن ان کے لئے بھی وقت نکال لیتی ہوں، موسیقی سے کافی لگاؤ ہے جو کام کرتے ہوئے پورا ہو ہی جاتا ہے۔

کہانیاں جو لکھنا ہیں بہت سی ہیں، زیادہ ذہن کے کونے میں، کچھ خاکے بنائے ہوئے کاغذوں پر اپنی ڈگری کے سلسلے سے فارغ ہو کر ارادہ تو یہی ہے کہ بہت لکھنا ہے، کتاب نہیں کتابیں چھپوانی ہے، اگر زندگی نے ساتھ دیا، پلاننگ تو بہت ہے مگر بہترین پلانز تو وہ ہے اس کا حکم ہوا تو آپ کی محفل میں آنا جانا لگا رہے گا۔

آج ان سب قارئین کو شکریہ کہنا چاہتی ہوں جو مجھے پڑھتے ہیں اور یاد بھی رکھتے ہیں، یقین جانیں بڑا گہرا یہ ربط ہے جو لفظوں کا رشتہ ہے، میں آپ سب کی اور حنا کی مدیرہ فوزیہ کی بے حد مشکور ہوں، دعا کی طالب ہوں، اگر یاد رہے۔

☆☆☆

دل گزیدہ

ام مریم

تیسری قسط خلاصہ

ماضی کی یادوں کے سرابوں میں بھٹکتی ہوئی عورت پچھتاوے کے جان لیوا عذاب سے دوچار ہر لمحہ خود کو فریب دینے کی کوشش میں سرگرداں اپنے نقصان کو بھولنے کی سعی میں مصروف ہے۔

مون مضبوط قوت ارادی اور بلند حوصلوں کا مالک ایسا شخص ہے جسے پلٹ کر پیچھے دیکھنا وقت کے زیاں کے علاوہ کچھ نہیں لگتا، وہ آگے دیکھنا نئی منزلوں کو پا لینے کا عزم رکھنے والا انسان ہے،

[illegible]

میب چوہدری کو ماضی کا ایک تلخ تجربہ محتاط ہی نہیں زہر خند بھی کر چکا ہے، وہ خود کو مزید تجربات کی نذر ہوتے برداشت نہیں کر سکتا، مگر حالات جیسے اس کے اختیار سے باہر ہو رہے ہیں۔

ناتیہ لاابالی اور نوعمر دوشیزہ...... جو پہلی نظر کی محبت کے جال میں ایسے پھنسی ہے کہ خود بھی نکلنا نہیں چاہتی۔

اب آپ آگے پڑھیئے

یہ ان کی سسکیاں اور کراہیں ہی تھیں کہ وہ چونک اٹھا، ان کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ بے ساختہ سیدھا کھڑا ہو گیا تھا، پازیب اس نے بظاہر لاپرواہ انداز میں واپس دراز میں پھینک دی تھی۔

''آپا میرے کمرے کی صفائی کروا دیں، تمام بے کار اشیاء نکال دیجئے گا، تمام بے کار اشیاء...... آپ سمجھ رہی ہیں؟'' وہ ان سے نگاہیں چار نہیں کر رہا تھا، مگر اس کی آواز صاف اور متوازن تھی، مضبوط تھی۔

''تم کہہ رہے تھے بچے کو ملانے لاؤ گے، اتنے دن ہو گئے انتظار کرتے ہوئے۔'' انہوں نے بھی خود پہ قابو پالیا، اس تکلیف دہ موضوع کو نہ چھیڑنا ہی بہتر تھا اب۔

''انتظار ہی میں بھی کر رہا ہوں آپا، کچھ اور آپ بھی کر لیں۔'' وہ اپنی مطلوبہ فائل اٹھا کر واپس صوفے پہ جا بیٹھا تھا، پہلے کی طرح نارمل سنجیدہ مضبوط اور شاندار نظر آتا ہوا بے حد شاندار نظر آتا ہوا، سحر طاری کرتا ہوا، طلسم پھونکتا ہوا، کیا شک تھا کہ وہ بہت وجیہہ و شاندار تھا۔

''کیا مطلب؟ کیس چل رہا ہے عدالت میں تمہارا؟'' وہ ٹھٹھک کر سوال کر رہی تھیں۔

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ فائل کے صفحے پلٹ رہا تھا، انہوں نے اچنبھے و الجھن میں گھر کر اسے دیکھا، گویا سمجھنے سے قاصر رہی ہوں۔

''ابھی چند ماہ ہیں دوسرے بچے کے دنیا میں آنے میں آپا، اس بات کا فیصلہ تب ہو گا۔'' وہ ان کی الجھن محسوس کر کے ہی جواب میں وضاحت دے رہا تھا، انہوں نے گہرا سانس بھر لیا۔

''یعنی ایک بچہ تم لے لو گے اور ایک اس کے پاس رہے گا؟''

''ابھی ایسا بھی کچھ طے نہیں ہوا، آپا پلیز تھوڑا انتظار کر لیں۔'' وہ اب کے ذرا سا جھلا کر بولا تھا، انہوں نے سرد آہ بھر کے محض سر ہلا دیا۔

''میں کھانے کا پوچھنے آئی تھی اور یہ بھی کہ تمہارے بھائی جان کی طبیعت کچھ ناساز ہے، مجھے جانا پڑے گا۔''

''آپ ضرور چلی جائیں آپا اور میں کھانا نہیں کھاؤں گا، کافی کا ایک مگ بھجوا دیں، بھائی جان کی خیریت معلوم کرتا ہوں فون پہ۔'' وہ فائل میں گم رہ کر بول رہا تھا، انہیں عجیب سے دکھ نے آن لیا، وہ انہیں خود سے صدیوں کے فاصلے پہ محسوس ہوا، حالانکہ جب یہ پیدا ہوا تو اماں کئی ماہ بیمار رہی تھیں، اسے انہوں نے ہی پالا تھا، وہ ایسا ہلا تھا ان سے کہ اماں کے ٹھیک ہونے کے بعد بھی انہی کے ساتھ سوتا رہا، جب ان کی شادی ہوئی تو کتنا فساد مچائے رکھا تھا، مون نے حالانکہ تب دس گیارہ سال کا تھا، کتنی مشکلوں سے سنبھلا تھا اور آج کتنا بیگانہ سا لگ رہا تھا، پہنچ سے باہر، ان کا دل ایسا دکھا کہ پھر بے اس کرم جلی کو کوسنے سے خود کو نہ روک سکیں۔

☆☆☆

لازم تو نہیں ہے تمہیں آنکھوں سے ہی دیکھیں
کیا تیرا تصور تیرے دیدار سے کم ہے

اس کے ہونٹوں پہ ایک مستقل مسکان کا بسیرا تھا اور آنکھوں میں جیسے جگنوؤں کے قافلے اتر آئے تھے، محبت کی جیت اور فتح کا احساس خمار بن کر اسے بے خود کیے دیتا تھا، بے وقوف تھی، حالانکہ اس شخص کی آنکھوں میں وہ نفرت کے شعلے دیکھ چکی تھی، جو صرف اسی کے لئے تھے اور کتنے دن تک وہ اس احساس سے نہیں نکل سکی تھی کہ وہ شعلے اس کے آس پاس ابھی بھی بھڑک رہے ہیں اور ان کی تپش، یہ تپش اسے آرام سے رہنے نہیں دیتی تھی، مگر اب وہ سب کچھ فراموش کر گئی تھی، بے وقوفی ہی تھی، محبت کی حماقت اور خوش فہم بے وقوفی، گاؤں سے مہمانوں کی آمد نے اسے صبح سے متحرک کر کے رکھا ہوا تھا، وہ جو کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی، آج خود ملازماؤں کے ساتھ ہلکان ہوتی پورے گھر کو چمکانے میں مصروف تھی، کبھی کچن میں جا کر خانساماں کو کھانے کے مینو کے متعلق ہدایات جاری کرنے لگتی، مما کا ضبط جواب دیا گیا تو اس کے سر پہ آ چڑھیں۔

''مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے، کمرے میں آؤ ذرا۔'' انہوں نے دانت پیس کر کہا، ملازموں کے سامنے وہ اس کی جھاڑ جھپاڑ نہیں کر سکتی تھیں بہر حال۔

''رضیہ آپ تمام مصالحے نکالنے میں چاچا کی مدد کریں، جو چیزیں کم ہیں بازار سے منگوا لینا، کھانا میں خود بناؤں گی۔'' وہ کتنی ذمہ دار کتنی مطمئن اور خوشحال لگ رہی تھیں، مما کا خون جل کر راکھ ہوتا گیا۔

''کیا سمجھوں میں تمہارے اس انداز و اطوار سے غانیہ! کہ جو تمہارا باپ گل کھلا چکا ہے، وہ تمہاری ایما پہ کر رہا ہے سب؟ خوش تو تم ایسے ہو رہی ہو جیسے دنیا میں اچھے لڑکوں کا کال پڑ چکا ہو، غانیہ مجھے تم سے ایسے اتاؤلے پن کی قطعی امید نہیں تھی بیٹے۔'' ان کا انداز غصیلا بھڑکا ہوا تھا، وہ چوٹ کھائے سانپ کی طرح بل کھاتی تھیں، اپنی شکست کا احساس انہیں پاگل کیے دیتا تھا، غانیہ کا رنگ بالکل پھیکا پڑ گیا، وہ ماں تھیں، انہیں کیسے بتاتی انہیں ایسی نازیبا گفتگو اس سے نہیں کرنی چاہیے۔

''آپ کیا چاہتیں ہیں مما! پپا کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو جاؤں؟ جانتی ہیں کتنی بدنامی ہو گی ہماری۔'' دلی جذبات چھپا کر اس نے بظاہر عاجزی و انکساری سے انہیں رام کرنا چاہا، ممی کے سامنے منیب کے متعلق اپنے احساسات ان سے چھپائے رکھنا ہی سود مند تھا اتنا تو وہ بھی سمجھتی تھی۔

''ہاں ہو جاؤ کھڑی، میں ہوں نا تمہارے ساتھ، ویسے بھی یہ تمہارا اسٹینڈرڈ نہیں ہے، تم یہ سب ڈیزرو نہیں کرتی ہو بیٹے؟'' ان کے اک اک لفظ میں تپش تھی، اکساہٹ اور دباؤ تھا، پریشر تھا، وہ ہر صورت اسے اپنے تابع کر کے پپا کو ہرانا چاہتی تھیں، غانیہ انہیں متاسفانہ نظروں سے دیکھتی رہی، پھر جیسے کچھ سوچ کر بولی تھی۔

''آپ کو اختلاف اصل میں کس بات سے ہے مما! منیب سے؟ میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں مما وہ اس قابل ہیں کہ ان پہ ان کی رفاقت پہ فخر کیا جا سکتا ہے، آپ نے انہیں دیکھا نہیں ہے، ایک بار ان سے ملیں تو سہی، سارا اختلاف بھول جائیں گی۔'' وہ جذبات کی رو میں بہہ گئی اور مما کو آگ لگا دی، پھر وہ سوچ کر نہیں بولی تھیں۔

''مجھے کسی کو دیکھنے اور ملنے کی ضرورت ہی کیا ہے، میری بیٹی نے جو اسے دیکھ لیا، اس سے مل

لیا اور تھرڈ کلاس عورتوں کی طرح ظاہر پہ ریجھ گئی، مجھے سمجھ آگئی ہے، بلکہ ابھی تو آئی ہے۔" ان کا برہم لہجہ جہالت کی کرختگی وسفاکی کے ساتھ تلخی بھی سموئے ہوئے تھا، غانیہ کا رنگ پہلے اڑا پھر ایک دم پیلا پڑ گیا، شاید نہیں یقیناً اسے ماں سے ایسی باتوں کی توقع نہیں تھی، اس کی آنکھیں ایسے جل اٹھیں گویا کسی نے مٹھیاں بھر بھر ان میں مرچیں جھونک دی ہوں، اسے یقین نہ آتا تھا اتنے برے انداز میں اس کی گوشمالی کرنے والی اس کی پڑھی لکھی ممی ہی ہیں، کچھ دیر وہ وہیں کھڑی غم و غصے کی زیادتی سے کانپتی رہیں پھر مزید اک لفظ کہے بغیر پلٹ کر لڑکھڑاتی ہوئی وہاں سے بھاگتی اپنے کمرے میں آگئی، اس کی مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں اور ہونٹ رقت آمیز انداز میں کانپ رہے تھے، ایسی ہی اس سے بھی کڑی ذلت اسی محبت کے ہاتھوں اس نے پہلے بھی سہی تھی، اس شخص کی زبان سے، وہ تب بھی ایسے ہی ٹوٹ کر بکھری تھی، وہ اب بھی ایسے ہی بکھر رہی تھی، اس نے مشکل راہوں کا انتخاب کیا تھا، اسے اور پتا نہیں کتنی بار کب کب ایسی ذلت سہنی تھی، ایسے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنا تھا، یہ تو آغاز تھا، یہ تو کچھ بھی نہیں تھا، وہ تو غیر تھا، بجن تھا، سنگدل تھا، ایسا کر سکتا تھا، اسے اختیار تھا، یہ تو ماں تھیں، اس سے محبت کرتی تھیں، انہوں نے ایسا کیسے کر لیا، اپنے ہی بازوؤں میں منہ چھپائے وہ جانے کب تک سسکتی رہی، بے دریغ آنسو بہاتی رہی، مما نے آج اس کا دل دکھانے کی حد کر دی تھی، اسے یقین نہیں آتا تھا، یقین آگیا تو صبر نہ آتا تھا۔

اس کے بعد وہ دانستہ کمرے سے نہیں نکلی، اس میں مما کی کٹیلی نظروں کو سہنے اور سفاکانہ جملوں کو سہنے کی تاب نہیں تھی، دوپہر کے بعد گاؤں سے تاؤ جی کی فیملی آن پہنچی، دادی سے لے کر حبیب بھا کے دونوں بچوں تک، یہ لوگ بہت جوش و خروش اور پھل پھول مٹھائیوں سے لدے پھندے آئے تھے، آنے والوں میں جتنا جوش و خروش سرخوشی اور والہانہ پن پایا جاتا تھا، مما کا انداز پپا کی ہزار ہا کوشش اور سرزنش کے باوجود ایسی قدر روکھا سرد اور رہانت آمیز تھا، نخوت سے بھرا ہوا تھا، پپا خود ہر کام میں پیش پیش رہے تھے، مہمانوں کے استقبال سے لے کر ملازماؤں سے چائے پیش کروانے تک، وہ اک اک فرد کے آگے جتنا بچھے جا رہے تھے، مما اسی قدر کانٹوں پہ لوٹتی تھیں، جب یہ ضبط تمام ہوا تو اک جھٹکے سے اٹھیں۔

"غانیہ کہاں ہے چچا جان، نظر نہیں آ رہی۔" کنیز جو ماڈرن چچی کے طنزیہ سرد مہر برتاؤ سے اچھی خاصی دل برداشتہ تھی، گھبرا کر استفسار کر گئی کہ مضحکہ اڑاتی بھرجائی کی نظریں اسے شرمسار کیے جاتی تھیں۔

"اپنے کمرے میں ہے غانیہ، تیار ہو رہی ہوگی، بیٹے آپ خود اس کے پاس چلی جاؤ، وہیں بہن سے مل لو۔"

"بہن سے نہیں بھابھو سے۔" سہیل نے لطیف پیرائے میں ٹکڑا جوڑا، پپا شگفتگی سے مسکرائے، جبکہ مما کی پیشانی پہ شکنوں کا جال گہرا ہو کر رہ گیا، کنیز کی نگاہ انہی پہ تھی، جبھی دل کچھ اور گھبرایا، اس ماحول سے فرار کی غرض سے وہ تیزی سے وہاں سے اٹھ گئی، ملازمہ نے اس کی غانیہ کے کمرے تک رہنمائی کی تھی مگر اندر قدم رکھتے ہی اس کا رہا سہا اعتماد بھی جاتا رہا، گھریلو حلیے میں بکھرے بالوں کے ساتھ غانیہ بستر پہ اوندھی لیٹی تھی، چچی کے بعد اس کا یہ انداز کنیز کی جھجک اور

گریز کا باعث بن گیا تھا۔

(تو کیا چچی جان کی طرح غانیہ بھی خوش نہیں؟ اس کے ساتھ زبردستی کر رہے ہیں چاچو؟) خدشات سے بوجھل دل نے لمحوں میں لاتعداد وہم پال لئے، آہٹ پہ یونہی غانیہ بے دلی سے گردن موڑی تھی، چوکھٹ پہ کنیز کو ایستادہ پا کر وہ ایک دم جھٹکا کھا کر اٹھی۔

"تم...... تم کب آئیں بھئی؟" اگلے لمحے وہ بستر سے چھلانگ مار کر اتری اور بھاگ کر درمیانی فاصلہ سمیٹتے خود اسے گلے لگا لیا، کنیز کی جانے کب کی اٹکیں سانسیں بحال ہوئیں۔

"یہاں کیوں کھڑی ہیں، ملی نہیں مجھ سے آ کے؟ مجھے تو تمہارے انداز سے لگ رہا تھا وہیں سے فرار ہونے کا ارادہ ہے۔" غانیہ خود اس کا ہاتھ پکڑے گولڈن مخملیں صوفے تک لائی، کنیز مرعوب سی تھی، کھل کر مسکرا تک نہ سکی۔

"خیر اب تو ہم تمہیں ساتھ لے کر ہی فرار ہوں گے، فکر نہ کرو۔" غانیہ کے اپنائیت آمیز انداز نے اس کا ذرا سا اعتماد بحال ہونے میں مدد دی، جبھی چہکی، غانیہ یکلخت بے تحاشا سرخ پڑ گئی، کنیز نے بہت دلچسپی سے اس کا یہ دلکش ترین روپ دیکھا تھا۔

"تم خوش تو ہو نا غانیہ؟" اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بے حد اہم سوال کرتی کنیز کے لہجے میں خفیف سی لرزش آ گئی تھی، جس میں کوئی انجانا سا خوف ڈولتا تھا، غانیہ کی پلکیں حیا بار انداز میں لرز کر عارضوں پہ جھک گئیں، چہرہ گلابی گلابی ہو کر لو دینے لگا، مگر کچھ توقف سے بولی تو اس کا لہجہ یاس زدہ و ملول ہو چکا تھا۔

"مجھ سے کہیں زیادہ یہ سوال ان کی طرف اہمیت کا حامل ہے، مجھے وہ خوش نہیں لگتے، میں تو اس بات پہ حیران ہوں یہ سب...... اتنا اچانک...... وہ بھی شادی۔" اس کا رکتا اٹکتا ہوا لہجہ اس کی ذہنی خلجان کا غماز تھا، کنیز کھلکھلا کر ہنس دی۔

"تمہارے حسن کا جادو چل گیا ہے بس...... اور کیا۔" کنیز کی شوخی و شرارت کے جواب میں غانیہ نے بوجھل پلکیں اٹھا کر محض اک نظر اسے دیکھا تھا، کچھ بولی نہیں۔

"تمہیں کیا ہماری آمد کی خبر نہیں تھی جو اس حلیے میں نظر آ رہی ہو، سہیل کیمرا لے کر آیا ہے، ایسے تصویریں بنواؤ گی تو لازماً ویر کو شادی سے اعتراض ہوگا۔" کنیز نے پھر اسے چھیڑا، اب کے وہ واقعی جھینپ گئی تھی۔

"تم رکو...... ابھی تیار ہوتی ہوں۔" وہ مسکراتی ہوئی وارڈ روب کھول کر کھڑی ہو گئی، کنیز نے اس کی مسکان کو محسوس کیا تھا خوشی کو دیکھا تھا اور اس کی دائمی خوشی کے لئے دعا گو ہو گئی تھی۔

☆☆☆

ہم پتھر ہی سہی ہیں مگر پارس جیسے
کسی روز ملو ہم سے تمہیں سونا کر دیں

ابھی وہ سو رہی تھی، فون کی بیل اس کی نیم خوابیدہ سماعتوں سے تسلسل سے ٹکرانے کا اثر تھا کہ بالآخر اس کی آنکھ کھل گئی، اس نے مندی ہوئی آنکھوں سمیت ہاتھ مار کر موبائل فون اٹھانا چاہا، جو جانے کہاں چلا گیا تھا، ابھی چند ماہ قبل پپا نے اس کی اٹھارویں سالگرہ پہ اسے یہ قیمتی تحفہ دیا تھا۔

''ہیلو۔'' فون اس کے ہاتھ لگ گیا تھا، اس نے بند آنکھوں سے اٹھا کر کال ریسو کی۔
''ابھی تک سو رہی ہو نکمی لڑکی۔'' حفصہ نے اس کی گوشمالی سے آغاز کیا، غانیہ کو خوشگوار احساس نے چھوا، وہ ایک دم مسکرا دی۔
''تم...... اتنی صبح صبح۔'' منہ پہ ہاتھ رکھ کر جمائی لیتی وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا چکی تھی۔
''کبھی تو آپا باجی کہہ دیا کرو، سات سال بڑی ہوں تم سے۔''
''لیکچر دینے کو فون کیا ہے محترمہ نے۔'' اس کی خوش دلی خوش مزاجی عروج پہ جا پہنچی۔
''لیکچر تو دینا ہے مگر اس موضوع پہ نہیں۔'' حفصہ نے جس انداز میں ٹوکا وہ از خود سمجھ گئی تھی، آگے وہ کیا کہنے والی ہے، یوں چپ ہوئی گویا اجازت دے دی ہو، کہہ ڈالو جو کہنا ہے۔
''مما کو اتنا خفا کر دیا تم نے غانیہ، میرے خیال میں تم نے عقل کا کوئی کام کیا بھی نہیں ہے۔'' مما کی طرح حفصہ بھی اسے بالکل خوش نہیں لگی۔
''اب کچھ بولتی کیوں نہیں ہو؟'' اسے اس چپ نے تاؤ دلایا، غانیہ کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔
''اس میں میرا کہاں قصور نکلتا ہے، یہ شادی پپا نے طے کی ہے۔'' وہ عاجز ہو کر بولی تو حفصہ نے فوراً ٹوک دیا۔
''خیر اب اتنی بھی معصوم نہ بنو تم، مما بتا رہی تھیں تمہاری ذاتی انوالومنٹ بھی ہے اس بندے میں کیا نام ہے اس کا؟'' حفصہ نے الجھن آمیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی، غانیہ نے ہونٹوں کو باہم بھینچا، مما یہ کریں گی وہ جانتی تھی، پھر بھی جانے کیوں دکھ ہوا تھا، حفصہ نے بھی اس خاموشی کو محسوس کر لیا۔
''تم مائنڈ نہ کرو غانیہ، دیکھو ہمیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے، زندگی تمہیں ہی گزارنی ہے، لیکن یہ بھی سچ ہے تمہاری منتخب کردہ یہ زندگی کچھ اتنی سہل نہ ہوگی جس کی تم عادی ہو، بالغرض وہ بندہ تمہیں خالی خولی محبت دے بھی دے تو آسائشات کے بغیر محبت بھی بھلی نہیں لگتی۔''
''تم کب تک آؤ گی حفصہ! میں بہت اکیلا محسوس کر رہی ہوں خود کو۔'' وہ بولی تو اس کی بھیگی آواز میں بھراہٹ اتر رہی تھی، حفصہ کو یکدم چپ لگ گئی تھی۔
''مجھے کل ہی مما نے تمہاری شادی کی ڈیٹ فکس ہونے کا بتایا، ابھی ایک ماہ ہے، پریشان نہ ہو، ایک ڈیڑھ ہفتہ قبل آ جاؤں گی۔'' حفصہ کا انداز کسی قسم کی خوشی و مسرت سے مبرا محض اس کا دل رکھنے والا تھا اور غانیہ کا دل چپ رہا تھا، رو دیا تھا، پتا نہیں یہ کیسا بندھن بندھنے جا رہا تھا، جس میں دلوں کی خوشی کا رنگ کسی بھی زاویے سے نہیں چھلکتا تھا۔
''عمر سب سے زیادہ خوش ہو رہا ہے تمہاری شادی کا سن کر، کل عامر سے کہہ رہا تھا، پپا میں خالہ کے لئے ساڑھی اور چوڑیاں لوں گا، اس نظر میں وہ مما سے زیادہ پریٹی لگیں گی، پتا تو ہے تمہیں میرا بیٹا شروع سے تم سے زیادہ امپریس ہے۔'' حفصہ کا موڈ بدل گیا تھا، ہنستے مسکراتے وہ اسے عمر کی باتیں سنائے گئی تھی، فون بند ہوا تو غانیہ نے بے دلی سے موبائل رکھ دیا، اس سے پہلے کہ اٹھ کر واش روم میں جاتی، فون زور و شور سے بجنے لگا، اس بار کال لینڈ لائن پہ آ رہی تھی، اس نے گہرا

سانس بھرتے ریسور اٹھا کر کان سے لگایا۔
''السلام علیکم!'' اس نے عادت کے مطابق سلام کیا تھا، دوسری جانب سے جواب کی بجائے سرد اور کھردرا لہجہ سنائی دیا، جس میں نخوت اور تلخی کی گہری آمیزش تھی۔
''کب سے فون بزی ہے آپ کا، بارہا مرتبہ ٹرائی کر چکا ہوں۔''
''دھک۔'' غانیہ کا دل بے اختیار اچھل کر حلق میں آ گیا، اس آواز، اس لہجے کو بھی بھلا نہ پہچان پاتی، وہ جو دل و روح کے ایوانوں میں ہر لحہ گونجتی محسوس ہوا کرتی تھی، اسے یقین نہیں آ سکا، منیب چوہدری اسے کال کر رہا تھا بھلا، یقین آ سکتا تھا، وہ جس کی بے مہری لاتعلقی بے نیازی اور ستم گری نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا، بھلا وہ کیونکر اسے اتنی اہمیت دینے لگا، لیکن یہ خوش بختی ظہور میں آ چکی تھی، اسے لگا اس کی پیاسی سماعتیں صدیوں بعد سیراب ہو رہی ہیں۔
''مجھے معلوم نہیں، شاید ماما کہیں فون کر رہی ہوں گی، انہیں معلوم نہیں ہوگا آپ کال کر رہے ہیں ورنہ......'' وہ کھکھیا کر رہ گئی تھی، بوکھلاتی ہوئی خواہ مخواہ کی صفائی پیش کر رہی تھی کہ وہ جھڑک کر کہہ گیا۔
''ورنہ کیا...... وہ کال ڈراپ کر کے میرا فون ریسو کر لیتیں؟'' اس کا لہجہ گہرا طنز اور تمسخر سمیٹ لایا تھا، غانیہ خفت و خجالت سے کچھ کہنے کے قابل نہیں رہی، کچھ ثانیوں کو دونوں کے مابین گہری خاموشی تن گئی، جسے منیب کی سرد و سپاٹ آواز نے توڑا۔
''مس غانیہ جمال مجھے آپ سے ضروری بات کرنی پڑ گئی ہے، کل آپ مجھ سے ملنے آ رہی ہیں۔'' وہ گزارش نہیں کر رہا تھا، کہ وہ قبولیت یا رد کرنے کا حق محفوظ رکھتی، وہ آرڈر کر رہا تھا، حکم دے رہا تھا، وہ ششدر آرڈر پہ نہیں ہوئی، وہ حق رکھتا تھا، حکم دے سکتا تھا، وہی تو تھا، جو اس سے جو دل چاہے سلوک کر سکتا تھا، اسے اختلاف اس آرڈر کی نوعیت پہ ہوا، ملنا اور وہ بھی باہر، منیب جس کافی شاپ کا نام لے رہا تھا، وہ غانیہ کے کالج کے پاس تھا۔
''آ...... آپ...... گھر آ جایئے، جو بھی بات......'' اس نے ہکلا کر گھبرا کہا مگر دوسری جانب اس کی گھبراہٹ کو جانے کن معانی میں لیا گیا، کہ بھڑک اٹھا، یوں گویا آگ دہک اٹھی ہو۔
''بی بی مشورہ نہیں مانگا آپ سے میں نے، اور نہ ہی اتنی پردہ دار ہیں کہ جتنی اس وقت ظاہر کر رہی ہیں خود کو، کل بارہ بجے آپ کو ہر صورت وہاں ہونا چاہیے۔'' اس کی آواز غراہٹ سے مشابہہ ہوئی، اگلے لمحے سلسلہ کٹ گیا، وہ اسی شعلہ بار رہانت آمیز انداز میں بات کر رہا تھا، جیسے اس روز اس کی معمولی جسارت پہ کی تھی، ریسور اس کے ہاتھ میں تھا اور رنگت تانبے کی مانند دہکی ہوئی، چہرے سے بھاپ نکل رہی تھی، ابھی کچھ دیر قبل جب اس کی غیر متوقع طور پہ آواز سنی، کتنی خوش فہمیاں پال بیٹھا تھا دل، مگر حقیقت خوش گمانی سے بہت پرے، بہت سفاک اور کربناک ہوا کرتی ہے، اس پہ پھر منکشف ہوا تھا، بے مائیگی کا شدید اور رگوں کو کاٹتا احساس اس کے وجود میں اپنے وحشی پنجے گھاڑے جاتا تھا، ریسور ہاتھ سے رکھ کر اس نے بے دھیانی میں چہرہ تھپتھپایا تو پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا، اک سرد آہ اس کے لبوں سے آزاد ہوئی، اب وہ یہ سوچ کر ہلکان ہوئی جاتی تھی، فون پہ یوں عزت افزائی کرنے والا ملاقات میں ستم کے کیا انداز اپنائے گا اور ملنا کیوں

چاہتا تھا وہ، ظاہر ہے اس کی دید کی چاہ میں تو مرا نہیں جاتا تھا، وہ جتنا سوچتی اس قدر ہراساں اسی حد تک بیکل ہوئی جاتی تھی۔

☆☆☆

کورٹ سے نکلتے گیارہ بج گئے، آج اس کے ایک کیس کی ہی سماعت تھی، وہ بار بار گھڑی دیکھتا تھا، اس کی آنکھوں کا رنگ سرخ ہو رہا تھا، غصے سے، تلخی سے، یہی سرخ رنگ اس کی آنکھوں کے فسوں کو مزید گہرا اور دوآتشہ کر رہا تھا، عدالت کے مرکزی گیٹ پہ آج معمول سے بھی زیادہ رش تھا، کسی سیاسی لیڈر کے کیس کی سماعت تھی، گاڑیوں کی یہ قطاریں اس پروٹوکول کا حصہ تھیں، وہ گیٹ سے آگے سڑک تک دور تک پیدل چلا، اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل کو بیگ میں منتقل نہیں کیا تھا، اس سے اس کی ذہنی الجھن و انتشار کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا، اس نے ٹیکسی ڈرائیوروں کی ان پکاروں پہ بھی کان نہیں دھرا تھا جو اس کے لئے اپنی خدمات پیش کرتے ریٹ میں بھی کمی کر رہے تھے، اس کی ذہنی حالت اچھی خاصی معمول سے ہٹ کر تھی، اس کے اعصاب پہ غانیہ جمال سوار تھی، کسی آسیب کی طرح، وہ اتنا تنگ پڑا ہوا تھا کہ بس نہ چلتا تھا کسی بھی طریقے سے اس سے نجات حاصل کرے۔

ہاں یہ بھی نجات حاصل کرنے کا ہی ایک طریقہ تھا، جو اس نے اس لڑکی کی نفرت کی انتہا پہ جا کے سوچا تھا، اس سے ملنے کا اصل مقصد ہی اس سے دائمی نجات تھا، اس نے ان گزرنے والے چند دنوں میں ہی اپنی مخدوش ذہنی حالت کے باعث جانا تھا، وہ اس لڑکی کو ابا کی خاطر بھی قبول کرنے سے قاصر ہے، دکھ انہیں اس کے انکار سے ہوا تھا ناں، اگر وہ لڑکی یہ کام کرتی تو سانپ بھی مر جاتا اور لاٹھی بھی سلامت رہتی۔

(تم جتنی بھی نفس کے تابع سہی غانیہ جمال، اتنی انا تو رکھتی ہو گی کہ میں اتنی نفرت سے تمہیں ٹھکراؤں اور تب بھی تم اس بندھن کو باندھنے پہ قائم رہو۔)

اس کی رگ رگ میں محشر برپا تھا، اس کے اندر اتنی ہمت ہی نہ تھی، کہ دوسری مرتبہ بھی خود کو اک تجربے کی بھٹی میں گزارتا، خود کو اک نئی قربانی کے لئے تیار کرتا۔

قریب سے شور مچاتی گزرتی ٹیکسی کو اس نے ہاتھ دے کر روکا اور ایڈریس سمجھا کر خود پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا، ٹیکسی منزل کی جانب رخ کرتے ہی فراٹے بھرنے لگی تو اس نے اپنا بریف کیس گود میں رکھتے ہوئے اک بار پھر کلائی پہ بندھی سلور ڈائل کی رسٹ واچ پہ نگاہ کی، گیارہ بج کر پینتالیس منٹ ہو چکے تھے، یعنی وہ پون گھنٹہ لیٹ ہو چکا تھا، ابھی مزید اسے آدھا گھنٹہ لگ جانا تھا، عین ممکن تھا وہ اس کا انتظار کر کر کے واپس لوٹ جائے، اسے اک بے چینی کے احساس نے گھیرا۔

''کیا وہ آ جائے گی یوں مجھ سے ملنے؟'' اک اور بے معنی سوچ ذہن کے گوشے سے اٹھی اور چہرے پہ تنفر کی صورت پھیل گئی، بارہ بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے، جب وہ کرایہ ادا کر کے ٹیکسی سے باہر آیا، والٹ کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے اس نے گردن موڑ کر کافی شاپ کے شیشے کے بند دروازے کو دیکھا، قدم بڑھاتا ہوا انٹرس سے اندر داخل ہوتا وہ ہنوز ذہنی خلفشار کا شکار نظر آتا

تھا، اس کی زیرک نگاہ نے لمحے کے ہزارویں حصے میں ہال میں موجود تمام چہروں کا جائزہ لے لیا، اسے اپنے اعصاب کھنچتے محسوس ہوئے تھے، غانیہ اسے وہاں کہیں نظر نہیں آ سکی، قدم بڑھا کر اک خالی میز کی جانب آتے اس نے بدمزگی کی کیفیت میں اپنا بریف کیس میز پہ پھینکا اور خود کرسی پہ بیٹھ گیا۔

''گڈ نون سر! کیا پسند کریں گے آپ؟'' متعدد ویٹر لپک کر اس کی خدمت میں حاضر ہوا، منیب نے اس کی جانب نہیں دیکھا، ہاتھ کے اشارے سے اسے کچھ دیر بعد آنے کا اشارہ کیا تھا۔

(اگر تم نہیں آئیں تو اپنے حق میں مزید برا کرو گی غانیہ جمال......) دانت بھینچے وہ اس کے تصور پہ غرایا اور پھندے کی مانند گلے میں جھولتی ٹائی کی ناٹ کو ڈھیلا کیا۔

''السلام علیکم!......مم...... میں کب سے ویٹ کر رہی تھی آپ کا؟'' معاً اس نے اپنی داہنی جانب اس کی نازک مہین آواز سنی تھی، اچھی خاصی گڑبڑاہٹ کا احساس لئے، جس میں گریز بھی تھا، جھجک بھی، خوف بھی تھا، اضطراب بھی اور یہ پہلا موقع تھا کہ منیب کو اس کی آواز سن کر غصہ آنے کی بجائے قدرے سکون کا احساس ہوا، حالانکہ یہ آواز یہ لہجہ اس کا سب سے ناپسندیدہ تھا کوئی شک نہیں، اس کے باوجود اس نے اس کی جانب دیکھنے اس کی جانب رخ کرنے میں قطعی عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا، پہلے کوٹ کی جیب سے سگریٹ کیس نکالا، پھر سگریٹ کی ڈبیا سے سگریٹ کھینچ کر ہونٹوں کے درمیان رکھتے لائٹر سے شعلہ دکھا کر لائٹر کو جیب میں اڑستے دھواں بکھرتے اس نے نگاہ کا زاویہ بدلا تھا، سیاہ چادر میں سرتاپا چھپی جھکی لمبی پلکوں کے ساتھ خفیف سا کانپتی وہ اس کے سامنے تھی، منیب چوہدری کی اسے دیکھتی نظروں میں صرف تمسخر ہی نہیں اترا سلگن اور تضحیک بھی گہری ہوتی چلی گئی۔

''تشریف رکھیے۔'' سگریٹ ہونٹوں سے انگلیوں کی گرفت میں منتقل کرتے اس کا زہر میں بجھا ہوا لہجہ گونجا، نگاہ لمحہ بھر کو اس کے سفید ہاتھ کی نازک مومی انگلیوں پر ٹھہری، جو ہینڈ بیگ کے اسٹریپ پہ لرزاں تھیں، غانیہ ایسے فی الفور بیٹھی گویا اس کے اس حکم کی منتظر تھی اور جھکی نظروں سمیت گویا ہمہ تن گوش نظر آنے لگی، منیب چوہدری کی نگاہوں کا تمسخر مزید بڑھا، کتنے روپ تھے اس لڑکی کے، اپنے گناہ چھپانے کے کتنے طریقے جانتی تھی، اس کی سوچوں پہ مزید نفرت کی پھوار برسنے لگی، غانیہ کا معصومیت سے بھرا گھبرایا ہوا چہرہ اسے دنیا کا مکار ترین چہرہ نظر آ رہا تھا۔

''آ......آ......آپ نے کیوں بلوایا ہے مجھے؟'' اس کی جھلسا دینے والی راکھ کر ڈالنے والی نظروں کا ہی کمال تھا کہ غانیہ اس قدر جزبز ہو کر کہہ گئی تھی، اس طرح بلوا کر پھر خاموشی اوڑھ لینا، نظروں سے نروس کرنا تو اخلاقیات کے زمرے میں نہیں آتا تھا، وہ کنزرویٹو فیملی سے نہیں تھی، مگر مما جس طرح بی ہیو کر رہی تھیں وہ پریشان کن امر ضرور تھا، ایسے میں کسی کو بھی باخبر کیے بغیر وہ اس شخص سے ملنے آئی تھی تو یہ بھید کھل جانے پہ وہ اس کے کتنے لتے لے سکتی تھیں، یہ غانیہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا، مگر اس شخص کے حکم سے سرکوبی بھی تو محال نہیں تھی، پھر کیا کرتی وہ بھلا۔

''بے فکر رہیے محترمہ! آپ کے حسن بلاخیز کے نظارے کی چاہ میں نہیں دی آپ کو یہ زحمت، بہرحال اتنا اندازہ تو آپ بھی بخوبی کر پائی ہوں گی کہ میرا شمار ایسے احمقوں میں نہیں ہوتا۔''

نظریں تو تھیں ہی شعلہ بار ٹھٹھرا دینے والی، ایسی سرد ایسی پتھریلی کہ غانیہ کو لگتا اسے بھی پتھر کا کر دیں گی، اس پہ سفاکانہ لہجہ اور الفاظ کی برودت اللہ اللہ، وہ زمین میں ہی نہ گڑھی کہ ابھی شاید اور ذلت ہونا باقی تھی، وہ پہلے کب اس کی نفرت وحقارت پہ کچھ کہاں بول پاتی تھی جواب زبان کھلتی، البتہ آنسوؤں پہ اختیار نہیں تھا، وہ ضرور اسے مزید ذلیل کروانے کو بہہ نکلے تھے، کیسی تکلیف تھی جو آنکھوں کے رستے اپنا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکی، اس شخص کے سامنے اس کی حیثیت اول روز سے اتنی حقیر تھی کہ وہ جیسے چاہتا اسے بے مایا کر کے رکھ دیتا، یہ سب اسی دل کا کیا دھرا تھا، منیب چوہدری نے دھواں بکھیرتے اس بے بس سی روتی لڑکی کو دیکھا اور ذرا جو اس پہ ترس کھایا ہو۔

''آپ اندازہ تو کر پائی ہوں گی کہ میں آپ کو پسند کرتا ہوں، نہ یہ شادی کرنا چاہتا ہوں، بہت بہتر ہوگا اگر آپ اپنے آپ پر رحم کھائیں اور اس معاملے کو یہیں ختم کر دیں۔'' مقصد ظاہر ہو گیا تھا، وہ بھرپور اونچا پورا مضبوط مرد تھا، مگر اس معاملے میں اتنا لاچار اور بے بس تھا کہ اس معاملے میں انحصار عورت پہ کرتا تھا، نشانہ بھی باندھتا تھا اس کا بندوق چلانے کو کاندھا بھی اس کا استعمال کرتا تھا، روایتی حربہ تھا اور گھسا پٹا بھی، وہ ایسا کبھی نہ کرتا اگر اس دوران اس لڑکی کے لئے دل میں ذرا برابر بھی گنجائش نکالنے میں کامیاب ہو جاتا، غانیہ کا پہلے سے پھیکا پڑا چہرہ اپنا رنگ کچھ اور پھیکا کر گیا، ہونٹ جانے کس جذبے کے تحت لرزنے لگے، وہ خود کو بولنے کے قابل کر سکی تو آواز کی نمی پہ قابو پانے میں ناکام رہی تھی، مگر اس کے الفاظ اس کے تاثرات اور لہجے کی کمزوری کے بالکل برعکس بہت مدلل بہت دوٹوک اور قطعیت لئے ہوئے تھے۔

''اگر بات میرے کسی معاملے کی بہتری کی ہے تو اس سے آپ کو پریشانی پالنے کی ضرورت نہیں ہے، میں اپنا ہر معاملہ خود ہینڈل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں، ہاں اگر آپ کو اس شادی سے انکار ہے تو اس سے انکار کی اخلاقی جرأت بھی آپ کے اندر ہونی چاہیے، معذرت خواہاں ہوں، اس سلسلے میں میں آپ کی معمولی سی بھی مدد کرنے سے قاصر ہوں، چلتی ہوں، میرا نہیں خیال کہ اس کے علاوہ آپ کو مجھ سے مزید کچھ کہنا ہوگا۔'' بات مکمل کر کے وہ رکی نہیں تھی، کرسی دھکیل کر اٹھی اور پلٹ کر بھی دیکھے بنا آگے بڑھ گئی، منیب چوہدری سناٹوں کی زد پہ آ گیا تھا، سکتہ زدہ سا بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا، اسے یقین نہیں آ سکتا تھا وہ ڈرپوک سی لڑکی اس کے سامنے ایسی جرأت واعتماد کا مظاہرہ کر گئی ہے، بلکہ اس کی مردانگی کو بھی نشانہ بنا گئی ہے، اس کا رنگ سرخ پڑا، اس کی آنکھوں میں لہو اتر آیا۔

(تم خود کو کچھ خاص آئٹم سمجھتی ہو اعلیٰ وارفع قسم کی تو ٹھیک ہے، قسم کھاتا ہوں غانیہ جمال کہ اس گستاخی کی ایسی سزا دوں گا کہ معافیاں مانگو گڑگڑاؤ تب بھی رہائی نہیں ملے گی، تمہارا ہر زعم میرے پیروں کی ٹھوکروں میں پڑا رہے گا، اپنی بربادی کی ذمہ داری مکمل طور پر تمہاری ہوئی، اب منیب چوہدری وہ نہیں جسے تم جیسی نفس پرست عورتیں اپنی غرض کے لئے استعمال کر کے چلتی بنیں، میں تمہیں بتاؤں گا میں کھلونا نہیں ہوں۔) مشتعل انداز میں اسے جاتے دیکھتا ہوا وہ جیسے اندر ہی اندر اسی سے مخاطب تھا، اس کی آنکھوں میں جیسے کسی نے خون انڈیل دیا تھا اور چہرے کے پتھرائے ہوئے نقوش کیسے تنے ہوئے تھے، وہ وہاں سے اٹھا تو اک نیا منیب تھا، جس سے نہ اس کے اپنے

واقف تھے نہ غانیہ جمال ہی۔

☆☆☆

گوشہ ذہن میں بے ربط خیالوں کا ہجوم
چشم تنہائی سے چھن کر وہی بے باک سے اشک
لمحہ وصل کے اس عہد فراموشی کو
یاد کرتا ہے سسکتا ہے بلکتا ہے بہت
آج پھر دشت مسافت کے کٹھن رستوں میں
جلتی بجھتی ہوئی بے نام مسافت کی شعاع
عارض وقت کی سرخی پہ جھلک پڑتی ہے
پھر سے ملنے کی یہ موہوم طلب اور تڑپ
آج بھی ذہن کے گوشوں میں چمک اٹھتی ہے
آج بھی سوچ کے انگار جزیروں میں
آنکھ کے نور میں تو دل کے سویرے میں تو
اجنبی شام کی دم توڑتی برسات میں تو
ہے لکیروں کی طرح ثبت میرے ہاتھوں میں
میرے ہونٹوں کا تبسم میرے دن رات میں تو
ہم کلامی کا کوئی وقفہ کبھی گزرا بھی نہیں
پھر بھی لگتا ہے موجود ہے ہر بات میں تو
مجھ سے واقف ہی نہیں تیری طبیعت لیکن
طرز انکار میں تو شیوہ گفتار میں تو
تو ہی تو ہے میرے اطراف کی ہر شے میں پنہاں
کبھی افراد کا حاصل کبھی انکار میں تو
کبھی سایہ کبھی صحرا کبھی نظروں کا سراب
کبھی شبنم کبھی نکہت کبھی رنگ و خوشبو
تو میری نیند تو میرا دکھ تو میری صبح شام
تو حسرت تو میرا سکھ تو میرا سب کچھ ہے
تو میرا کچھ بھی نہیں تو میرا سب کچھ ہے

شدید تکلیف کا دورانیہ ختم ہوا اور اسے بیٹی کی نوید سننے کو ملی، اسے سلیمان یاد آیا، شدت سے آیا، وہ بیٹی کا خواہش مند تھا، یعنی رحمت کا، رحمت آ گئی تھی، وہ نقاہت سے مسکرائی، وہ سلیمان کو دیکھنے کو بے قرار ہوئی تھی، تاکہ اپنی رحمت کو دیکھنے کو۔

''سلیمان!'' وہ بند آنکھوں سے کراہی اور بے آواز قدموں سے اندر آ جانے والا دراز سایہ اس سرگوشی پہ بچی کی کاٹ پہ جھکے جھکے چونک گیا، احتیاط سے بچی کو ہاتھوں پہ لیا اور چلتا ہوا اس کے

قریب آن ٹھہرا۔

''آ گئے سلیمان، آپ کو آنا ہی تھا صاحب۔'' اس کی بند آنکھیں مسکرا رہی تھیں، وہ اسے اس کی خوشبو سے پہچانتی تھی، اس نے کچھ کہے بغیر ہاتھ میں موجود لفافہ اس کے سرہانے رکھ دیا۔

''تم اسے اپنی بدقسمتی بھی گردان سکتی ہو، مگر میری مجبوری ہے، میری اولاد بیٹی کی صورت تمہارے پاس نہیں رہ سکتی، اسے میں ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

''کہاں؟'' وہ حق دق رہ گئی، اسے یقین نہیں آ سکا۔

''پاکستان...... اپنے گھر...... یہ ڈائیورس پیپر ہیں، تم آج سے آزاد ہو، یہی چاہتی تھیں نا تم۔'' وہ کہہ رہا تھا، وہ کہہ چکا تھا اور کائنات دائمی سناٹے کی زد پہ آ گئی تھی، جس میں صرف ایک صدا گونجتی تھی۔

''آج سے تم آزاد ہو، یہی چاہتی تھیں نا تم۔'' اور وہ یہ نہیں چاہتی تھی صرف یہی نہیں چاہتی تھی، جبھی وہ تھرا گئی، پتھرا گئی، مان سلامت نہ رہا، یقین ٹوٹ کر بکھرا، محبت سسک پڑی، ساری کائنات خاموش تھی، ہر آواز ساکن بس ایک آواز ٹھہری ہوئی جو بے یقین تھی جس پہ یقین نہ آتا تھا، ہر شے حیران اور منجمد یہاں تلک کہ وہ ثبوت فراہم کرتے کاغذات بھی اور ان پہ ٹکی وہ آنکھیں بھی چپ خالی، بے جان کوئی ایک احساس بھی نہ تھا ان آنکھوں میں، آس ٹوٹی دن رات کی امید کی، تسبیح دانہ دانہ بکھری تو آنکھیں اسی پتھرائی ہوئی کیفیت کے ساتھ خود بخود بند ہو گئیں، اس کا تعلق حواس کی ہر دنیا سے چھوٹ گیا تھا۔

☆☆☆

اس کے آنسو رکتے تھے نہ غم و ملال ڈھلتا تھا، منیب چوہدری سے ملاقات تو گویا تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی تھی، وہ معمولی سی خوش فہمی جو اس نے جانے کہاں سے کس مشکل سے کھینچ تان کر دل میں جمع کی تھی، اس بے حس انسان نے اسے بھی نوچ کر پھینک دیا تھا، اسے قطعی سمجھ نہیں آتی تھی آخر وہ اتنا پتھر کیوں تھا، شادی کا نا کام ہو جانا انسان کو ایسے سفاک تو نہیں بنا سکتا، پھر اگر کوئی پوری آمادگی و خوشی کے ساتھ اس کا ساتھ نبھانے کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے اتنی بری طرح سے دھتکارنا تو سراسر تکبر کے سوا کچھ نہ تھا، اس کے اندر عجیب عجیب واہمے اور خدشات آ بسے، جبھی وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ بے زار اور ہراساں ہوئی جاتی تھی۔

دوسری جانب مما تھیں، جو اس شادی پہ ہرگز راضی نہیں تھیں، ناراضگی کے باقاعدہ اظہار کو انہوں نے شادی کی کسی قسم کی تیاری میں حصہ نہ لے کر گویا احتجاج ریکارڈ کرایا تھا، اس طرح گویا انہوں نے پپا کے حوصلے پست کرنے کا ارادہ باندھ رکھا تھا، مگر پپا بھی جانے کیا ٹھان چکے تھے کہ انہیں ان کے احتجاج کو سرے سے نظر انداز کیے خود ہر ذمہ داری کو چابک دستی سے پورا کر رہے تھے، ایسے میں اگر غانیہ چاہتی بھی تو انکار کی پوزیشن میں نہیں رہی، اسے تو اب منیب چوہدری اور مما کے ساتھ ساتھ پپا کے بھی تیور ڈرانے لگے تھے۔

''یہ شادی نہیں جمال چوہدری بیٹی کی بربادی کرنے جا رہے ہو تم، دیکھ لینا تمہاری بیٹی کبھی مسکرانے کو بھی ترسے گی، ایسا ہی اپنوں کی محبت میں اسے بھینٹ چڑھا رہے ہو تم، ارے میں پوچھتی ہوں وہاں ایسا ہے کیا جو تم آنکھیں بند کیے اسے کھائی میں دھکا دے رہے ہو؟ اس سے ہزار درجے بہتر تھا اس کا گلا گھونٹ دیتے، ایک بار تو مرتی وہ بیچاری۔'' وہ زہر خند سے کہتیں اور پپا ہونٹ سیئے وہاں سے اٹھ جاتے۔

''بیٹی کو بھی اک نظر دیکھ لو، ابھی شادی نہیں ہوئی اور وہ آدھی رہ گئی ہے، مگر میں پتا نہیں کیوں تمہیں بتا رہی ہوں، تم تو وہ ہو ناں، جو اس کی شادی کے تیسرے دن ہی اس کے جنازے کو کاندھا دینے کو بھی اسی جوش و خروش سے جاؤ گے۔'' مما انتہا کر جاتیں، پپا کی روح لرز اٹھتی تو دونوں ہاتھ ان کے آگے بے بسی سے جوڑ دیتے۔

''فار گاڈ سیک نازنین! خاموش ہو جائیں، کچھ تو خیال کر لو، وہ صرف میری نہیں آپ کی بھی اولاد ہے آخر کو۔'' بات ہی ایسی تھی کہ پپا مزید خاموش نہ رہ سکے، جواباً مما کتنی سفاکیت سے ہنسی تھیں۔

''یہی تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں جمال کہ خواب غفلت سے جاگو، وہ ہم دونوں کی اولاد ہے، پھر خیال بھی ہمیں باہم کرنا چاہیے، میری بات کا یقین نہیں تو جا کر اسے اک نظر تو دیکھو، وہ...... وہ نہیں ہے جو اک ماہ قبل تک تھی۔'' ان کے لہجے میں ابھی بھی احتجاج تھا، دکھ اور کرب سے لبریز تھا ان کا لہجہ، پپا نے ہونٹوں کو بھینچ لیا، بات جتنی بھی شدید تھی، مگر غور طلب ضرور تھی، انہوں نے غور کرنا چاہا، کتنے دن ہوئے ان سے غانیہ کا سامنا ہوئے، شادی کی مصروفیات میں وہ ایسے کھوئے تھے کہ انہیں غانیہ یاد نہیں رہی، دل کچھ اس طور گھبرایا کہ اسی وقت اٹھ کر غانیہ کے کمرے کی جانب آ گئے، دستک کے جواب میں اس کی مضمحل اور یاسیت آمیز آواز سننے کو ملی، دروازہ کھول کر اندر قدم رکھتے ان کا استقبال اندھیروں نے کیا تھا، ان کا دل انہی تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔

''غانیہ بیٹے!'' سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مار کر انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی لائیٹس آن کر دیں، کمرہ یکلخت روشنیوں سے جگمگا اٹھا، غانیہ اوندھے منہ بستر پہ دراز تھی، ان کی آواز سن کر سرعت سے سیدھی ہوئی، انہیں دیکھتی اس کی نگاہوں میں تحیر کا اک جہان آباد ہونے لگا۔

''خیریت پپا، کوئی کام تھا تو مجھے بلوا لیا ہوتا۔'' اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر اس نے اپنا دوپٹہ تلاشا اور کاندھے پہ ڈال لیا، اسے ابھی دوپٹہ لینے کی عادت نہیں تھی، مگر یہ عادت وہ خود کو ڈال ضرور رہی تھی، وہ ہر کام جو منیب کو پسند تھا وہ کر لینا چاہتی تھی۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا غانیہ!'' پپا کتنی فکر مندی سے اسے دیکھتے تھے، انہیں نازنین کی ایک ایک بات پہ ایمان لانا پڑا، وہ اضمحلال و اضطراب کا کھلا اشتہار لگتی تھی، آنکھوں تلے گہرے ہوتے حلقے، خشک پڑتے ہونٹ، بکھرے بال، مگر وہ اس قدر مکمل حسن رکھتی تھی کہ اس مرجھائے ہوئے روپ کے باوجود حسن کی شعاعیں بکھرتی محسوس ہوتی تھیں، مگر وہ باپ تھے، انہیں لگا کسی نے ان کا دل مسل کر رکھ دیا ہو۔

''ایسا تو کچھ نہیں ہے پپا، بس نیند پوری نہیں ہوئی تو اب سونے کی کوشش کر رہی تھی، آپ بیٹھیں ناں پلیز۔'' بکھرے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر بینڈ چڑھاتے اس نے شعوری

کوشش سے لہجے کو ہشاش بشاش بنایا، مگر پپا کی تسلی کرانے میں ناکام رہی۔

"منیب بہت ڈیسنٹ اور شاندار لڑکا ہے بیٹے! اس کی پہلی شادی بہت چھوٹی عمر میں ہو گئی تھی، پتا نہیں کیوں مجھے لگا میری بیٹی بہت خوش رہے گی اس کے ساتھ، جبھی آپ سے پوچھے بغیر یہ شادی طے کر دی، آپ کی مما کے خدشات بالکل بے جا ہیں، منیب کو فنانشلی پرابلم کا سامنا نہیں ہے، وہ ویل سیٹلڈ ہے، آپ کو بہترین لائف اسٹائل دے سکتا ہے، اس کا بیٹا بھی بہت کیوٹ بہت فرمانبردار قسم کا بچہ ہے، میرا نہیں خیال آپ کو کسی بھی لحاظ سے پرابلمز ہو سکتی ہیں، اس کے باوجود بیٹے، اگر آپ کو معمولی سا بھی اعتراض ہے تو مجھے بتایئے، میں بھائی جان سے معذرت کر لیتا ہوں، یہ بات طے ہے کہ مجھے اپنی بیٹی کی مرضی و خوشی سے بڑھ کر اور کچھ اہم نہیں۔"

غانیہ جس نے ان کی بات کے آغاز میں ہونٹ بھینچ لئے تھے، ان کی اضطراب بھری خاموشی پہ ان کے ہاتھ تھام لئے، نم آنکھوں سے لگائے اور جھک کر بوسہ ثبت کیا۔

"پپا آپ ایسا خیال نہ کریں کہ میں خوش نہیں ہوں، آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں، آپ نے بالکل ٹھیک سوچا، مجھے منیب سے انشاء اللہ کوئی شکایت نہیں ہو گی اور حمدان، وہ تو واقعی بہت معصوم اور بے ریا بچہ ہے، جس سے صرف پیار کیا جا سکتا ہے، آپ پریشان نہ ہوں میں ہرگز بھی خود پہ کسی قسم کا جبر نہیں کر رہی۔" اس نے پوری جان لڑا دی تھی انہیں مطمئن کرنے کو اور وہ ہو بھی گئے تھے، مگر اک آخری کانٹا چبھا رہ گیا تھا جو نکال لینا چاہتے تھے۔

"تو پھر یہ اداسی، یہ خاموشی اور کنارہ کشی کیوں؟ آپ کی مما کا خیال ہے آپ خوش نہیں ہو۔"

اس سوال پہ غانیہ کسی طرح بھی خود پہ قابو نہ رکھ سکی، بے ساختہ سسک اٹھی۔

"ممی اس شادی سے خوش نہیں ہیں پپا، ان کی ناخوشی کا احساس اتنا گہرا ہے کہ مجھے کھل کر خوش نہیں ہونے دیتا۔" اور جس کے ہاتھوں مجبور مما کہ جمال کس طرح اسے فورس کرتے ہیں، دروازے سے لگ کر ساری گفتگو سنتیں ایک دم اپنے حوصلوں کو پست ہوتا محسوس کرتیں پیچھے ہٹ گئیں، انہوں نے جانا وہ جتنی بھی ناخوش سہی مگر اب اپنی بیٹی کی خاطر ضرور یہ کمپرومائز کریں گی، کچھ کہے بغیر وہ اسی خاموشی سے پیچھے ہٹ گئیں۔

اگلی صبح انہوں نے ہتھیار باقاعدہ ڈالتے ہوئے پپا کے سامنے کچھ شرائط رکھی تھی۔

"غانیہ کی پسندیدگی کو مدنظر رکھتے ہوئے میں بطور داماد منیب کو قبول کر رہی ہوں، مگر میری ایک شرط ضرور ہے، آپ منیب کو شہر میں سیٹل ہونے میں فنانشلی ہیلپ کریں گے جمال، ہماری بیٹی گاؤں میں نہیں رہے گی، یہ بات طے ہے، بہتر ہو گا آپ ابھی منیب سے بات کھل کر کر لیں۔"

ان کا انداز یہ بات کرنے کا بھی مخصوص تھا، خود پسند، خود پرست اور کسی حد تک متکبرانہ، پپا قدرے جزبز ہوئے، اگر انہیں مما کا انداز پسند نہیں آیا تھا، تو منیب کو تو سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا قابل قبول ہوتا، جبھی وہ باقاعدہ کھنکھارے۔

"منیب اس قسم کا لڑکا نہیں ہے بیگم صاحبہ! ایسی بات اس کے سامنے غلطی سے کر بھی نہ دیجئے گا کہیں، یہ تو ویسے بھی سیدھا سیدھا کسی خوددار شخص کی انا پر حملہ کرنے والی بات ہو گی، ویسے بھی ہمارے کہنے کی کیا ضرورت ہے، اسے خود معلوم ہے یہ سب، اگر وہ اپنے بیٹے کو بہترین تعلیم اور

ماحول دے سکتا ہے تو بیوی اور باقی ہونے والی اولاد کو کیوں نہیں دے گا، اس معاملے میں آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"کیوں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، ہم اپنی بیٹی دے رہے ہیں اسے، آپ نہیں کر سکتے تو میں خود کروں گی یہ بات۔" مما کی سوئی اسی جگہ پہ اٹکی تھی، پپا سخت نالاں و عاجز نظر آتے وہاں سے اٹھے، مما کچھ سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

"خالہ جانی!" غانیہ کچھ دیر قبل ہی نہا کر نکلی تھی، اب ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے بیٹھی بال سلجھا رہی تھی، اس کھنکتی زندگی سے بھرپور آواز پہ قدرے چونکتے بے اختیار گردن موڑی، بلیو اور پنک گرم اونی سوٹ میں عمر دروازے میں کھڑا مسکراہٹ دبائے اسے دیکھ رہا تھا۔

"خالہ کی جان! آؤ ناں۔" ہیئر برش پھینک کر اس نے بے ساختہ چہک کر کہتے دونوں بازو پھیلا دیئے، وہ بھاگتا ہوا آیا اور اس کے بازوؤں میں سما گیا تھا، پھر بہت پیارے انداز میں چٹا چٹ اس کے گال چومے۔

"بھلا کیا لے کر آیا ہوں میں آپ کے لئے؟" روشن چمکتی مگر شریر آنکھوں سے اسے دیکھتا وہ سوال داغ رہا تھا، غانیہ نے لاعلمی کے اظہار کے طور پہ شانے اچکا کر مسکراہٹ دبائی، مقصداً اسے تنگ کرنا تھا۔

"گیس کریں ناں۔" وہ مچل گیا، غانیہ معصومیت کے تاثر سمیت آنکھیں پٹپٹانے لگی۔

"ساڑھی؟"

"اوں ہوں۔" عمر نے فی الفور رد کیا، غانیہ ٹھوڑی پہ انگلی رکھ کے سوچنے کی اداکاری کرنے لگی۔

"بینگلز؟"

"نو...... نیور۔" عمر ہنسا اور ہاتھ سے مزید سوچنے کا گیس کرنے کا اشارہ کیا۔

"آہاں...... کمپیوٹر...... ہے ناں؟" وہ چہکی اور اسے گدگدایا، عمر ہنستے ہوئے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

"ساڑھی اور بینگلز تو مما نے لانے تھے، میں لیپ ٹاپ تو لاتا، ہے نا؟" وہ کتنا خوش تھا، غانیہ نے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا، عمر اس کا ہاتھ پکڑے لاؤنج میں سب کے درمیان لے آیا، جہاں فضہ اور عامر بھائی کے علاوہ اسد بھائی بھی موجود تھے، بڑے بڑے سوٹ کیس کھلے ہوئے تھے اور بیش قیمت اشیاء برآمد ہو رہی تھیں، وہ باری باری سب سے ملی۔

"آتے ہی پھیلاوا بکھیر کر بیٹھ گئیں۔"

"سب تمہاری شادی کی تیاریاں ہیں جناب۔" فضہ نے اسے دیکھ کر آنکھ ماری، وہ بلش ہوئی تھی بے ساختہ۔

"مما خالہ جانی کو پہلے عمر کا گفٹ دکھائیں، یعنی لیپ ٹاپ۔" عمر نے شور ڈال دیا تھا، پھر وہ کتنے تفاخر سے کمپیوٹر دکھاتے ہوئے اسی وقت اس کی افادیت و آپریٹ کرنے کے طریقے بتائے

گیا۔

''تمہارا بیٹا بڑا ہو کر افلاطون کو بھی مات دے گا، دیکھ لینا۔'' اسد بھائی نے ہنستے ہوئے فضہ کو چھیڑا۔

''ماشاءاللہ بہت جینئس ہے۔'' مما عمر کے واری صدقے ہونے لگیں۔

''مبارک ہو مما! ایسا ہی اک پلا پلایا اک اور نواسا مفت میں مل گیا بیٹھے بٹھائے آپ کو۔'' فضہ نے اب کی بار غانیہ کو دیکھتے ٹکڑا لگایا، اشارہ منیب کے بیٹے حمدان کی جانب تھا، جہاں غانیہ کے چہرے پہ رنگ اترے وہاں مما کا چہرہ بھی متغیر ہو اٹھا تھا۔

''خالہ جانی! آپ کی شادی جن سے ہو رہی ہے وہ انکل کیسے ہیں؟'' عمر کو جانے کیا سوجھی سوال داغ دیا، جہاں غانیہ گڑبڑائی، فضہ کے قہقہے چھت اڑانے لگے۔

''چلو بتاؤ اسے اب، کیسے ہیں وہ حضرت؟'' وہ صاف صاف اسے چھیڑ رہی تھی، غانیہ گلابی پڑتی گئی۔

''بتائیں نا خالہ، آپ کی طرح ہیں نا لونگ کیرنگ اینڈ فیسی نیٹک؟'' عمر کے سوالوں پہ وہ عاجز ہی نہیں جزبز بھی ہونے لگی، سب سے نظریں چراتی وہ اس پل کچھ شرمائی کچھ جھینپی کتنا پیارا روپ سمیٹ لائی تھی۔

''بیٹے شادی پہ آئیں گے ناوہ، آپ تب دیکھ لینا۔'' عامر بھائی نے غانیہ کی جان بخشی کرانا چاہی جو ہو کر نہ دی۔

''کیوں؟ خالہ جانی نے انہیں نہیں دیکھا؟ ان کے پاس ان کی فوٹو بھی نہیں ہے؟ پپا نجمہ آنٹی کی جب شادی ہونے والی تھی تو ان کے پاس اپنے دولہا کی اتنی ساری اسنیپس بھی تھی اور دولہا ان سے اتنی بار ملنے بھی آئے تھے، کیا خالہ کے دولہا ان سے ملنے نہیں آتے؟ اور ان کی اسنیپس ز بھی نہیں خالہ کے پاس؟'' وہ کتنا حیران ہو کر سوال پہ سوال کر رہا تھا، غانیہ کا چہرہ ایک دم جانے کس کس احساس کے تحت لو دینے لگا، جبکہ فضہ نے ٹھنڈا سانس بھرا تھا۔

''وہ نجمہ آنٹی تھیں اور یہ خالہ ہیں بیٹے، وہ امریکہ جبکہ یہ پاکستان ہے، اتنا فرق تو بنتا ہے نا پھر؟'' فضہ نے سمجھانا چاہا، مگر وہ الٹا اسے سمجھانے بیٹھ گیا۔

''نہیں بنتا مما جان، شادی تو شادی ہوتی ہے نا۔'' وہ زچ ہوا، فضہ نے کاندھے اچکا دیئے۔

''تو ٹھیک ہے بیٹے! آپ خالہ سے فرمائش کرو وہ شادی سے پہلے دولہا کو یہاں بلوا لیں، تاکہ صاحب بہادر ان کا دیدار خاص کر سکیں۔'' فضہ نے قصہ نپٹا دیا، گویا جان چھڑائی، جبکہ عامر بھائی اور اسد ہنس رہے تھے، غانیہ بھاری دل لئے وہاں سے اٹھ گئی، مما کی خاموش متفکر نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

☆☆☆

ویگن نے اسے سڑک کنارے اتارا اور ہارن بجاتی نہر کے پل کو پار کرتی دائیں جانب مڑ گئی، اس نے اپنا بریف کیس سنبھالا اور اڈے پہ موجود اکلوتے تانگے پہ آ بیٹھا، اس کے بوجھ سے تانگہ پیچھے کی جانب جھول گیا، گھوڑے کے زور سے ہنہنانے پہ وہیں اگلی سیٹ پہ صافہ منہ پہ ڈالے

اونگھتا ہوا کوچوان بھی ہڑبڑا کر نیند سے جاگا۔

''اوہو...... وکیل باؤ صاحب۔'' کوچوان اسے اچھی طرح پہچانتا تھا، اچھی سلام دعا تھی، مگر آج وکیل صاحب کی آنکھوں میں کوئی پہچان کا رنگ نہیں تھا، جبھی اکتایا ہوا سا خاموشی سے کھیتوں میں پھولی سرسوں کو دیکھتا رہا، تانگہ کچے پکے راستوں پہ ہچکولے کھاتا آگے بڑھنے لگا، کھیتوں کے بعد کچے پکے مکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، اونچی نیچی گلیاں دھول اڑاتے راستے جگالی کرتی گائے بھینسیں، نیم وا آنکھوں سے آنے والوں کو دیکھتی تھیں اور اپنی دمیں ہلا ہلا کر مکھیاں اڑاتی تھیں، گاؤں کا واحد پرائمری اسکول چھوٹی چھوٹی دوکانیں گوبر تھوپی بیرونی دیواروں کی لپائی کرتی عورتیں، چارہ کاٹ کر گٹھڑ سر پہ اٹھائے مرد گھروں کے سامنے چار پائیوں پہ حقہ گڑگڑاتے بوڑھے، گاؤں کا اکلوتا آڈیو سینٹر اور اس کے سامنے کھڑے بے فکرے نوجوان پیلے پھولوں کی تازگی باغوں اور کھیتوں کی دلکشی گاؤں کے ٹیڑھے میڑھے راستوں میں دھول ہوئی جاتی تھی، جائزہ مکمل کرتا وہ کڑواہٹ بھری مسکان لبوں پہ سجا لایا۔

(تو یہ ہے تمہارا انتخاب تمہارا نصیب غانیہ جمال، جس کے حصول کی خاطر مری جاتی ہو تم، اتنے اونچے اونچے دعوے کیے ہیں تو مشکل تو کاٹو گی، جو خود اپنا دشمن ہو اس سے کون ہمدردی کرے اور ہمدردی تو مظلوموں سے کی جاتی ہے، جو تم نہیں ہو بہرحال۔)

''او منیب...... ادھر آ۔'' گھر میں داخل ہوتے ہی وہ حسب معمول کسی سے کلام کیے بنا سیدھا وہ اپنے کمرے کا رخ کر چکا تھا، جب صحن میں دروازے کھڑکیوں پہ روغن کرتے پھیرتے سہیل کے سر پہ کھڑے مسلسل نکتہ چینی کرتے جھڑکتے ہوئے تاؤ جی نے اس پہ نگاہ پڑتے ہی اپنے مخصوص رعب دار اور دبنگ آواز میں اسے پکارا، وہ گہرا سانس بھرتا وہیں تھم کر انہیں دیکھنے لگا۔

''ویاہ میں گنتی کے دن رہ گئے ہیں، آخر تو کاکے کو کب لے کر آئے گا یہاں؟'' ان کے ماتھے کی تیوریاں چڑھ رہی تھیں، آج کل ان کا مزاج ویسے ہی سوا نیزے پہ رہتا تھا، مگر ان سے بات کرتے یہ نخوت مزید کئی گناہ بڑھ جاتا، منیب نے بے ساختہ ہونٹوں کو باہم بھینچا، انہیں یہ بتا کر وہ طوفان نہیں اٹھوانا چاہتا تھا کہ اس کا ارادہ بچے کو لانے کا نہیں تھا، باپ کی شادی نما تماشہ پہ بچے کا کوئی کام تھا بھی نہیں، لیکن ان باتوں کو یہ لوگ کہاں سمجھتے تھے، سمجھ ہی نہ سکتے تھے۔

''بولتا نہیں ہے اوئے تو کچھ؟ باپ کو کتا سمجھا ہوا ہے کہ بھونکتا ہے تو بھونکتا رہے۔'' حسب عادت وہ آپے سے باہر ہوتے خود اپنے آپ کو ہی کوسنے لگے، ایک تو منیب ان روایات سے بہت چڑتا تھا، جو سیانے بزرگ اولاد کو مجبور کرنے یا بلیک میل کرنے کو نشانہ بنا لیا کرتے تھے، کبھی اپنے آپ کو بددعائیں دے کر تو کبھی خود کو ایذا پہنچا کر اولاد کو اپنے حق میں ہموار کرتے انہیں شاید اولاد کی مجبوریوں کا ان کے دل کے درد کا کبھی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا، وہ بے بس لاچار کھڑا تھا، سہیل نے روغن سے لتھڑے ہاتھوں سے برش رکھ کر خاصی ترحم آمیز نگاہ بھائی پر ڈالی، جس کے چہرے پہ بے بسی چھلکتی تھی اور مٹی کے تیل کی بوتل کا ڈھکن کھول کر روغن میں تیل ملانے لگا، فضا میں تازہ روغن کی پھیلی باس میں مٹی کے تیل کی بو بھی شامل ہونے لگی۔

''ایک دن پہلے لے آؤں گا، پڑھائی کا حرج ہو گا اس لئے جلدی نہیں کی۔'' ضبط کے گھونٹ

بھرتے اس نے نارمل انداز میں جواب دے کر جان چھڑائی، ورنہ اس سے کچھ بعید نہ تھا، اسے مزید ذلیل کر کے رکھ دیتے، ابھی ان کا بگڑا موڈ کہاں بحال ہوا تھا، جبھی زہریلا ہنکارا ابھرا۔

''واہ سنی گل اپنے پڑھا کو افسر پتر کی؟'' انہوں نے چائے لے کر آتی اماں کو ہمنوا کرنے کو تلخی سے کہا۔

''بڑا اس کا نکو، ڈی سی لگ رہا ہے جو اس کا حرج ہوگا، ارے سارے ڈرامے جانتا ہوں میں اس کے، پیو ہوں اس کا بھی، بتا رہا ہوں اگر یہ کا کے کو لے کر نہ آیا تو جج نہیں ٹرے گی، اس وقت تک۔'' اماں سے چائے کی پیالی لے کر چائے کا لمبا سڑ کا لگاتے دھمکی آمیز انداز میں گویا منیب کو ہی سنایا تھا انہوں نے، جو کان لپیٹے کمرے میں جا گھسا تھا، ابا کی مہربانی سے فائدہ اٹھا کر جو انہوں نے بہرحال اس پہ نہیں اپنی آنے والی بہو کے اعزاز میں کی تھی، اٹیچڈ باتھ سے نہا کر نکلا تو اماں کو اپنی پھیلائی چیزیں سمیٹتے پا کر شرمسار سا ہوا۔

''چھوڑ دیں اماں، میں خود کر لوں گا۔'' اس نے بے اختیار بڑھ کر اماں کے ہاتھ سے اپنے جوتے اور موزے لینے چاہے تو اماں مسکرانے لگیں۔

''جھلا ہے تو وی بالکل ہی مینبے، بھلا دس یہ بھی کوئی کموں سے کم ہے، پھر خیری صلا چند دنوں میں تیری وہٹی آ جائے گی تو وہ آپی خیال رکھ لیا کرے گی تیرا، اک دھی بھیجوں گی تے دوسری گھر لاؤں گی، میرا تو آرام ہی آرام ہے۔'' وہ خوش خیال تھیں، مگن تھیں، حالانکہ پہلے ایک بار نہیں دو مرتبہ ڈسی جا چکی تھیں، مگر سادگی کا معصومیت کا وہی عالم تھا، منیب کے چہرے پہ گہرا اضطراب چھانے لگا۔

''اتنی خوش فہم کیوں ہیں آخر اماں آپ؟ جبکہ نہ رشتہ نیا ہے نہ ہی لوگوں کے مزاج میں فرق نظر آتا ہے، اتنی سی بات تو سمجھنی چاہیے آپ کو تا کہ دکھوں میں کچھ تو کمی کا امکان رہے۔'' اماں کے سامنے اس نے لہجے کو تلخی و ترشی پہ قابو پانے کی بھی کوشش نہیں کی، اماں کچھ لمحوں کو بہت افسردہ نظر آئیں، اگلے لمحے اس کا چہرہ اپنے بوڑھے ہاتھوں میں لے کر پیار لٹاتی نظروں سے اسے دیکھا اور مسکرانے لگیں۔

''کتنی روشن اور چمکتی ہے یہ تیری پیشانی پتر، خوش بختی کی علامت نہ سمجھوں تو حماقت ہے، مجھے اللہ سائیں کے انصاف پہ یقین ہے میرے شہزادے، جو اک واری ہوا، وہ بار بار نہ ہوگا، اگر غانیہ کو اچھی طرح نہ سمجھا ہوتا نہ جانا ہوتا تو کبھی تجھ سے ایسے منت نہ کرتی، تو فکر ہی نہ کر اس باری سب چنگا ہوگا میرے پتر نال۔'' ان کا یقین کامل تھا، یا سادگی کمال درجے کی تھی، منیب کچھ نہیں کہہ سکا، اس میں ان کا دل توڑنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

''میں کنزاں سے کہہ آئی ہوں تیری تازی چا کا، بیٹھ تو مجھے گل کرنی ہے جروری۔'' اس کے نم بال سہلاتے ہوئے اماں نے بے حد محبت سے کہتے اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھا لیا، وہ سخت جز بز سا ہوا، اتنا تو جان ہی سکتا تھا اماں کوئی مطالبہ لے کر آئی ہیں، مطالبے کی نوعیت جانے بنا ہی اس کا دل تنگ پڑنے لگا، آج کل ہر معاملہ جو اس کی توجہ کا حاصل تھا، اس سے گریزاں ہی نہیں وہ بھاگ بھی رہا تھا۔

''دیکھ پتر! کا کے کو کیوں نہیں لا رہا تو، پتر جب کسی کو خوشی دیں تو پوری دیتے ہیں، تیرا ابا ہر وقت تیری وجہ سے جلتا کلستا رہتا ہے، ویاہ نیڑے ہے تو کسی کم میں وی حصہ نئیں لیتا، ہنسا مسکرانا تو بڑی دور دی گل، تیرے ابا کا دھیان ہر ویلے تیری جانب لگا رہتا ہے۔'' گو کہ اماں کا انداز مصالحانہ تھا، اس کے باوجود منیب کا دل غم سے بوجھل ہو کر پھٹنے کے قریب ہونے لگا۔

پتہ نہیں ہر کوئی اسے ہی کیوں سمجھانے مصالحت پہ اکسانے پہ کیوں بھولنے لگتا تھا آخر وہ بھی انسان ہے، وہ بھی دل رکھتا ہے، دل بھی زخم خوردہ، کہاں تک وہ کس حد تک سمجھوتہ کرے، کچھ تو اس پہ اس کا بھی حق تھا، اگر اس نے مجبوراً اپنوں کی خاطر خود کو دار پہ چڑھا بھی دیا تھا تو اب وہ خوشی کا تاثر دینے کو منہ پھاڑ پھاڑ کر قہقہے کیسے لگا لیتا، دل کے زخم چھپا کر خالص مصنوعی کام کرنا اسے نہیں آتا تھا، روتے دل کے ساتھ مسکرانا آسان نہیں تھا، وہ کیسے مسکراتا، اسے تو مستقبل کے حوالے سے اٹھائی جانے والی متوقع ہار، متوقع ہزیمت ابھی سے کوڑے مارنا شروع کر چکی تھی، وہ ابھی سے جانتا تھا کیا ہوگا آئندہ، اسے معلوم تھا غانیہ اس ماحول اس گھر کو قبول نہیں کر سکتی، مگر یہ بات اس کے سادہ لوح والدین نہیں سمجھ سکتے تھے، کہ ان کی لاڈلی کو محبت ان کے گھر بار سے نہیں ان کے بیٹے کے حسین چہرے سے ہوئی تھی، سمجھوتے گھروں سے نہیں چہروں سے ہوتے ہیں، اگر ہوں تو، لیکن یہاں تو ایسا معاملہ بھی نہیں تھا، وہ کوئی دنیا کا آخری حسین مرد تو نہ تھا، اس سے بڑھ کر حسن بکھرا تھا اور حسن کا جادو جہاں سر چڑھ کر بولے وہاں دریافت کا جذبہ بھی سر اٹھاتا ہے، اکتفا اور صبر و قناعت جیسے احساس وہاں جھانکنے بھی نہیں آتے، وہ جسے محبت سمجھ بیٹھا تھا، وہ محبت نہیں تھی، وہ تو نفس تھا، خواہش تھی اور بس...... ایک بار پھر تاریخ اپنا آپ دوہرا رہی تھی، اس کا بس چلتا تو اس دھارے کا رخ بدل دیتا، مگر بس ہی تو نہ چلتا تھا، کبھی اسے اپنے خوبرو چہرے سے وحشت ہوتی، اس کے دکھوں کا باعث اگر صرف اسی چہرے کو گردانا جاتا تو ایسا کچھ غلط نہ ہوتا، یہی چہرہ ایک بار پھر دل کو داغدار کرنے کا ساماں مکمل کر چکا تھا اور وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا، بلکہ اسے کچھ کرنے نہیں دیا گیا تھا، وہ کیسے سمجھاتا، وہ نیناں کا دوسرا عکس تھی، صرف شکل صورت ہی نہیں انداز و اطوار بھی اس کا پرتو، پھر اس سے الگ طرز عمل کیسے دکھا جاتی، وہ اگر اس کے روبرو ہوتے ہی زہر خند ہو جاتا تھا، تو اس میں قصور اس کا نہیں اس لڑکی کا ٹھہرتا تھا، اسے تو اپنا آپ مجروح پرندے جیسا لگنے لگا تھا، جس کے پر کاٹ کر شکاری کے آگے پھینک دیا جائے، اپنی یہی بے بسی اسے وحشت کے انوکھے جاں گداز احساس سے دوچار کیا کرتی۔

''کیوں چپ ہو جاتا ہے گھڑی گھڑی، ہنسا بولنا تو بالکل بھل گیا پتر، وہ کلموہی خود ہی دفعان ہو جاتی کافی نہ تھا، ساتھ تیرے سارے حسین رنگ بھی اڑا کر لے گئی، منیب تیری ہر خوشی اسی کے ساتھ تو نہیں تھی پتر، ہم بھی کچھ لگتے ہیں تیرے، ہمارا بھی حق ہے تجھ پہ۔'' اماں روہانسی ہوئی جاتی تھیں اور منیب کو صحیح معنوں میں لگا کسی نے اس کے حلق میں تیز دار خنجر کی نوک چبھو دی ہے، وہ کہہ نہ سکا کہ اس کے سامنے نیناں کا تذکرہ نہ کریں، وہ نئے سرے سے زخمی ہوتا تھا، اسے اس کا ذکر سننا پسند نہ تھا، اماں محبت کی بات کرتی تھیں، اسے تو نیناں سے اتنی نفرت تھی یہ نفرت اتنی بڑھی تھی، ایسی زور آور تھی کہ اس کا عکس دکھائی غانیہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے گئی تھی۔

''ٹھیک ہے، میں کل حمدان کو لے آؤں گا۔'' اس نے ہاتھ میں اٹھایا آخری ہتھیار بھی کند سمجھ کر پھینک دیا، اگر وہ ہارا تھا تو اس شکست کو تسلیم بھی کرنا چاہیے، اسے لگا اس کا دل عجیب سے پرہول سناٹے کی زد پہ آ گیا ہو، مگر اماں ضرور خوش اور نہال ہو چکی تھیں، یہ اس سے اگلے دن کی بات ہے، جب وہ شام ڈھلے گھر لوٹا تو حمدان اس کی انگلی پکڑے اس کے ہمراہ تھا، تعمیر ومرمت کے ساتھ رنگ وروغن کا کام مکمل ہو چکا تھا، گھر صاف شفاف جبکہ دروازے کھڑکیاں خوب چمکتے ہوئے تھے، صحن کا سرخ فرش والا آنگن دھلائی کے بعد خوب نکھرا ہوا تھا، برآمدے کے ستون سے لپٹی بیلوں کے پتوں سے ابھی بھی پانی کا کوئی کوئی قطرہ ٹپک رہا تھا، چھت کو جاتی سیڑھیاں ابھی بھی گیلی تھیں، امرود کے درخت کے نیچے کچھ گیلے پتے گرے ہوئے تھے، سب سے پہلے سیڑھیوں سے اترتے ابا کی نظر ان پہ پڑی تھی۔

پہلے تو یوں آنکھیں سکیڑیں گویا یقین نہ آتا ہو اس کی موجودگی کا اور جب یہ یقین آیا تو وہیں سے نعرہ لگا دیا تھا۔

''آ...... اوئے میرے شیر جوان کے پتر! دادے دی جان، میرا سونا کاکا۔'' حمدان بھی اس نعرے کے جواب میں باپ سے انگلی چھڑاتا قلانچیں بھرتا ان سے جا لپٹا، انہوں نے پوتے کو بانہوں میں اٹھا کر چٹا چٹ چوما تھا، اماں جو برآمدے سے اٹھ کر اسی سمت آ گئی تھیں، مسکرائے گئیں۔

''مجھے تو لگتا ہے دیور جی کو دوجے ویاہ کی بھی بہتری خوشی ہے، لو دسو منڈا وی لے آندا، ہاہاہا، ابے کو یہ کوڑی چڑھائے گا۔'' بھابو نے ٹھٹھہ لگایا تھا، وہ کنیز کے ساتھ جہیز اور بری کے جوڑے ٹانک رہی تھیں، اس جگت بازی کا بڑا سنہرا موقع ملا تھا انہیں، منیب عام حالات میں بھی کم ہی ان کے منہ لگا کرتا تھا، اس موقع پہ تو بچنا جیسے فرض اولین ٹھہرا، لیکن یہ گھٹیا مذاق ضرور اس پل اس کا چہرہ دہکا کے رکھ گیا، اس نے اک جتلاتی ہوئی نگاہ ابا جی پہ ڈالی تھی اور یونہی لب بھینچے لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا، اماں اور کنیز ضرور شرمندہ اور خائف نظر آ رہی تھیں، ابا جی کو اس طنز آمیز جملے کی کاٹ سے فرق نہیں پڑا تھا شاید جبھی ہنوز پوتے میں مگن تھے، بھرجائی کی شاید تشفی نہیں ہو سکی جبھی پھر چھیڑ خانی کی۔

''افوہ...... رک تو...... اپنی بڈھی (بیوی) کے کپڑے لتے تو دیکھ لے، رات کو اس کے تصور میں آسانی رہے گی۔'' وہ پھر دانت نکوس رہی تھیں، ساتھ بٹی کو چارپائی کے ساتھ بندھے کپڑے کے جھولے میں لٹاتے گردن موڑ کر اسے بھی دیکھنا چاہا، منیب نے ایک دھماکے سے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا، اس پل اس کی آنکھوں کی جلن کا اندازہ کون کر پاتا، جو حد سے سوا تھی، اضطراری کیفیت میں سگریٹ سلگاتے اسے عجیب سی بے بسی نے آن لیا۔

(کیا حمدان ان فضول باتوں سے بچ سکے گا؟ کیا تاثر پڑے گا اس پہ) اضطراب کو بڑھانے کو ایک اور سوچ نے دامن پکڑا اور ایسی شدت سے پکڑا کہ وہ کش لینا بھی بھول گیا۔

''جہیز کا سامان لینے سے تو انکار کر دیا، ایسے خالی کمرے میں بچی کو کہاں بٹھائے گا، فرنیچر ڈلوا یہاں نیا۔'' ابا جی ایک بار پھر آ گئے تھے، اس کا ضبط اور صبر آزمانے، وہ چونکا ٹھٹکا اور اٹھ کر

بیٹھ گیا، چہرے پہ بے بسی سج گئی، سگریٹ سائیڈ پہ پھینک دیا۔

''یہ فرنیچر اچھا خاصا ہے ابا جی، ابھی گنجائش نہیں نکل رہی، اچھا خاصا خرچ ہو چکا ہے، کنیز کے لئے جو فرنیچر آرڈر کیا ہے، اسی کی پے منٹ کر سکتا ہوں میں فی الحال، اس کام کو بعد پہ اٹھا رکھتے ہیں۔'' گو کہ اپنی طرف سے اس نے پوری کوشش کی تھی ایسے الفاظ کا انتخاب کیا تھا کہ وہ بھڑکیں نہ، مگر ابا کو پتا نہیں اس سے کیا پرخاش تھی کہ سیدھی بات کا بھی الٹا مطلب نکال کر اس کے گلے پڑ جایا کرتے۔

''آنکھیں تو ایسے دکھاتا ہے جیسے تیری کمائی کا کھاتے آئے ہیں آج تک، اپنا پیسہ سنبھال کے رکھ اپنے پاس، نوا فرنیچر میں خود یہاں ڈلوا سکتا ہوں، اک گل ہور سن لے، ویاہ تیرا ہے دوجا، غانیہ دھی کے ارمان کا ہمیں خیال ہے، چک اپنا کاٹھ کباڑ ادھر سے نوا سامان آنے سے پہلے پہلے، ابھی میرے بازوؤں میں اتنا ضرور زور ہے کہ اتنا پیسہ کما سکوں۔'' انہوں نے توقع سے بڑھ کر برا منا لیا تھا، منیب انہیں بے بسی کی نظروں سے دیکھ سکا تھا، بولا کچھ نہیں، وہ یونہی جھلاتے بولتے کمرے سے نکل گئے، وہ سر پکڑے بیٹھا تھا۔

☆☆☆

''بھئی برائیڈل ڈریس تو دولہا دلہن کی پسند کے مطابق ہونا چاہیے، بہتر ہوتا کہ منیب صاحب رجوع کرتے اور بارات وولیمہ کے جوڑے باہمی رضامندی سے خرید لئے جاتے، لیکن محترم مجھے روکھے مزاج کے لگتے ہیں دوسری شادی ہو گی تو ان کی، ہماری بہن کی تو پہلی ہے، ارمان تو ہیں ناں اس کے۔''

فضہ اسے اپنے ساتھ بازاروں میں گھسیٹے پھرتی تھی، ساتھ ساتھ کلستی تھی، عامر بھائی بھی ساتھ تھے، کئی بار فضہ کو تادیبی نظروں سے گھور چکے تھے مگر اس پہ اثر کہاں ہوتا تھا۔

''اک بار ہتھے لگنے دو وکیل صاحب کو، دیکھنا کیسے اکڑ نکالتی ہوں۔'' اس کا غصہ نکلنے میں نہیں آتا تھا، عامر بھائی غانیہ کو معذرتی نظروں سے دیکھنے لگے، وہ اوپرے دل سے ہی مسکرائی تھی۔

''دیکھو بلڈ ریڈ کلر کا لہنگا لے لیتے ہیں، اس کا کام بھی بہت یونیک ہے، بہت جچے گا تم پہ۔'' فضہ اسے جس بوتیک میں لے کر آئی، وہاں برائیڈل ڈریسز اور کلرز کی بہار آئی ہوئی تھی، فضہ نے لہنگے کا دوپٹہ ہاتھ پہ پھیلا کر اس کی رائے لی، وہ محض کاندھے اچکا کر رہ گئی۔

''غانیہ!'' اس چیخ نما چہکتی آواز پہ غانیہ کے ساتھ فضہ اور عامر بھائی نے بھی چونکتے ہوئے پلٹ کر دیکھا، تب تک کچھ فاصلے پہ بھرجائی اور اماں کے ہمراہ بوتیک سے باہر سے گزرتی گلاس وال سے اس پہ اتفاقی نگاہ ڈال کر پہچان کا مرحلہ طے کرتی دروازہ کھول کر اندھا دھند اس کی جانب بھاگی آ رہی تھی۔

''کیسی ہے دلہن صاحبہ!'' اس نے نہایت بے تکلفی سے اس کے گلے میں بازو حمائل کیے، اس کی آنکھیں اس حسین اتفاق پہ خوشی سے جگر جگر کر رہی تھیں، غانیہ انداز تخاطب پہ جھینپ کر رہ گئی تھی۔

''تائی جان اور بھابھی بھی ساتھ ہیں تمہارے؟'' غانیہ کی نظریں دروازے پہ تھیں۔

''صرف اماں اور بھابھو نہیں، ویرا بھی ہے ہمارے ساتھ۔'' کنیز نے اس کے کان میں گھس کر جو سرگوشی کی تھی وہ اتنی بلند ضرور تھی کہ ساتھ کھڑے عامر بھائی اور فضہ نے بھی سن لی، غانیہ کا دل اچھل کر حلق میں آیا تھا تو رنگت بے تحاشا گلابیاں چھلکانے لگی، ریشمی گھنی پلکوں کی جھالریں منوں بوجھ سے جھک گئیں۔

''جاؤ اپنی ساس اور جٹھانی کو تو سلام کرآؤ۔'' فضہ نے اسے گھورا، کنیز مسکرانے لگی، وہ خود بھی ان لوگوں سے سلام دعا کر رہی تھی۔

''صرف ان سے نہیں، اپنے دولہا سے بھی ملاقات کریں گی یہ۔'' اس کا انداز شوخی سے بھرپور تھا، غانیہ بے ساختہ سرخ پڑتی گئی۔

''کیا واقعی منیب ساتھ ہیں؟'' فضہ ایکدم الرٹ ہوئی، چہرے پہ اشتیاق پھیلا ہوا تھا، نظریں یہاں وہاں بھٹکیں۔

''جی ویر ساتھ ہیں مگر ہمیں یہاں چھوڑ کر کسی کام سے گئے ہیں، آتے ہوں گے۔'' کنیز نے آخری فقرہ بالخصوص غانیہ کو ہی سنایا تھا، جس کی رنگت کچھ اور دہک چکی تھی، تب تک اماں اور بھرجائی بھی وہاں پہنچ چکی تھیں، فضہ عامر بھائی اور غانیہ کو تائی اماں نے باری باری ساتھ لگا کر ماتھا چوما، غانیہ کو تو باقاعدہ لپٹا لیا تھا۔

''بوت چنگا ہویا پتر! تھے مل گئی میری دھی، اب اپنی پسند سے کپڑے لے لے۔'' ان کی نظروں میں غانیہ کے لئے کتنی محبت تھی، فضہ کو اس محبت وخاصیت نے اچھا خاصا مطمئن کیا تھا۔

''آپ گھر آجاتیں تائی اماں! اکٹھے آجاتے شاپنگ کو۔'' فضہ نے بھرپور خلوص کا مظاہرہ کیا، تائی اماں کے چہرے پہ ایک رنگ آ کر گزر گیا، اب بھلا انہیں کیا بتاتیں کہ منیب آمادہ نہیں تھا، کیسے رسے تڑاتا تھا، ابا جی کے خوف سے ساتھ تو آ گیا تھا مگر مجال ہے جو کسی چیز میں دلچسپی ظاہر کر کے دکھائی ہو۔

''بس پتر کچھ جلدی میں تھے تو......''

''لیں ویر بھی آگئے ہیں۔'' کنیز کے لہجے وانداز میں انوکھا جوش وخروش تھا، فطری سی بات تھی، سب کا یک بیک دھیان ادھر ہوا، منیب اپنے دھیان میں گلاس ڈور دھکیل کر اندر داخل ہو رہا تھا، بلیک ٹو پیس میں اس کی بے تحاشا سفید رنگت اور ٹھٹکا دینے والی شخصیت کا طلسمی تاثر گویا پورے ماحول پہ چھا رہا تھا، ہاتھ میں موجود سگریٹ کیس اور لائٹر کوٹ کی جیب میں رکھتے اس نے جیسے ہی نظروں کو اٹھا کر اماں اور کنیز کو کھوجا اپنی سمت متوجہ لاتعداد آنکھوں کی تپش کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا، سب سے پہلی نگاہ اماں کے ساتھ لگی کھڑی غانیہ پہ پڑی اور جیسے اس کے چہرے پہ موجود گمبھیر تاثر میں اضافہ ہوتا چلا گیا، ہونٹ غیر ارادی طور پہ باہم پیوست ہوئے۔

''السلام علیکم! کیسے ہیں منیب صاحب؟'' عامر بھائی خود اس کی جانب بڑھ کر مصافحہ کرتے اپنا تعارف کروا رہے تھے، ان کے انداز سے منیب کی پرسنالٹی کے لئے پسندیدگی ہی نہیں مرعوبیت کا احساس بھی چھلکتا صاف نظر آتا تھا، منیب نے چونک کر خالی نظروں سے انہیں دیکھا اور کھینچ تان کر رسمی مسکراہٹ کسی نہ کسی طرح ہونٹوں کی زینت بناتے اپنا آہنی مضبوط ہاتھ سپاٹ انداز میں ان

کے ہاتھ میں دے دیا۔

غانیہ جو اس کی بے اعتنائی ورکھائی کے ساتھ بیگانگی ونخوت کی مار سہہ چکی تھی، اس وقت سب سے زیادہ اسی بات پہ خائف ہوئی جاتی تھی کہ وہ یہی مار اس کے رشتوں کو بھی مارے گا، مگر اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے منیب کو عامر بھائی سے نارمل انداز میں بات چیت کرتے دیکھا، صرف عامر بھائی سے نہیں فضہ سے بھی، چاہے یہ گفتگو کتنی بھی رسمی کیوں نہ ہو، یہ اس کی حیرت ہی تھی کہ جس پہ قابو نہ ہوتا تھا، جبھی بے احتیاطی ہوئی کہ نگاہیں اس شخص کے چہرے پہ ٹکی رہ گئی تھیں، اسے احساس بھلے نہ ہو مگر دوسروں کو ضرور اس بے حجابی کا خیال تھا، جبھی شرارت میں سہی مگر کنیز نے اسے ٹوک دیا۔

''کچھ شرم کرو لڑکی! مشرقی دلہن ہو کر تم جس اشتیاق سے اپنے دولہا کو دیکھ رہی ہو لوگ باتیں بنائیں گے۔'' اس کے بازو میں چٹکی بھرتے کنیز کے کلاس لینے پہ وہ غانیہ خفت وخجالت سے گویا زمین میں گڑھنے کے قریب ہوئی فی الفور نگاہ ہی نہیں چہرہ بھی جھکا گئی تھی، منیب نے ظاہر بھلے نہ کیا مگر یہ سب کچھ اس کے علم میں ضرور آ گیا تھا، کہ اس پہ ہمیشہ اس کی کڑی نگاہ کا پہرہ غیر شعوری طور پہ دماغ لگا دیتا تھا، تو وجہ اس کی معمولی سے معمولی کمزوری کو بھی پکڑ میں لانا گرفت میں لینا ہی مقصود تھا۔

''نکا بھی آ گیا ہے، پتا لگ گیا ہے اسے کہ تو امی بن رہی ہے اس کی، اڑی لگا رہا تھا کہ مما سے ملا کر لاؤ۔'' کنیز کو ایک کے بعد دوسری یاد آ جاتی، وہ مسلسل اس کے کان میں سرگوشیاں کرنے میں مصروف تھی، غانیہ بے ساختہ مسکرا دی۔

''تو لے آتیں ساتھ، اسی بہانے ہم سب مل لیتے حمدان سے۔''

''اتنی جلدی کیا ہے جن سے ملنا زیادہ ضروری تھا، ان سے تو ملا دیا تمہیں۔'' کنیز پہ پھر شرارت سوار ہوئی، اسے آنکھ مار کر بولی، غانیہ سٹپٹا کر رہ گئی، اسے گھورنا چاہا۔

''ڈریس چوز کرنے میں غانیہ کی ہیلپ کر دیں منیب بھائی۔'' فضہ کا موڈ اچھا خاصا خوشگوار ہو چکا تھا، خوشدلی عروج پہ تھی، منیب جو اپنی ماں بہنوں سے واپسی کا کہہ رہا تھا، اس براہ راست جملے پہ کچھ لمحوں کو سہی مگر کنفیوز ضرور ہو گیا۔

''بہت معذرت سے، مجھے لیڈیز شاپنگ کا بالکل آئیڈیا نہیں ہے، ویسے بھی جنہوں نے پہننے ہیں وہ ساتھ ہیں آپ کے، تو ان کی پسند کا خرید لیں۔'' اس کا ٹھہرا ہوا لہجہ اپنے اندر کتنی سرد مہری سمیٹے ہوئے تھا، غانیہ پہ اٹھنے والی اڑتی پڑتی نگاہ میں کتنی تپش تھی، یہ صرف وہی سمجھ سکتی تھی، جبھی اپنی جگہ پہ ساکن ہو کر رہ گئی، اس کے علاوہ اس حاضر جوابی اور شائستگی کے مظاہرے کو ہر کسی نے پسند کیا، اماں اور کنیز بھی مطمئن نظر آنے لگیں، صد شکر وہ کچھ اوندھا سیدھا نہیں بول گیا تھا، حالانکہ اس سے کچھ ایسی امید بھی تھی انہیں، جبھی کچھ ڈری ڈری سی تھیں۔

(جاری ہے)

کس کے ہاتھوں پہ لہو تلاش کروں

صدف اعجاز

مکمل ناول

آنکھ سے اک بے بس آنسو فریم میں قید تصویر کے شیشے پر گرا تو زندگی بے اختیار سسکی، درد، کراہ، احتجاج و بے بسی رقم تھی اس چہرے پر، خاموش لب لیکن سراپا احتجاج، حوصلے مجتمع کرتا بکھرتا وجود آنکھوں کے سامنے وہ تکلیف دیتا منظر آٹھہرا، اس کی بے کسی پہ آنسوؤں نے احتجاجاً بہنا شروع کر دیا۔

خون سے لتھڑا وجود کسی اور کا نہیں اس کے ماں جائے بھائی کا تھا، میں کس سے فریاد کروں؟ کس کا گریبان پکڑوں؟ میں کس کے ہاتھوں پر اپنے پیارے کا لہو تلاش کروں؟

''بھائی! مجھے معاف کر دو، کتنی بے حس ہے تمہاری بہن؟ تمہارے بہتے خون کا حساب بھی مانگ نہیں سکتی، تمہیں انصاف دلا نہیں سکتی۔''

''انصاف اور وہ بھی اس سرزمین پر۔'' اندر ابھرتی سسکیاں اس کے اندر شور مچانے لگیں۔

یہ کیسی ستم گری ہے؟ یہ کس مقام پر آ کھڑے؟ جہاں نہ قاتل کی پہچان، نہ لہو گرنے والے کا جرم، یہ آخر کس کی سزا ہمارا مقدر بنی، یہ آخر نفرت کی آگ پر کن زندگیوں نے قدم رکھا، یہ بربریت اور ظلم کا شکار کون ہستیاں ہوئیں، یہ دیس جیسا میرا گھر پرایا کیوں ہوا، یہ کس کے بھیانک عمل کے بدلے میرا دیس نشانہ بنا، ان گنت سوالات ذہن کے پردے پر ابھرتے اور مجبور و لاچار وجود کو بے چین کر جاتے۔

آگاہی کا ادراک تو صحیح معنوں میں دو برس پہلے ہوا تھا، وہ تکلیف دہ، اذیت بھرا احساس جو اخبارات کی سرخیاں لکھتے ہوئے بھی نہ ہوا ہو، کئی سالوں سے ہر روز وہ اور اس کے ساتھی کولیگ اخبار کے لئے خبریں لکھتے۔

''کراچی شہر گولیوں کی زد میں، سات افراد جاں کی بازی ہار گئے، متعدد زخمی۔''

''کراچی شہر میں فائرنگ کی گونج، خوف و ہراس پھیل گیا۔''

''جمعہ کی نماز کے دوران زور دار دھماکہ بھگدڑ مچ گئی، نو افراد جان بحق، متعدد زخمی، زخمیوں کو ہسپتال پہنچا دیا گیا اور لاشوں کو شناخت کے بعد ورثہ کے حوالے، ذمہ داری سے لاشوں کو ورثہ کے حوالے کرنا بھی بہت بڑی ذمہ داری ہے، جو ایمان داری سے پوری کر دی گئی، پھر طویل فہرست حکمرانوں، سیاست دانوں، دانش واروں اور زندگی کے مختلف شعبہ ہائے سے متعلقہ لوگوں کے مزاحمتی پیغامات نشر اور کہانی ختم، نئے دن کا روشن سویرا اک نئی خبر کے ساتھ، کیا کہانی یہیں پر ختم ہو جاتی ہے؟ یقیناً نہیں۔''

اس طویل خوفناک کالی رات کے گزرنے کا کوئی حال احوال نہیں وہ رات کس کرب و اذیت سے ہوتی صبح کے روشن اجالوں تک پہنچی ہوگی، سو اصل کہانی تو وہاں سے شروع ہوئی جہاں لاشیں، خون سے لتھڑے، سفید چادر میں ڈھانپے وجود کو اس کے ورثہ کے حوالے کیا جاتا ہے، دل خراش مناظر، سسکتے وجود، کہیں چیخیں اور کہیں دبی گھٹی خود پر جبر کرتیں آہیں، سسکیاں۔

جانے والے منوں مٹی تلے اور پیچھے رہ جانے والوں کے لئے زندگی کا تھکا دینے والے سفر کا آغاز اور یہ سفر کتنا کٹھن اور دشوار ہو اس سے کسی کو واسطہ نہیں، کسی کو سروکار نہیں۔

رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کر رہی تھی، پورے دو سال بیت چکے تھے اسے اپنے بھائی سے بچھڑے مگر درد آج بھی اتنا ہی گہرا تھا، جتنا سال بھر پہلے، گالوں پر بہتے آنسو پونچھتے، اس نے فریم سائیڈ شلیف پر واپس رکھا، بیڈ پر بکھرے سامان کو سمیٹ کر وہ صوفے پر آ بیٹھی نم آنکھوں سے ایک بار پھر وہ بیڈ سائیڈ پر رکھے فریم کو دیکھنے لگی، بھائی کی بولتی مسکراتی آنکھیں اسے پھر سے بے چین کر گئی، تبھی ایک مدھم آواز کمرے کی خاموشی میں ارتکاش کا باعث بنی، اس نے نگاہ سیل فون پر ڈالی، وہ انٹرنیشنل نمبر تھا، یعنی نوریا عثمان کی کال وہ اس سے اس کا پروگرام کنفرم کرنے کے لئے کال کر رہی ہوگی، سال بھر پہلے اس کے یہاں سے جانے کے بعد بھی وہ اسے روز کال کرتی اس کی باقاعدگی سے آتی کالز اسے بھائی کے بعد نوریا عثمان کے بے حد قریب کر گئی۔

''السلام علیکم نوریا!'' حتی الامکان اس نے اپنے لہجے کو بشاش رکھنے کی کوشش کی۔

''کیسی ہو؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ سنائیں؟''

''روشانے! آج عادل کو ہم سے بچھڑے دو برس بیت گئے۔''

''جی نوریا! میں یہ دن کیسے بھول سکتی ہوں۔''

''کیا تم رو رہی تھی؟''

''جی! نوریا میں تکلیف میں ہوں کیونکہ میرے بھائی کے قاتل زندہ ہیں۔''

''اذیت میں تو میں بھی جی رہی ہوں، آج بھی کسی کا گریبان پکڑ کر پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیوں مارا عادل کو؟'' وہ پہلے ہی بے حد اداس تھی اور روشانے کی آواز اسے مزید اداس کر گئی۔

''مت روئیں نوریا! میں آپ کی اچھی زندگی کے لئے دعا گو ہوں۔'' دو ماہ بعد نوریا اپنی نئی زندگی کا آغاز کرنے جا رہی تھی، وہ خوش تھی کہ نوریا عثمان کم از کم اس کے بھائی کے غم سے باہر نکل سکے گی۔

''میں نہیں جانتی روشانے، اچھی زندگی عادل کے بنا کیسی ہوگی لیکن میں اپنے پیاروں کو مزید دکھی نہیں کر سکتی یہ فیصلہ میرے لئے بے حد مشکل اور تکلیف دہ تھا۔''

''نوریا! ہمیں جینا تو ہے اپنے پیاروں کے لئے، آپ بے حد خوش قسمت ہیں آپ کے پیارے آپ کے قریب ہیں۔'' جواباً وہ بھیگے لہجے میں بولی تو نوریا نے اک کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

''روشانے! میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

''نوریا! آپ اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں سوچیں، میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے نوریا کی بات اگنور کر دی۔

نوریا عثمان اسے ٹکٹ بھجوا چکی تھی، اب یہ اس پر منحصر تھا کہ اسے جانا ہے یا نہیں، اس کی زندگی اک جگہ آ کر ٹھہر گئی تھی، وہ عادل بھائی کی موت کے حصار میں قید تھی، عادل بھائی کی سنگت میں گزرے لمحے اس کے ماضی اور حال پر بری طرح قابض ہو چکے تھے۔

☆☆☆

وہ وسط نومبر کی ایک دلکش سرد اور یخ بستہ شام تھی، دریچے سے لگی شیشوں کے پار فضا میں اڑتے بادلوں کو دیکھتے ہوئے وہ سرشاری سے سوچ رہی تھی۔

میرا پاکستان، میرا دیس، اقبال کا خواب، لاکھوں لوگوں کی قربانی کا حاصل، جناح کا پاکستان، کتنے برسوں بعد وہ اس خوبصورت دیس کی سرزمین کو چھوئے گی، اس کے خوابوں کا مسکن، وہ پرانی رقتدار روایات پر مبنی گھر جس کا گوشتہ گوشہ محبت، امن وسکون کے نور سے منور تھا۔

یادیوں کے دریچے پر چند پل ہی نقش تھے، محبتوں میں گندھی محبتیں سمیٹے وہ مما، پاپا کے ساتھ کبھی وہاں رہتی تھی۔

اور پھر نجانے کب پاپا اپنے دیس کو چھوڑ کر اس پرائے دیس میں آ بسے، کئی ماہ وہ بے چین سی رہی، عادل کی آمد نے اس کی زندگی کو رونق بخش دی، یہاں کی پرآسائش زندگی کے باوجود بھی وہ دھندلی یادوں کا عکس اپنے دل سے نکال نہ پائی، وقت کی رفتار بڑھی تو پردیس کی اندھیری رات مما، بابا کو نگل گئی، گرینی نے ان دونوں کی ذمہ داری اٹھالی۔

عادل سے پہلی ملاقات، دوستی میں بدلتی محبت تک آئی اور چھ ماہ کے مختصر عرصے میں اس نے شادی کا فیصلہ بھی کر ڈالا۔

عادل پاکستان میں اپنی بہن کے ساتھ رہتا تھا وہ بس دو ہی بہن بھائی تھے، اس کی بہن روشانے کسی اخبار میں بطور صحافی جاب کرتی تھی۔

نیویارک کی اک سرد شام بڑی سادگی سے ہمارا نکاح ہوا تھا، پھر چند روز بعد وہ عادل کے ہمراہ پاکستان چلی آئی۔

برسوں پہلے اس زمین کی جدائی میرے دل میں واپسی کی خواہش جگا چکی تھی، حالانکہ عارم نے کتنا سمجھایا تھا۔

''نوریا! تم ایڈجسٹ نہیں کر پاؤ گی، یہاں اور وہاں کی لائف میں بہت فرق ہے، یہ وہ پاکستان نہیں جو ہم اتنے برس قبل چھوڑ کر آئے تھے۔''

''میری بچپن کی یادوں کا مسکن، میرا دیس ہے، میں خوش رہوں گی۔'' وہ گرینی اور عارم کی باتوں سے ہرگز کنوینس نہ ہونے والی تھی۔

''وہ وہاں جا کر رہنا چاہتی تھی، وہ گھر جہاں اس نے آنکھ کھولی، وہ اسکول جہاں پر وہ ممی کے ساتھ کئی ماہ تک جاتی رہی، اپنے دادا، دادی کی قبریں پس اپنی ہر یاد تازہ کرنے وہ وہاں جانا

چاہتی تھی۔"

وہ بے حد ایکسائیڈ تھی، عارم اور گرینی نے بالآخر خاموشی اختیار کر لی، اک عجیب کشش اسے کھینچتی اپنی سرزمین پر لے آئی، نجانے اسے اتنی جلدی کیوں تھی؟ کس چیز نے اسے بے چین کیے رکھا، شاید اس کا نصیب اسے بالآخر یہاں لے ہی آیا، دس ماہ عادل کی سنگت میں خواب بن کر گزر گئے، وہ عادل کے ساتھ کراچی اپنے آبائی شہر کو دیکھنے آئی، سارا دن رات دیر تک وہ روشنیوں کے اس شہر کو دیکھنے میں محو رہے، رات نو بجے ہوٹل واپسی کے لئے نکلے، باہر بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کو دیکھتی وہ عادل سے باتوں میں مگن تھی جب وہ موٹر سائیکل سوار اسلحے کی مدد سے گاڑی کے سامنے آ کھڑے ہوئے، اندھا دھند فائرنگ، چھینا چھپٹی، اک قیامت برپا کر گئی، نیم بے ہوشی میں اس نے عادل کے وجود کو محسوس کرنے کی کوشش کی مگر کر نہ پائی۔

وہ ہوش میں آئی تو سب کچھ ختم تھا، نہ پیروں تلے زمین رہی نہ سر کے اوپر آسمان، عادل اسے چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے جا چکا تھا، وہ اپنا اور عادل کا قصور تلاشتی، چیختی رہی۔

مگر...... اگر...... کاش...... لیکن...... جیسے سب کچھ چھن گیا اور بے بسی، آنسو، درد، تڑپ، سسکیاں، تکلیف وہ سفر رہ گیا۔

☆☆☆

کال بیل کی آواز پر وہ چونک گئی۔

"کون ہوگا؟" وہ باہر آئی تو فرحانہ بی مین ڈور کھول چکی تھیں جبکہ آنے والا اندر بھی آ گیا تھا، وہ لاؤنج میں کھڑا تھا، اسے پہچاننے میں ہرگز غلطی نہ ہوئی، وہ عارم عثمان تھا، نوریا عثمان کا بھائی اور یہاں اپنی بہن کو لینے آیا تھا، وہ نوریا عثمان کی طرح حسین اور ہینڈسم تھا، اسے دیکھ کر اپالو کا خیال ذہن میں ضرور آتا ہوگا۔

"ہیلو۔" اس کی کمرے میں موجودگی محسوس کر کے وہ اپنے انگریزی اسٹائل میں بولا۔

اس سے قبل وہ جواب دیتی نوریا چلی آئی اور اپنے بھائی کے سینے سے لگی اتنا روئی کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا، اپنے آنسو پیتی وہ عارم کے ساتھ نوریا کو سنبھالنے لگی، روشانے نے عارم کے روشن چہرے کو دیکھا جو اپنی بہن کی بے بسی پر ہونٹ چباتا اسے سنبھال رہا تھا، فرحانہ بی پانی تھما کر کچن میں واپس چلی گئیں تو وہ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کا غم بانٹنے لگے، روشانے نے کھڑکی کے پار پھیلے منظر پر آنکھیں جما دیں مگر کانوں میں نوریا کی مدھم سسکیاں گونجتی سنائی دیں۔

☆☆☆

"عارم! اب کب تک ہم واپس جائیں گے؟" اس کا دل یہاں سے بھر چکا تھا، وہ اب یہاں اس لہو رنگ سرزمین سے دور جانا چاہتی تھی۔

"میں ٹکٹس کے لئے کوشش کر رہا ہوں جیسے ہی ملیں گی ہم چلے جائیں گے۔" وہ ابھی لیپ ٹاپ پر بیٹھا آن لائن ٹکٹس خریدنے میں مصروف تھا۔

"عارم! جب ہم چلے جائیں گے تو روشی اکیلی رہ جائے گی۔" عارم نے سر اٹھا کر ذرا کی ذرا دیکھا وہ کسی گہری سوچ میں الجھی ہوئی تھی۔

"وہ اکیلے کیوں؟ ان کے رشتہ دار ہیں یہاں پر۔"

"عادل کے سوا اس کا کوئی نہیں ہے۔" اپنی سوچوں سے نکل کر وہ عارم کو دیکھنے لگی۔

"نوریا! وہ بچی نہیں ان کو کسی گارڈین کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہم اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں؟" کسی خیال کے تحت وہ بولی تو عارم چونک اٹھا، لیپ ٹاپ کو قدرے سائیڈ پر کرتا وہ پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"نوریا تم کیسی باتیں کر رہی ہو، گرینی کا آپریشن ہے میں ان کو وہاں چھوڑ کر تمہیں لینے آیا ہوں، اتنا ٹائم نہیں اور ویسے بھی ہمارا ان سے اب ایسا کوئی تعلق نہیں۔" عارم نے اسے مطمئن کرنے کے لئے بڑا تفصیلی جواب دیا تھا۔

"تعلق تو بن جاتا ہے اگر ہم بنانا چاہیں۔" وہ دھیمے سے منمنائی اور کھلے دروازے کے بیچ و بیچ کھڑی روشی ٹھٹک کر رک گئی، اس کے خیال میں نوریا اکیلی تھی مگر سامنے ہی عارم کو دیکھ کر وہ اندر جائے یا نہ جائے کا فیصلہ کرنے لگی، جب نوریا کی آواز اس کے قدم جکڑ گئی۔

"مثلاً کیسا تعلق؟"

"وہ بہت اچھی لڑکی ہے تم اس سے شادی کر لو۔" وہ کیا کہہ رہی تھی، اس کی بات پر وہ دونوں بھونچکا ہو کر رہ گئے، تبھی ان دونوں کی نگاہ روشی سے ٹکرائی۔

"نوریا!" دانت پیستے عارم نے اک بے بسی سے اسے گھورا، عارم کے سامنے اسے اپنی پوزیشن بے حد اکورڈ فیل ہوئی، تیزی سے وہ وہاں سے نکل آئی۔

☆☆☆

صبح ناشتے کی میز پر وہ اخبار کی سرخیاں دیکھنے میں مشغول تھی جب نوریا آئیں۔

"گڈ مارننگ، لگتا ہے رات آپ آرام سے سوئیں؟" وہ کل کی بات کا اثر زائل کرنے کی سعی میں بڑے نارمل انداز میں پوچھ رہی تھی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس موضوع پر اب مزید کوئی بات ہو خواہ وہ معذرت ہی کیوں نہ ہو، نوریا نے اک پھیکی سی مسکراہٹ سجائے سر اثبات میں ہلا دیا اپنے لئے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے وہ بولی۔

"تم یہ اخبار کیوں پڑھتی ہو؟"

"صحافی جو ہوں، اخبار نہ دیکھوں تو بے چینی سی ہوتی ہے۔"

"گڈ مارننگ لیڈیز!" عارم کی آمد پر وہ دونوں خاموش ہو گئیں، نوریا عارم کی جانب متوجہ ہوئیں تو وہ دوبارہ سے اخبار میں گم ہو گئی، عارم نوریا کے ساتھ موجود کرسی کھول کر بیٹھا تو وہ اس سے کہنے لگیں۔

"اتنی تیاری صبح صبح۔" اس کا حلیہ تیاری باہر جانے کا بتا رہا تھا۔

"نوریا! ہماری ٹکٹس کنفرم ہو گئی ہیں، میں ٹکٹس کو پک کرنے جا رہا ہوں۔"

"کب کی ہیں؟"

"آج رات۔" وہ آہستگی سے بولا تو روشانے نے اخبار سے سر اٹھا کر اس نے سرسری نگاہ عارم پر ڈالی، جانے کیوں اسے محسوس ہوا جیسے وہ جلد از جلد یہاں سے جانا چاہتا ہے۔

"رات کی، اتنی جلدی۔"

"ہو...... ہوں۔" اس نے کپ ہونٹوں سے لگاتے مختصر ترین جواب دیا، انداز یوں جیسے مزید کوئی بحث نہ ہو، ناشتے کی میز سے وہی سب سے پہلے اٹھا۔

"کیا؟ یہاں قریب سے کوئی ٹیکسی وغیرہ مل جائے گی۔" خدا جانے وہ کس سے مخاطب تھا۔

"تم ٹیکسی سے جاؤ گے؟"

"آف کورس، کیا کوئی اور آپشن ہے میرے پاس۔" اسے نوریا کا سوال انتہائی بچکانہ لگا۔

"آپ چاہیں تو گاڑی لے جا سکتے ہیں۔"

وہ اخبار سائیڈ پر رکھتی دھیمے لہجے میں بولی۔

''میرے پاس انٹرنیشنل لائسنس نہیں اور یہاں میں ڈرائیو نہیں کر سکتا۔'' وہ پہلی بار یہاں آیا تھا یہ جگہ، راستے، سب اس کے لئے اجنبی تھے۔

''ویسے بھی مجھے یہاں کے راستے نہیں آتے۔'' اس نے اپنی بات مکمل کی تو وہ کپ میں چمچ ہلاتے ہوئے سر ہلا گئی۔

''اچھا ذرار کو تو روشی تمہیں لے جاتی ہے۔'' نویرا اس کی تیزی پر متحیر ہوتی جلدی سے بولی۔

''ٹیکسی مل جائے تو میں مینج کر لوں گا۔''

ایک ثانیے کے لئے نویرا کی بات پر اس نے روشانے کے رسپانس کا انتظار کیا پھر بول اٹھا۔

''میں لے جاتی ہوں لیکن آپ کو دس منٹ ویٹ کرنا ہوگا۔'' وہ چائے کا آخری گھونٹ بھرتی آہستگی سے بولی۔

''کوئی پرابلم نہیں، یہ ویٹ کر لے گا، تم ریڈی ہو جاؤ۔'' نویرا جھٹ سے بولی تو وہ اٹھ کر کمرے میں آ گئی مگر اپنے پیچھے ابھرتی سرگوشی ضرور سنائی دی۔

''میں لیٹ ہونا افورڈ نہیں کر سکتا۔''

دس منٹ پورے ہونے سے پہلے وہ لاؤنج میں آ گئی، نویرا پر اک نرم سی مسکراہٹ ڈالتی وہ عارم کو چلنے کا کہتی مین ڈور کی جانب بڑھی، وہ نویرا کو تیاری مکمل کرنے کی تاکید کرتا اس کے پیچھے باہر آ گیا، گاڑی اسٹارٹ کر کے اس نے برابر والا دروازہ عارم کے لئے کھول دیا، پھر مین روڈ پر آتے ہی وہ بولی۔

''ٹکٹ کہاں سے پک کرنی ہے؟''

''میں آپ کو ایڈریس بتاتا ہوں۔'' وہ موبائل میں فیڈ کیا ایڈریس نکال کر بتانے لگا۔

''آل رائیٹ، میں سمجھ گئی۔'' اس نے گاڑی اس کے بتائے گئے راستے پر ڈال دی، وہ خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہی تھی جبکہ اس کے برابر بیٹھا شخص گاڑی کے باہر کے مناظر کو بڑے غور و فکر سے ملاحظہ فرما رہا تھا، تبھی اس کی آواز گونجی۔

''صد افسوس، جیسا سنا تھا بالکل ویسا ہی ہے۔'' وہ اس سے انگریزی میں مخاطب تھا، اس کے چہرے کے ساتھ اس کا انداز بھی قدرے جتانے والا تھا۔

''مثلاً کیسا؟'' جواباً وہ سنجیدگی سے قیاس کرنے لگی۔

''No laws, No rules, No discipline even no humantity۔'' وہ چہرے پر افسوس زدہ تاثر بھرے گویا ہوا، روشنی نے موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی سے باہر کی زندگی کو اک دکھ سے دیکھا مگر ہنوز خاموش رہی۔

''البتہ یہاں پر Luxurious چیزوں کی فروانی سی ہے، آسمانوں کو چھوتی یہ بلند عمارتیں، بڑی بڑی لگرثیری گاڑیاں، اعلیٰ شان دار گھر، جدید موبائلز، ایک سائیکل، رکشے والا موبائلز افورڈ کر سکتا ہے مگر ٹریفک سگنلز پر رک کر قانون کا احترام کرنے کا وقت نہیں اور انسانیت او، اس کے لئے کوئی چیز دکھائی نہ دی، آس پاس گاڑیوں کا ہجوم ہے اور دوسری طرف وہ غریب جو نڈھال بنا کپڑوں کے فٹ پاتھ پر سو رہا ہے، نجانے آج کے دن اسے کچھ کھانے کو ملا بھی ہے کہ نہیں۔'' بولتے بولتے اس نے سامنے فٹ پاتھ کے ساتھ بنی گرین بیلٹ پر مست سوتے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔

''بے رحمی، یہ بچے سڑکوں پر بھیک مانگتے مانگتے گاڑیوں کے نیچے آ کر نہیں مرتے۔'' اس

نے سر گھما کر روشانے سے قیاس کیا۔

''آئی ایم شیو، ضرور مرتے ہونگے، ان گاڑیوں والوں کو نیو سائن چمکتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے تو یہ غریب معصوم بچے کہاں دکھائی دیتے ہونگے، تبھی تو یہاں موت اتنی عام اور سستی ہو گئی ہے۔'' یہ اس کا پندرہ منٹ کا تجزیہ تھا جو اس نے اپنی آنکھوں دیکھا حال روشانے کے گوش گزار کیا، جواباً روشانے اس کے الزامات پر اپنا دفاع کرنا چاہتی تھی لیکن کیسے کرتی تقریباً بیس دن پہلے تو اس نے انسانیت کا پرچار کرتی قوم کے ہاتھوں اپنا بھائی کھویا تھا، روشنی نے اس کے بتائے گئے ایڈریس پر گاڑی روک دی۔

''یہاں سے آپ کو ٹکٹس مل جائیں گئیں۔''

''او شکریہ، آپ چل رہی ہیں؟'' وہ اترنے سے پہلے اخلاقاً اس سے پوچھنے لگا۔

''جی!'' گاڑی کو لاک کر کے وہ عارم کے ساتھ اندر آ کھڑی ہوئی۔

ٹریول ایجنٹ کے پاس اچھا خاصا رش تھا، سبھی بنا لائن کے خیال کیے اردگرد پھیلے اپنی اپنی بولی بولے جا رہے تھے، ایک کاؤنٹر پر کوئی حضرت لڑنے میں مشغول تھے، عارم کی پریشان صورت دیکھ کر وہ اسے قدرے کم رش والے کاؤنٹر پر لے آئی اور تقریباً آدھے گھنٹے کی دھکم پیل کے بعد وہ ٹکٹس لے کر باہر آئے تو روشانے اپنی گاڑی کے پیچھے پارک کی جانے والی کار کو دیکھ کر جھنجھلا اٹھی، اس نے اردگرد موجود حضرات سے گاڑی کے والی وارث کے بارے میں پوچھنا چاہا تو جناب ''معلوم نہیں'' کی صورت میں موصول ہوا، اس نے اردگرد لفٹر تلاش کرنا چاہا وہ بھی نظر نہ آیا۔

''یہاں اتنا رانگ ہے کہ ایک معصوم سا لفٹر بھی تھک کر لنچ بریک پر چلا گیا ہوگا۔'' عارم کا مذاق اڑاتا انداز اسے منوں شرمندگی میں ڈبو گیا۔

''کچھ دیر ویٹ کرنا ہوگا؟'' ناچار اسے کہنا پڑا۔

''کتنا، میری فلائیٹ تو مس ہونے کا چانس تو نہیں۔'' وہ شرارت سے مسکرایا تو روشانے نے بھی ڈھیٹ بنتے ہوئے لاعلمی ظاہر کرتے اپنے کندھے اچکا دیئے، عارم گاڑی کو ٹیک لگا کر کھڑا ہوا تو وہ اردگرد دیکھتی حضرات کے جلدی آ جانے کی دعا کرنے لگی، صد شکر کے زیادہ انتظار کرنا نہیں پڑا، ایک کھسیانی ہنسی ہنستے سوری سوری کرتے وہ اپنی گاڑی میں بیٹھے اور یہ جا وہ جا، روشانے جو انہیں صلواتیں سنانے کے پورے موڈ میں تھی خاموشی کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

واپسی کے سفر پر عارم نے اسے پاکستان میں دیواروں پر لکھے گئے فقرات پڑھ کر سنائے، وہ اردو میں اچھا خاصا کمزور تھا مگر کہیں کہیں انگریزی میں لکھے لفظ سے اشتہاروں کی نوعیت کا اندازہ لگا رہا تھا۔

''فلاں دواخانہ۔'' اس نے باآواز بلند پڑھا تو روشانے بے اختیار مسکرا دی۔

''اٹس اے رئیلی گڈ آئیڈیا، والز کا کوئی تو فائدہ ہونا چاہیے۔'' وہ اب مسکراتے ہوئے دلچسپی سے اس کی بات سن رہی تھی۔

☆☆☆

کہتے ہیں، کسی کے جانے سے زندگی نہیں رکتی، چلتی رہتی ہے البتہ خوشی، سفر زندگی تو بھلے سے چلے، خوشی کا کیا؟

ٹھک ٹھک تیزی سے چلتا قلم دروازے پر ہونے والی دستک پر رک گیا، اپنے سامنے بکھرے کاغذوں کو اکٹھے کر کے وہ دروازے تک

آئی۔

''آئیں نویرا!'' دروازے پر کھڑی نویرا کو اس نے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

''بزی ہو؟''

''نہیں تو، بس کچھ لکھنے کا موڈ ہو رہا تھا، اندر آئیں۔'' انہیں درمیان میں ہنوز کھڑے دیکھ کر اس نے دوبارہ اندر آنے کو کہا۔

''آپ کی تیار ہوگئی؟''

''ہوگئی تیاری، کیا تم مجھے مس کرو گی؟'' نویرا کی آنکھوں میں ٹھہرے پانی پر وہ نگاہ ڈالتی اک ہلکا سا درد بھرا سانس لیتی بولی۔

''کیوں مس نہیں کروں گی اور ہم ایک دوسرے سے رابطہ ضرور رکھیں گے۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''مجھے ملنے آؤ گی؟''

''زندگی نے موقع دیا تو آپ کی پرسکون دنیا دیکھنے ضرور آؤں گی۔'' وہ ان کے دونوں ہاتھ تھام کر آہستگی سے سر اثبات میں ہلاتی کہہ رہی تھی۔

''میری دنیا، اگر وہ میری دنیا ہے تو یہ کس کی ہے؟''

''وحشی درندوں کی۔'' وہ خود کلامی کرنے لگی، خود کو بار بار سنبھالنے کے باوجود بھی وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ پا رہی تھی۔

اور یونہی روتے، بلکتے، سسکتے عادل حسن اور روشانے کے دیس سے جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔

روشنی انہیں ایئر پورٹ سی آف کرنے آئی تھی، وہ سب خاموش تھے یہ خاموشی آزردگی ان کا مشترکہ درد تھا اور یہ درد میں کمی کب ہو کسے خبر۔

''رات کافی ہو چکی ہے آپ کو واپس چلے جانا چاہیے۔'' عارم کو روشنی کے چہرے پر بے حد ویرانی محسوس ہوئی، سو اسے گھر بھیجنے میں ہی عافیت جانی۔

''میں مزید کچھ دیر نویرا کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔'' تبھی نویرا نے آگے بڑھ کر اس کے برف جیسے ٹھنڈے ہاتھ تھام لئے۔

''روشنی، میں تمہیں تنہا چھوڑے جا رہی ہوں۔''

''آپ کو جانا ہی تھا، کب تک رکتیں۔''

جبھی عارم نے آگے بڑھ کر نویرا کا ہاتھ تھامتے ہوئے اسے ہولے سے خدا حافظ کہا اور اندر کی جانب بڑھ گیا، پھر نہ اس نے پلٹ کر دیکھا اور نہ ہی نویرا کو دیکھنے دیا، بھرے ہجوم میں وہ تن تنہا کھڑی رہ گئی۔

''یہ میرا وطن، میری دھرتی، میرا دیس مجھ سے میرا واحد آخری سہارا چھین کے لے گیا۔'' وہ رو رہی تھی، اس کا دل اس کی روح سب رو رہے تھے۔

وقت کی سوئیاں آگے بڑھیں تو رو دھو کر وہ بھی خود کو اپنی جاب میں گم کرتی بھاگتی دوڑتی زندگی میں سست روی کے ساتھ ہی سہی چلنے لگی۔

☆☆☆

اکیس اکتوبر۔

ایئر پورٹ کی رونقوں اور گہما گہمی میں سے گزرتے ہوئے اس نے سوچا کتنا عجیب تھا یہ سب، وہ اپنے بھائی کی بیوہ کی شادی اٹینڈ کرنے جا رہی تھی۔

جہاز ایئر پورٹ سے بلند ہوا تو نیچے وہ شہر نظر آنے لگا جو اس کا گھر تھا جہاز کی سلیٹ سے ٹیک لگائے وہ سوچ رہی تھی۔

''نجانے کیسا دیس ہوگا؟ کیسے لوگ ہوں گے وہاں کے؟ اسے جانا بھی چاہیے تھا کہ نہیں۔''

اک الجھن سی گھیرے تھی۔

پچھلے ڈھائی سال سے وہ بے حد خاموش اور کسی حد تک بد مزاج ہوگئی تھی، نہ ہنسنے کو دل چاہتا اور نہ کسی سے ملنے کو حالانکہ وہ ایک صحافی تھی، ہر چیز سے دل اچاٹ ہو چکا تھا، اس کے قریبی ساتھیوں کا خیال تھا، ماحول اور جگہ کی تبدیلی اس کی ڈوبتی زندگی کو قدرے سکون زدہ کنارہ بخشے گی۔

جبراً ہی سہی، شاید اس میں اتنی سکت تھی ابھی طویل مسافتوں کو سینے کی اور بے وجہ محبت نبھانے کی، تبھی تو نویرا کی پرخلوص دعوت کو قبول کرتی چلی آئی۔

اس نے جہاز کی کھڑکی سے نیچے جھانکا جہاں اب زمین نہ تھی، سمندر تھا بحر اوقیانوس، اتنا پانی کہ کہیں مت دور، سمندر پار، بحر اوقیانوس کے پار نیویارک وہ شہر جہاں اسے جانا تھا۔

ایک بار دوبارہ اس نے جہاز کی سلیٹ کو ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی اور آنکھوں میں تیرتی نمی کو اپنے اندر اتارنے لگی۔

کئی گھنٹوں پر محیط یہ طویل سفر بالآخر گزر ہی گیا، جہاز نیویارک کے جان ایف کینڈی ایئر پورٹ پر اترنے کو تھا، جہاز کی بلندی جوں جوں کم ہوتی گئی اس کے ساتھ نیچے جو ذرے اور دھبے دکھائی دے رہے تھے وہ دھیرے دھیرے فوکس میں آنے لگے، اک گہرا اور طویل سانس بھرتے اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

جہاز سے باہر آنے کے بعد امریکی امیگریشن افسر کا تفتیشی سوال و جواب پر مبنی انٹرویو شروع ہو چکا تھا۔

''آپ پاکستان میں کیا جاب کرتی ہیں؟''

''میں صحافی ہوں۔'' وہ دھیرے سے گویا ہوئی۔

''نیویارک میں کہاں قیام کرو گی؟''

''اپنی دوست کے گھر۔'' اسی قسم کے سوال جواب کا سلسلہ پانچ منٹ میں مکمل ہوا، اس پل صراط کو پار کر کے وہ سامان کی دھڑ دھڑ کرتی متحرک بیلٹ کے سامنے جا کھڑی ہوئی، انتظار کے لمحے میں گردن گھوما کر ارد گرد نگاہ دوڑا کر دیکھا تو تمام چہرے اجنبی اور خود سے مختلف دکھائی دیئے نہایت تہذیب یافتہ عوام کے افراد۔

یہ ایک ایسا ملک تھا جہاں آنے کی خواہش بہت سے انسانوں کے دل میں بسی ہے، گہما گہمی کا عالم لئے یہ جگہ اپنی تمام تر زندگی کی لذتوں میں لپٹی تھی اور وہ جو کروڑوں انسانوں کے ملک سے آئی تھی، نجانے کیوں اس پل، اپنا دیس سناٹوں، خاموشی اور سسکیوں کی زد میں دکھائی دیا، جہاں ماتموں کا راج عام ہوگیا تھا، جہاں پرخشونت اور غصیلے چہرے عام ہونے لگے تھے، مسکراہٹ اور حقیقی خوشی مانند پڑتی جا رہی تھی، اس شور اور بے خود آزادی اور زندگی سے بھرپور حظ اٹھانے والے لوگوں کے جھرمٹ سے خود کو آزاد کرتی ٹرالی گھسیٹ کر ایئر پورٹ کے بیرونی جانب چلی آئی۔

نیویارک کے جے ایف کینڈی ایئر پورٹ پر ایک آسودگی اور راحت سے بھرپور سفر کے باوجود وہ طویل سفر کی بے پناہ تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی، ایئر پورٹ کے بیرونی احاطہ میں آ کر وہ ٹھہر گئی۔

''گڈ ایوننگ۔'' اپنے دائیں جانب سے آواز سنائی دی تو اس نے سر گھوما کر آنے والے کو دیکھا، وہ عارم عثمان تھا۔

اک جبری مسکراہٹ چہرے پر سجا کر اس نے سر ہلایا، نویرا کو نہ دیکھ کر وہ جھنجھلائی تھی۔

''کیسی ہیں آپ؟'' اس کی خیریت پوچھتا

وہ اس سے سامان والی ٹرالی لیتا اس کے ساتھ پارکنگ کی جانب بڑھنے لگا۔

''سفر کیسا رہا؟''

''اچھا۔'' اس نے ہولے سے جواب دیا۔

''نویرا آپ کو لینے آرہی تھی لیکن عین اسی لمحے سیف آگیا۔'' اس کی مسلسل خاموشی کو جانے وہ بھانپ گیا تھا تبھی نویرا کے نہ آنے کا بتا رہا تھا۔

جواباً اس کی بدستور خاموشی پر وہ خود بھی خاموش ہوگیا، جس پر وہ صد شکر کرتی کھڑکی سے باہر آسمانوں سے باتیں کرتیں بلند عمارتیں دیکھنے لگی۔

☆☆☆

شیشے کی دیوار بنی کھڑکی پر بارش کی بوچھاڑیں گیلے آبی آنسو بہاتیں ماتم کرتیں، دستکیں دیتی تھیں، موسموں کے پیمانے میں آخر ستمبر کو نیویارک میں باقاعدہ خزاں کا آغاز ہوجاتا تھا اور وہ جو خود بھی خزاں کی زردی کی زد میں آئی ہوئی تھی کہ ڈوبتے سورج کی زردی حیات کے منظر کو زرد کررہی تھی، وہ جو خود خزاں تھی اس موسمی خزاں کو دل میں اتارتی بے حد رنجیدہ اور ملول ہو رہی تھی، دوسری منزل سے نیچے بارش اور تیز ہواؤں کی زد میں آکر انہی ڈالیوں سے بچھڑنے والے بے انت چنار کے پتے پہلے تو زرد کٹی پتنگوں کی طرح ڈولتے اور پھر وہ برستے مینہ میں بھیگتے بھاری ہوکر نیچے سڑک کے پتھریلے فرش پر جا چپکتے، اس شیشے کی دیوار نما کھڑکی پر بارش کے بے تحاشا آنسو برستے اسے دھندلاتے تو نیچے فرش سے چپکے زرد پتے اسے ماضی میں لے گئے اور اس کے قریبی ساتھیوں کے خیال میں۔

''آہ، ماحول کی تبدیلی مجھے زندگی کا احساس بخش دے گی، جانے وہ کیسے۔'' ابھی تک تو اس کے وجود میں ایک بے چین سنسنی تھی جو ایک نامعلوم جنگل میں داخل ہوتے ہوئے خم بنتی ہوئی، اسے یہاں آئے چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔

نویرا اس کے ہونے والے شوہر سیف، آنٹی سیبکا، گرینی اور آئرہ وہ ان سب سے مل چکی تھی، اس کی خاموشی کو اس کی تھکن سے مشروط کرتے ہوئے نویرا اسے کمرے میں آرام کرنے کے لئے چھوڑ گئی تھی اور اب وہ اس شیشہ نما دیوار کے سامنے کھڑی خود کے درمیان الجھی بکھری کھڑی تھی۔

نویرا اسے تین چار دن ہی کمپنی دے سکی، وہ سیف کے ساتھ رخصت ہوکر گئی تو روشا نے خود کو پرائے دیس میں بالکل ہی اکیلا سمجھنے لگی، حالانکہ مصروفیت کے باوجود گرینی اسے وقت دینے کی کوشش کرتی، عارم سے بھی معمولی نوعیت کی ہیلو ہائے ہو ہی جاتی، یہاں سب اپنی اپنی زندگی میں بزی تھے، اسے صرف اپنا آپ ہی فارغ لگتا تھا۔

اوائل نومبر کی ایک مدھم شام میں وہ عارم کے ساتھ دنیا میں اپنی من مانی سے راج کرتے ملک کا ایک کبھی نہ سونے والے شہر نیویارک دیکھنے چل دی۔

یہ ملک، امریکہ جدید کمفرٹ سے لبریز اتنا بڑا تھا کہ اس میں گم ہوا جا سکتا ہے، بلند ترین عمارتیں، برگر کولا اور ہالی ووڈ کا جہاں بے حد کشش اپنے اندر رکھے تھا۔

براڈوے سٹریٹ سے نکل کر وہ ٹائم سکوئر جانے والے راستے پر ہولئے۔

''ہوپ، میں آپ کو یہ شہر اچھی طرح سے دکھا سکوں اور میری کمپنی آپ کو بور بھی نہ کریں۔'' وہ روشنی کی سنجیدگی سے خاصا خائف تھا، گرینی اور نویرا کا اصرار نہ ہوتا تو وہ ہرگز ایسے بدمزاج مہمان کی میزبانی سرانجام نہ دیتا۔

جواباً اسے وہی خاموشی، گونگا پن ملا، وہ بھی

بے بس تھی، اسے نہ یہ شہر دیکھنے کی خواہش تھی اور نہ ہی کسی کی اچھی کمپنی کی ضرورت، وہ یہاں کیوں آئی یہ سوال اب تک بنا جواب اس کے دماغ میں ادھم مچائے تھا۔

عارم مین پوائنٹ سے کافی دور گاڑی پارک کرکے اسے لئے اس جگہ آگیا جیسے ٹائمز سکوئر کہا جاتا ہے، روشنی نے نگاہ گھما کر خوشی سے لبریز اور بے خود مسرت میں بھٹکے ہوئے لوگوں کو دیکھا، تبھی اس کے برابر چلتا شخص اسے ایک گائیڈ کی طرح بتانے لگا۔

''1940ء میں یہاں نیویارک ٹائمز اخبار کی یہ بلند عمارت بنی تو اس کی مناسبت سے اسے ٹائمز سکوئر کہا جانے لگا۔'' وہ اخلاق میزبانی نبھانے پر مجبور تھا، تبھی اس کی خاموشی اور انداز اطوار کی پرواہ کیے بنا بولے چلا جارہا تھا۔

''یہاں لوگوں کو خوش کرکے اپنا رزق کمانے والے بڑے بڑے باکمال لوگ آپ کو نظر آئیں گے۔'' روشنی نے اختیار نظر دوڑا کر دیکھا سٹورز کے سامنے، فٹ پاتھوں پر اور اکا دکا سڑک کے عین درمیان میں کیسے کیسے عجوبہ روزگار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے دکھائی دیے۔

''نیوائیر کی آمد پر دنیا کا سب سے بڑا جشن یہاں منعقد ہوتا ہے جن میں لاکھوں لوگ شریک ہوتے ہیں، رات کے پورے بارہ بجے اس کے مرکز سے ایک بہت بڑا گیند روشنیاں بکھیرتا نیچے آتا ہے اور لوگ خوشی سے بے خود ہوکر نعرے لگاتے ہیں۔'' وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے گیند والی جگہ دکھا رہا تھا، وہ جہاں جہاں اشارے کرتا روشنی بے اختیار چہرے کے ساتھ وہاں دیکھنا شروع کردیتی، بے شک وہ بے حد خوبصورت، ترقی یافتہ ملک تھا، مگر اسے دیکھنے کی چاہ اس کے اندر نہ تھی سوا اپنے اندر کی بے چینی سے مسلسل لڑتی حالت جنگ کی کیفیت میں مبتلا وہ اپنے قریب کھڑے شخص کو سننے کی سعی کررہی تھی۔

''کیا آپ کو یہ جگہ اچھی نہیں لگی۔'' اس کی مسلسل خاموشی پر وہ رک گیا۔

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں، یہ جدت ہی تو آپ امریکن قوم کا فخر ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے اندر کی فرسٹیشن باہر لے آئی اس کے جملوں پر لمحہ بھر کو اس نے روشنی کا چہرا دیکھا۔

''ترقی کرنا، آگے بڑھنا کسے اچھا نہیں لگتا۔'' وہ سوال کررہا تھا یا روشنی کے نالج میں اضافہ وہ سمجھ نہ سکی۔

''سب کو۔'' اس کے لبوں سے دھیرے سے پھسلا۔

''یہ حق سب کو ملنا چاہیے۔'' اپنے اندر بڑھتے غبار کو قابو کرتی وہ لفظوں پر زور دیتی طنزیہ مسکرائی۔

''رامیٹ یہ حق سب کو حاصل ہونا چاہیے۔'' اس کے لہجے کی تلخی کو پہچان چکا تھا تبھی قدرے ہڑبڑا کر کہہ رہا تھا۔

''اور اپنا حق مانگنا بھی آنا چاہیے۔'' وہ کیا بتانا چاہ رہی تھی اور وہ اسے کیا سمجھانا چاہتا تھا، وہ بحث نہیں چاہتی تھی سو چپ ہوگئی، وہ ٹائم سکوئر کے مرکز میں گھومتے ایک جگہ آکر رک گئے۔

''بگھی میں بیٹھیں گی۔'' روشنی نے سامنے بنی ٹھنی بگھیاں دیکھیں جن کے گھوڑے بھی سجے ہوئے تھے۔

''یہ تیس منٹ کے لئے ٹائم سکوائر کی سیر کروائے گی اور دوران سفر اس کی تاریخی ثقافتی اہمیت بھی بیان کرے گی۔'' وہ اس کی بیزاریت اور خشک لہجے کو خاطر میں لائے بنا بتا رہا تھا۔

''آپ کا موڈ خوشگوار کرنے کے لئے ہو سکتا ہے کوئی لوک گیت بھی سنا دے۔'' آخر میں

دھیرے سے اس کے خفگی بھرے چہرے پر نظریں ڈالتا گویا ہوا۔

''نہیں اور کچھ اچھا ہے یہاں دیکھنے کے لئے۔'' سر جھٹک کر اس نے بگھی میں بیٹھنے سے انکار کرتے ہوئے قیاس کیا، اس کے عجیب و غریب انداز پر عارم تپ گیا وہ اپنا قیمتی وقت نویرا کی فضول قسم کی مہمان لڑکی پر ضائع کر رہا تھا۔

''یہاں سب کچھ بہت دلچسپ ہے اب آپ کو کیا اچھا لگتا ہے یہ آپ......'' وہ بڑے تحمل سے بول رہا تھا جبکہ روشنی اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہلکی مسکراہٹ چہرے پر سجائے بول اٹھی۔

''آپ تو برا مان گئے، آپ کا ملک بہت دلچسپ اور خوبصورت ہے، مگر کسی کی سسکیوں اور آہوں پر بنے ملک زیادہ دیر تک تو خوبصورت اور دلچسپ نہیں رہتے۔'' عارم عثمان چلتے چلتے بے ساختہ رک گیا، گردن گھوما کر بڑی تفصیلی نگاہ سے اس نے روشنی کا جائزہ لیا۔

''You don,t like America as typical eatremist pakistani۔'' وہ جو سمجھا کہہ ڈالا، لحاظ، مروت والا وہ بھی کہاں تھا، نویرا کی نند وہ بھی غم زدہ لڑکی سمجھ کر وہ کرٹسی شو کر رہا تھا لیکن کب تک وہ اس کی ان تلخ باتوں سے لطف اندوز ہوتا رہتا، عارم کا فقرہ روشنی جیسی جذباتی لڑکی کو سن کرنے کے لئے کافی تھا۔

''آپ Typical extremist کسے کہتے ہیں۔'' وہ ایک امریکن پاکستانی کی سوچ قریب سے جاننا چاہتی تھی سو بڑی سنجیدگی سے گویا ہوئی، عارم نے ایک نگاہ غلط غصے سے قابو پاتی لڑکی کو دیکھا، پھر بات بڑھ نہ جائے کا خیال کرتا قدرے نرم لہجے میں بولا۔

''اس کو، جو اپنے کیے دھرے کا الزام دوسروں پر ڈالتے، اپنی ناکامی کا ذمہ دار کسی اور کو سمجھے، جو اپنے ملک میں قتل و غارت کے بازار کا قصور وار اور قاتل کسی اور کو بنا حقیقت سمجھے مانے۔'' وہ دوبارہ چلنا شروع ہو گئے تھے اور چلتے چلتے قدرے رش سے باہر آ گئے، ایک دوسرے کے ساتھ چلتے وہ انتہائی مروت بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''اور جو آپ کا ملک دنیا کے دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر کے انہیں دشت گرد قرار دے رہا ہے۔'' وہ جو جواب کے لئے اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا اس کے سوال پر ہکا بکا ہوا۔

''روشانے یہ آپ بار بار آپ کا ملک، آپ کا ملک مت کہیے۔'' وہ پر سکون سا تھا، اس کا انداز پر سکون تھا، چاہے اندر اس کی باتیں اسے تپا رہی تھیں۔

''میں یہاں کا شہری ہوں، اسے اس کی تمام اچھائیوں، برائیوں سمیت OWN کرتا ہوں، آپ کو بتاؤں میں حقیقتاً بہت خوشی محسوس کرتا ہوں اس ملک کو اپنا دیس کہتے ہوئے کیونکہ یہاں میرے اہل خانہ محفوظ ہیں، یہ ضرورت زندگی کی تمام سہولیات مہیا کرتا ہے، یہ اپنے شہریوں کی حفاظت جان کی بازی لگا کر کرتے ہیں، ایک شہری کی بھیانک موت پر دنیا ہلا دیتے ہیں یہ سوئی قوم نہیں یہ جاگتی، باشعور، خود مختار، اپنے وسائل سے فائدہ اٹھانے والی وفا دار قوم ہے، اس قوم کے ہاتھوں میں کشکول نہیں، یہ اپنے کسی شہری کے دل میں بے انصافی کا جذبہ پیدا نہیں کرتی۔'' وہ اب مسکراتے ہوئے بڑی دلچسپی سے اسے بتا رہا تھا۔

''آپ دوسروں کو بھلے الزام دیجیے پر خود

آپ ایک نظریہ، ایک پرچم، ایک ایمان، ایک مذہب اور یقین کی چھتری کے نیچے تو کھڑے ہوئیں۔'' وہ اس کے چہرے پر بیک وقت غصہ اور شرمندگی دیکھ سکتا تھا۔

''اپنی سیاسی اور خارجہ پالیسی کو ڈسکس کیے بنا الزامات دھرنا، آپ اتنے کمزور ہیں کہ دوسرے آپ پر آسانی سے اثر انداز ہو جائیں، صرف یہی فخر تو کافی نہیں کہ آپ اس قوم کی فرد ہے جس کا بانی عزت اور وفا داری کا پیکر تھا۔'' اس کے تاثرات کو بخوبی پڑھتا وہ رک گیا۔

''آئی ایم سوری، یہ سب سننا آپ کو اچھا نہیں لگا۔'' وہ آہستگی سے بولا جبکہ روشنی خاموش تھی، اب مزید بولنے کو کچھ نہ تھا، وہ وہی عام سی ماضی کے خود دار ہیرو کے کارنامے بتاتی حقیقت جانے بنا یا جانتے بوجھتے ہوئے بھی انکاری ہونا، کب تک آخر؟

☆☆☆

پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ سونے کی مسلسل کوشش کر رہی تھی مگر نیند تھی کے اتنی تھکاوٹ کے باوجود روٹھی ہوئی تھی۔

''ٹائمز سکوئر۔'' وہاں کا ایک ایک منظر اس کی آنکھوں میں چھپ گیا تھا، حالانکہ اسے دیکھتے وقت وہ ذرا بھی ایکسائیڈ نہ تھی، وہ تمام آوازیں اس کے دماغ میں گھوم رہی تھیں جن کو سننے کے بعد اس کا اضطراب مزید بڑھ گیا تھا، اضطراب بے سبب نہیں ہوتا بلکہ یہ بھولا ہوا سبق، چھوڑی ہوئی منزل اور نظر انداز کیے ہوئے فرائض یاد دلاتا ہے۔

وہ حساسیت کے اس مقام پر کھڑی تھی جہاں بے تحاشا Anger اور فرسٹیشن اسے حقیقت سے آشنائی نہیں کروا پا رہا تھا۔

''میں تاریخ کے اوراق پلٹ کر زیادہ پیچھے نہیں جانا چاہوں گی میں تو صرف اس تاریخ کا ذکر کروں گی جو 1947ء سے شروع ہوتی ہے۔''

''وہ لوگ جن کے خلوص اور وفا داری کی گواہ یہ مٹی تھی، جن کی جانیں اس مٹی کے لئے شہید ہوئیں، اف یہ مٹی زرخیز مٹی جس نے قائداعظم سے لے کر راشد منہاس جیسے وفا دار جانثار پیدا کیے، کہاں ہے وہ مٹی اب جو بے گناہوں کے خون سے بھری ایک بھی وفا دار، مخلص انسان پیدا نہ کر سکی، کیا اس مٹی سے وفا داری کی خوشبو روٹھ چکی ہے، اس مٹی میں پلنے والے اپنی مٹی کے لئے قربان ہونے والی جانوں کی قربانی بھول چکے ہیں، کیا آزادی کے معانی تبدیل ہو چکے ہیں۔''

''آہ، آزادی، آزادی، تو آج بھی اس خواب کی مانند ہے جو کبھی مفکر علامہ اقبال نے دیکھا تھا اور محمد علی جناح جو اس خواب کو تعبیر کا روپ دے گئے۔''

ایام بچپن کے دنوں میں ٹیلی ویژن پر جشن آزادی کی اہمیت، بھاری بھر تقاریر، جوشیلے بھڑکیلے ملی نغمے خود مختار قوم کا احساس دلاتے تھے۔

جیسے جیسے شعور کی بلندیوں پر قدم رکھتی گئی تو آزادی کے پلڑوں میں حالات و سانحات تولنے لگی، آزادی کی اہمیت و فوقیت کے یہ تمام بھاشن اپنی اہمیت سی کھونے لگے، یہ جوش و خروش مانند پڑتا آزادی کے حقیقی مفہوم سے روشناس کروا گیا، یہ نام و نہاد آزادی کے جشن جیسے ہر سال منانا صرف اپنا فرض سمجھنا محسوس ہوتا۔

☆☆☆

گرینی کے بے حد اصرار پر ناچار وہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر عارم کے ہمراہ دیکھنے چلی آئی تھی، آج وہ کوئی بحث نہیں کریں گی اور نہ ہی کچھ ایسا بولے

گی جو عارم عثمان کو بولنے پر مجبور کرے وہ ایک مہذب مہمان بن کر رہے گی اور یہی خود کو باور کروائی وہ عارم کے ساتھ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے سامنے موجود تھی، دنیا میں اک بڑی تاریخ رقم کرنے والی جگہ۔

روشنی نے آہنی جالیوں کے اندر سوئے، ایک وسیع اور ویران میدان کو دیکھا جہاں کہیں کہیں گھاس اگ رہی تھی۔

"9/11 کے بعد یہاں نیویارک کے لوگ کم ہی آتے ہیں، وہ جتنا ماتم کر سکتے تھے کر چکے ہیں اب زیادہ تر یہاں صرف غیر ملکی ٹورسٹ آتے ہیں۔" پچھلی باتوں کو نظر انداز کرتا وہ اسے اس جگہ کے بارے میں بتانے لگا۔

"ہاں، اس ایک کھنڈر کے بدلے میں ہزاروں بستیوں کو کھنڈر کر کے وہ کسی حد تک مطمئن جو ہو چکے ہیں۔" اس نے خود کلامی کی مگر وہ یہ کہہ نہ پائی۔

وہ آہنی جنگلے کے ساتھ آویزاں بورڈ پڑھنے لگی جن پر گیارہ ستمبر کے ہر لمحے کی تفصیل با تصویر اور لمحہ بہ لمحہ درج تھا، اس کی نگاہ اس سے اگلے بورڈ پر گئی جس پر ان لوگوں کے نام درج تھے جو ٹریڈ سینٹر میں جل کر راکھ ہوئے، روشنی کی نگاہ ان تین ناموں پر رک گئی جو یا تو اس کے ہم وطن تھے یا ہم مذہب۔

"آپ یہاں رکنا چاہیں گی؟" اسے تفصیل سے بورڈ پڑھتے دیکھ کر وہ پوچھ رہا تھا۔

"نہیں چلتے ہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلا کر عارم کی جانب دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا، وہ زرد چہرہ جو ضبط کرب سے زرد ہو چکا تھا بے اختیار اک بے چینی سی اس کے اندر اترنے لگی، یہ ترقی یافتہ ملک کا خوبصورت تجارتی شہر کی وہ پر رونق جگہ جیسے انہوں نے اپنی زندگی کا مشن بنا کر تاریخ کے بڑے بڑے فیصلے کیے، ہزاروں بستیوں کو ایسا ہی راکھ کا ڈھیر بنا کر کامیابی کے میڈل سینوں پر سجائے فخر سے مزید ترقی کی منزلیں پا رہے ہیں، وہ ایک بار پھر اس ماحول، جگہ سے کٹ کر اپنی سوچوں میں الجھ چکی تھی۔

"زندہ قومیں، اگر یہ زندہ قومیں ہیں تو ہم کون ہیں؟"

ان گنت، بے گناہ معصوم لاشوں کا بوجھ لئے، جینے والے ہم کس مہذب معاشرے مہذب مذہب اور قوم کے افراد ہیں، کیا زندہ قومیں اتنی ہی بے حس ہوتی ہیں؟ زندہ قومیں تو ایسی ہوتی ہیں جن کے یہاں کوئی سو لوگ مر جاتے ہیں تو وہ باقی دنیا کا نقشہ بدل دیتے ہیں۔

اور ہم جیسی قوم جو روز کئی بے گناہ لاشوں کے بدلے صرف مذمت بھرے الفاظ بول کر پر سکون ہو جاتے ہیں۔

میں کیوں اس مہذب معاشرے کا موزانہ اپنے بے ضمیر معاشرے سے کر رہی ہوں۔

"کیا ہم گھر واپس جا سکتے ہیں؟" اک جہاں کا درد بھرے وہ بولی تو، عارم کئی ثانیے اس کے چہرے سے اس کی دبی کیفیت کا اندازہ لگاتا رہا پھر آہستگی سے اثبات میں سر ہلا کر واپسی کے لئے مڑ گیا۔

☆☆☆

دروازہ کھول کر عارم نے اسے اندر داخل ہونے کو کہا پھر پوچھنے لگا۔

"آپ کچھ کھانا چاہیں گی؟"

"نہیں، میں صرف سونا چاہتی ہوں۔"

اسے مزید سنے کہے وہ کمرے میں چلی آئی، بیڈ پر خود کو گرا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"میرا بھائی، کیوں؟ آخر کیوں؟" وہ کس سے گلہ کرتی، کس سے شکوہ، اپنے آپ کو لاکھ

سنبھالتے سنبھالتے بھی وہ اجنبی لوگوں پر آشکار ہونے لگی تھی۔

وہ اپنی سوچ کو خود ہی احتسابی کٹہرے میں کھڑا کیے خود ہی سوال خود ہی جواب دینے لگی۔

اور وہ کر بھی کیا سکتی تھی، وہ بھی وہی عام سی سوچ رکھنے والی شہری تھی جو اپنی غلطیوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرتے ہیں، اپنی اصلاح کی بجائے دوسروں کی اصلاح کے خواہش مند۔

ایک علیحدہ وطن قومی زبان، لباس اور اپنی شناخت کے خوبصورت الفاظ کی قلعی اب نظر سے اتر چکی ہے اور اصل حقائق منہ چڑاتے محسوس ہونے لگے ہیں کہ الگ وطن مگر کس کا پنجابیوں کا، سندھیوں کا، بلوچوں یا پھر پختونوں کا، وہ رو دھو چکی تو کاغذ قلم لے کر اپنے اندر ابھرتے طوفان کو لفظوں میں لپٹتی کاغذ پر ثبت کرنے لگی اور کمرے سے باہر عارم عثمان کہہ رہا تھا۔

"گرینی یہ کون سا قومی لباس، کون سی شناخت، اپنی تہذیب و ثقافت؟ لباس تہذیب و ثقافت سے لے کر کلچر تک یہ ہندوستان کے مرہون منت ہیں تو مذہب کے معاملے میں سعودی عرب کے ہمیشہ زیر اثر اور گرینی مزے کی بات کہ قومی زبان اردو ہوتے ہوئے بھی فارسی میں قومی ترانہ۔"

کیا وہ درست نہیں کہہ رہا ہمارا اپنا کیا ہے؟ اپنی پہچان تو آج بھی کچھ نہیں ادھر ادھر سے پکڑ کر اپنا لیبل لگا دیا، جعلی شناخت، پینسٹھ سالہ آزادی جو بے جا جانوں کی خون کی ندیاں بہا کر حاصل کی گئی، وہ تو کبھی ہم تک پہنچی ہی نہیں ہم اک منافق ہجوم کا نام جو نقلی آزادی کے نام کے ایک بھیانک قفس میں قید چاروں اطراف سے مظالم کی لڑیوں میں جکڑے ہوئے اپنے تمام تر انسانی حقوق سے محروم جنگلی جانوروں سے بدتر زندگیاں گزارتے آزاد خود مختار قوم، عارم عثمان تو یہ بھی کہہ رہا تھا۔

"پینسٹھ سال بعد بھی آپ پاکستانیوں کو ان کے مذہبی و انسانی حقوق سے محرومی کیوں؟" وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں دریافت کر رہا تھا۔

روشنی نے ہاتھ میں پکڑے قلم کی نوک کو سامنے رکھے سفید کاغذ کے قریب کیا، اک جھنجھلاہٹ، بے چینی، تلخ سچائی اور حقیقت پر مبنی آواز۔

"گزشتہ 66 برسوں سے آزادی تو آج بھی آپ کے لئے ایک سراب کی مانند ہے، اسلامی جمہوریہ پاکستان جس میں جمہوریت نام کی کوئی چیز نہیں، اسلام کی تعلیمات سے دور دور کا واسطہ نہیں اور اخلاقی غلاظت کے اس ڈھیر کو آزادی کا دھوکہ سمجھے اپنی ہی گمنام موت کا سودا کر چکے ہو۔"

"ہندوؤں کے ہاتھوں شہید تھے اور اب مرنے والے شہید تو مارنے والے مجاہد ہیں، اسے خود مختاری، آزادی، فخر کہتے ہیں۔"

وہ جا چکا تھا اسے جو کہنا تھا وہ کہہ چکا اب صرف روشنی تھی اس کے سامنے اس کے کاغذات پر ادھوری تحریر، دل میں درد، آنکھوں میں نمی اور سوچ، تلخ سچائی، ہاتھوں میں پکڑے قلم میں جنبش ہوئی اور وہ اپنی منتشر ہوتی سوچوں کو حقیقت سے روشناس کرنے لگی۔

اگر قفس کا نام بدل لینے کا ہی نام آزادی ہے تو پھر میرے ہم وطنو آپ کو یہ آزادی مبارک، اگر ہندوؤں کی غلامی سے انگریزوں کی دربانی میں چلے آنے کا نام ہی آزادی ہے تو پھر یہ آزادی ہم سب کو مبارک ہو، بم دھماکوں سے گرتی روزانہ کی سینکڑوں لاشوں، کراچی میں ہوتی روزانہ کی بے نام اموات، صاف پانی کی

قلت، نقلی ادویات، مذہبی ولسانی منافرت کا شکار ہوتی ہزاروں جانوں کو ایک بدنصیب پاکستانی کی زندگی مبارک۔

بجلی، پانی اور خوراک کے بحران میں جینے والوں، ایک خود دار قوم کا ٹائٹل مبارک، آئیں منائے جشن اپنی بدنصیبی پر، اپنی بے بسی پر کہ ہم خودمختار آزاد قوم، باکردار، باوفا شہری، ان کے مفہوم سے بھی واقف نہیں کجا یہ کہ ہم تو یہ تک نہیں جانتے کہ یہ آزادی اور اس کی اصل وقت کیا ہے؟

آہ، آزادی کب سے ادھوری پڑی تحریر مکمل ہونے لگی تھی اس کا قلم یہ کیا لکھنے لگا تھا، یہ کاغذات کن حقیقتوں سے بھرنے لگے تھے، یہ اس کی سوچوں کا دھارا کس جانب رخ ہوا کر چکا تھا۔

☆☆☆

''نویرا! میں اک مسلسل اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہوں، میں اس معاشرے کی فرد ہوں جہاں موت دنیا کی تمام تر چیزوں سے سستی اور بے وقت ہے۔''

''میں اپنے بھائی کے قاتلوں کا گریبان پکڑ کر ان کا قصور پوچھنا چاہتی ہوں، میرا ضبط یہاں آ کر مزید ٹوٹ رہا ہے، میں وہاں واپس جانے سے خوف زدہ ہوں، نویرا جانتی ہو میرے ہم وطنوں، حکمرانوں کے لئے میرے بھائی کی موت کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو، اک معمولی سی بات ہو، مگر میرے جینے کا واحد سہارا مجھ سے چھین لیا گیا، مجھے نہ زندوں میں چھوڑا نہ مردوں میں۔'' وہ ایک بار پھر تڑپ تڑپ کر رو دی، اک بے بسی سے لب کاٹتے ہوئے نویرا نے اس کے ہاتھ تھام لئے۔

''تمہاری تکلیف، تمہارے درد کو میں محسوس کر سکتی ہوں۔'' ایسے کئی الفاظ جو نویرا حرف تسلی کے لئے اسے کہہ رہی تھی، کوریڈور سے گزرتے عارم کے قدم سست روی سے بڑھنے لگے۔

''تمہارا کرب، تمہارا درد تا عمر تمہیں یونہی رلائے گا جب جب تم اپنے بھائی کو یاد کرو گی تمہیں اپنی بے بسی پر رونا آئے گا۔'' نگاہوں کے پار وہ اس کے سراپے سے کہہ رہا تھا۔

''روشانے حسن تم یقین کرو یا نہ کرو، اس پوری دنیا میں تمہارے سوا ایک دل اور بھی تمہارے درد پر بے چین رہے گا، جب جب تم روؤں گی وہ اسی کرب سے گزرے گا۔'' اس کے چہرے پر بکھرے درد میں ڈوبے قطروں کو صاف کرتی نویرا خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور عارم عثمان نے ان دونوں کو رونے دیا تھا، شاید یہ آنسو ان کا غم کم کر سکیں۔

☆☆☆

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ، امریکی دنیا کا دار السلطنت نیویارک تھا تو نیویارک کا دار السلطنت ایمپائر بلڈنگ، وہ اور نویرا بلڈنگ کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوئیں تو نویرا اس سے کہنے لگی۔

''عارم اور آئرہ ہمیں یہی ملیں گے کچھ دیر ان کا انتظار کرنا ہوگا۔'' نویرا کے آنے کے بعد اس کی ملاقات عارم سے نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی، وہ جتنا اچھا گائیڈ تھا روشانے اتنی ہی بری سیاح، آخری ملاقات پر اپنی امریکہ کے لئے نفرت وہ اس پر دوبارہ شو نہیں کرنا چاہتی تھی سو اس کی آمد کی خبر اسے ذرا بھی اچھی نہ لگی، اک عجیب بے چینی سی سرائیت ہوتی جا رہی تھی، خود کو پرسکون کرنے کے لئے وہ اردگرد پھیلی خوبصورتی اور نفاست دیکھنے لگی، عین سامنے بلند چھت سنگ سرخ سے آراستہ ایک راستہ تھا، اک لابی جس

کے سامنے ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کی ایک شبیہہ تھی، اس کی آخری منزل کے گرد ایک ہالہ جو روشنی کی زد میں ایک مسیحا نما سا معلوم ہوتا۔

''ویری سوری، ہم لیٹ ہو گئے۔'' وہ خیالوں میں گم تھی جب اپنے پیچھے ابھرتی آواز نے اس کی توجہ کھینچی، بے ساختہ گردن گھما کر اس نے دیکھا، آئرہ کے برابر وہ اپنی تمام تر وجاہت اور زندہ دلی کے ساتھ کھڑا تھا، اس نے بے اختیار نگاہ ہٹا لی، وہ تینوں آپس میں محو گفتگو تھے پھر وہ دھیرے دھیرے اس شاندار شبیہہ کی جانب بڑھنے لگے، مختلف راہداریوں سے گزرتے، سیاحوں کے جھمیلے میں سے وہ دوسری منزل پر آ پہنچے، عارم نے رک کر ٹکٹ خریدے، قطار میں لگے وہ لفٹ تک آ ٹھہرے۔

''اس کی شہرت سے تو آپ یقیناً واقف ہوں گی۔'' اس کے مقابل ایک بار پھر اپنے گائیڈ والے فرائض سنبھالے وہ اس کے سر پر سوار تھا، روشنی نے ہلکے سے سر گھما کر عارم کی جانب دیکھا، اس کا طرز انداز اسے مذاق اڑاتا محسوس ہوا تھا جبکہ آنکھوں میں ایسا کوئی تاثر دکھائی نہ دیا، بے ساختہ ہونٹ بھینچے اس نے نفی میں سر ہلا دیا، ذرا آگے نویرا اور آئرہ ایک دوسرے سے باتیں کرتیں چلتی جا رہی تھیں۔

بلڈنگ کی 86 منزل پر پہنچ کر وہ لفٹ سے باہر آئے، سامنے ہی ایک ریسٹوران اور کھانے پینے کے سٹالز دکھائی دیئے، وہ ان سے گزرتے کھلی فضا میں تیز ہوا کے شور میں آ گئے، آس پاس کچھ نہیں تھا، کوئی عمارت نہیں سب کچھ نیچے بہت نیچے رہ گیا یہاں تک کے پرندے بھی۔

''یہ عمارت صرف ایک سال اور 45 دنوں میں تعمیر ہوئی تھی۔'' وہ اپنے ملک کے شاندار تاریخی کارنامے دہرانے لگا۔

اس نے نیچے دیکھنا چاہا، پورا نیویارک قدموں کا بسیرا سا لگا، شہر کا شور یہاں آتے آتے دم توڑ چکا تھا صرف سناٹا سا تھا ویسا، بالکل ویسا جیسا اس کے اندر تھا، تیز ہوا اور حیرت کا یہ شکار اسے اپنی گرفت میں لپیٹنے لگا، آہنی جنگلے میں سے نیچے جھانکتے ہوئے اس کی نظر نیویارک شہر کو دیکھنے لگی جو کسی کھلونے ماڈل سے کم محسوس نہ ہوا۔

سر گھومتے، دیکھنے کی حد تک بلندی پر خود کو پا کر وہ چکرائی جبھی اک نرم ہاتھ نے بڑی نرمی سے ان کا بازو تھامتے ہوئے پیچھے گھسیٹ لیا۔

''زیادہ نیچے دیکھنے سے اجتناب برتیئے۔'' بڑے سادہ انداز میں بولتا وہ دھیرے سے مسکرایا، اس کا بازو اب تک عارم کے ہاتھ کی گرفت میں تھا، وہ اب سامنے آسمان کو دیکھ رہا تھا، اس نے ہلکے سے سر گھما کر نویرا کو دیکھنا چاہا تو نگاہ شعلے ابھرتی نگاہوں سے ٹکرائیں، نجانے آئرہ کیا سمجھ رہی ہو گی، اس نے ہلکے سے اپنا بازو ان مضبوط ہاتھوں کی گرفت سے نکالنا چاہا جبکہ دوسری جانب بھی بنا کسی مزاحمت کے چھوڑ دیا گیا، پھر وہ آخری منزل تک آئے، اب آئرہ عارم کا ہاتھ تھامے اس کے اور نویرا کے آگے چل رہی تھی، اس نے عارم کو روشنی کی جانب متوجہ نہ ہونے دیا، اک ضدی بچے کی طرح اسے تھامے وہ چلے جا رہی تھی، وہ نویرا کے ہمراہ چلتے انسانی شاہکار کی خوبصورتی دیکھتی رہی یہاں تک کے دھوپ کی کچھ مژدہ غروب کی منتظر کرنیں رہ گئی اور یک دم شام اتر آئی، سو یہاں سے لوگوں کی واپسی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔

واپسی کا سفر بڑا عجیب سا تھا، وہ چاروں ایک انڈین فوڈ کورٹ میں آ بیٹھے، عارم آرڈر کے لئے کاؤنٹر کی جانب بڑھا تو آئرہ روشنی سے

پوچھنے لگی۔
''آپ کی واپسی کب ہے؟'' بظاہر اس کا لہجہ اس لمحے نارمل تھا، جبکہ حساسیت میں لپٹی روشنی کو عجیب ضرور محسوس ہوا۔
''یہ ابھی کچھ دن اور رکے گی۔'' اس کی جگہ جواب نویرا نے دیا۔
''کیسا لگا آپ کو ہمارا ملک؟'' اب کی بار انداز ذرا مغرورانہ اور نخوت بھرا ضرور تھا، روشنی نے آئرہ کی جانب دیکھا تبھی عارم چلا آیا۔
''اب تو آپ کو یقین آ گیا ہوگا ہم ایک بڑی اور عظیم قوم ہیں، ہمیں دنیا کی راجدھانی کہا جاتا ہے، ہم آپ سے ترقی میں بے حد آگے ہیں، یہ اتنا بڑا وسیع رقبے پر پھیلا ملک، آپ جیسے کئی چھوٹے چھوٹے لوگ اس میں سما جاتے ہیں۔'' عارم نے لب کاٹی روشنی کے چہرے کو دیکھا جہاں تاریکی سمیت کیا کچھ نہیں تھا۔
''دنیا میں ایک ہی سپر پاور ہے اور وہ ہم ہیں کوئی دوسرا ملک ہماری برابری نہیں کر سکتا یہاں تک کہ بکاؤ قومیں تو بالکل ہی نہیں۔'' اب کی بار اس کا لب و لہجہ ترش نہ تھا، مسکراہٹ بھرا انداز، مغرور جملوں پر مبنی اسے ایک جھٹکے سے زمین پر پھینک گیا۔
''یہ سپر پاور کا لیبل بھی تو آپ نے خود کو خود ہی دیا ہے۔'' وہ بولنا نہیں چاہتی تھی مگر کیا کرتی اپنے ملک کے خود غرض اقتدار اعلیٰ کی طرح نہ تھی۔
''اور بکاؤ قوم کا لیبل بھی تو آپ نے خود اپنے پر لگوایا ہے۔'' ہاتھ میں تھمے چھری کانٹوں سے کھیلتی بولی تو نویرا کو مداخلت کرنی پڑی۔
''آئرہ! دنیا کی ہر قوم اپنے ہونے پر فخر کرتی ہے۔''
''کرتی ہے، فخر ہونا بھی چاہیے مگر ملکی مفاد کا سودا کرنے والے، سوری میں روڈ ہو رہی ہوں مگر آپ کا ملک دنیا کا واحد ملک ہے جو معمولی نوعیت کے ذاتی مسئلے بھی حل نہیں کر پاتا ہے جہاں ڈیموں کے مخالف اپنے لوگوں کو چھ مہینے صاف پانی کی کمی اور پیاس سے اور اگلے چھ ماہ ڈوب کر مرواتا ہے مگر ڈیم نہیں بناتے ایسی قوم غیرت اور عزت کی باتیں کرتی اچھی نہیں لگتیں۔''
اس کے اندر بڑی نفرت اور حقارت دکھائی دے رہی تھی، روشنی کے چہرے پر ندامت پھیلی تھی اور کیوں نہ پھیلتی وہ سب کچھ فراموش کر کے حقیقت سے آنکھیں بندھ کیے چلتی رہتی، اس کے چہرے پر شرمندگی کے احساس نے نویرا اور عارم کو موضوع تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا، وہ تینوں محو گفتگو تھے جبکہ وہ اب بھی اس کرب میں تھی، ان کے ساتھ ہو کر بھی وہ کراچی میں جلتے شعلوں میں آ کھڑی ہوئی، وہ معصوم بم دھماکوں سے مرنے والی لاشوں پر ماتم کرتی اس پر سکون، زندگی بخشنے والے ماحول سے دور تھی۔
واپسی کا سفر بڑی خاموشی سے کٹا، نویرا اور آئرہ کو ان کی منزل پر اتارنے کے بعد وہ دونوں تنہا رہ گئے تھے، بلڈنگ کی لفٹ تک سفر انتہائی سست روی سے پار کرتے عارم نے روشنی کے تاریکی میں ڈوبے سراپے کو دیکھا۔
''آئی ایم سوری، آئرہ کو اتنا روڈ نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' لفٹ کا بٹن پریس کرتا وہ آہستگی سے بولا تھا۔
''نہیں، میں ان کی باتوں کا برا کیوں مانوں گی۔'' الٹا وہ افسردگی سے قیاس کر رہی تھی، حالانکہ آئرہ کی باتیں اس کے اندر اک قیامت برپا کر چکی تھی، خود پر جبر کے سوا کوئی راہ نہ دکھائی دی تو خود کو سنبھالنا پڑا مگر یہ عارم۔
''روشانے، اگر آپ مجھے غلط نہ سمجھے تو ایک بات کروں؟'' وہ نرم لہجے میں پوچھ رہا تھا۔
''اتنی حساسیت آپ کے لئے نقصان دہ ہے، اپنے اردگرد پھیلے حالات کو اپنے جیسے تمام لوگوں کی طرح قبول کر لیجئے، خوشیاں جھولی میں گرتی نہیں انہیں ڈھونڈنا پڑتا ہے۔'' اس کا نرم لہجہ اتنا دل نشین تھا کہ بے ساختہ وہ بول اٹھی۔
''میرا سب کچھ چھین گیا میں اپنی خوشیوں کو آگ لگانے والوں سے احتجاج بھی نہ کروں۔''
''روشانے احتجاج آپ کا حق ہے، ضرور کیجئے لیکن اردگرد پھیلی حقیقتوں کو فراموش مت کیجئے، بلیم گیم کھیل کر نہیں خود کی بنیادوں کو طاقت ور بنا کر برابری کیجئے۔'' وہ اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ اپنے بھائی کے قاتلوں کو وہ غلط لوگوں کو قصور وار ٹھہرا رہی ہے۔
''جی بالکل آپ کی برتری کا میں کیا کہوں، وہ تو کل عالم میں ویت نام، اسرائیل، عراق، افغانستان اور وزیرستان میں نظر آتی رہتی ہے، اپنے کسی مارے جانے والے سپاہی کی لاش ٹیلی ویژن پر نہیں دکھاتے کہ یہ انسانی حقوق کا معاملہ ہے اور ڈرون حملوں سے مرنے والے بے گناہ معصوم لوگ، بچے سب دہشت گرد۔'' آئرہ کی اذیت ناک باتیں اس کے اندر ابلتے لاوے کو باہر نکال لائیں، روشنی کا لہجہ رکھائی لئے ہوئے تھا، رات کے اس پہر وہ دونوں لفٹ کے اندر کھڑے تھے۔
سیکنڈ فلور پر لفٹ رکی تو وہ دونوں دائیں بائیں بنے فلیٹس کے درمیان کوریڈور میں رک گئے۔
''یہ آپ اپنی کمزوریوں کو ہم پر کیوں تھوپ رہی ہیں۔'' وہ کہتا ہوا اس کے بالکل سامنے آ گیا۔
''اس حقیقت کو قبول کیجئے کہ آپ کے بھائی کو آپ کے اپنے شہریوں نے مارا ہے بالغرض اگر نہیں تو آپ کی ریاست کا کمزور گھٹیا نظام انہیں تحفظ نہیں دے سکا، آپ کا ملک اپنے شہریوں کی جان و مال کی حفاظت میں ناکام ہو چکا ہے، سرحدوں پر بیٹھے، شہیدوں کی موت کی آرزو کرنے والے دشمنوں سے بچانے والے اپنے ملک کے لوگوں کو اندرونی سازشوں اور طاقتوں سے نہیں بچا پا رہے۔'' الفاظ تھے کہ نشتر جو اس کے وجود کے آر پار ہوتے اسے ذلت و رسوائی کے گڑھے میں پھینک گئے، اک کرب سے اس نے آنکھیں میچ لیں، جبکہ عارم مسلسل بولے جا رہا تھا۔
''سرحدوں پر اتنی حفاظت کیوں؟ کیا صرف زمین کے ٹکڑے کو بچانا مقصود ہے ان زندگیوں کی کوئی اہمیت نہیں جنہیں بے دردی سے قتل کیا جا رہا ہے، دس لاکھ سے زائد فوجی طاقت رکھنے والا خود کو ایٹمی مزائل سے مالا مال سمجھنے والا وطن، اپنے ہی ملک کے شہریوں کو تحفظ نہیں دے پا رہا اور آپ جیسے جھوٹی خود داری تسلیوں اور خوابوں میں جی رہے ہیں۔''
روشنی نے ڈبڈبائی نظروں سے اسے دیکھا، اس کے دیکھتے ہی وہ اچانک چپ ہو گیا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جیسے اس کی بچی کچھی عزت پر ماتم کر رہے ہوں، عارم کی مسلسل خاموشی محسوس کر کے اس نے دوبارہ سامنے دیکھا، وہ اب بھی اسے دیکھ رہا تھا، عجیب سے احساس نے اس کی دل کی دھڑکن یک دم تیز کر دی، تو وہ نظریں جھکا کر بے ساختہ پیچھے کھسکنے لگی، جب ہی اسے فون بیل کی آواز سنائی دی تو عارم چونک اٹھا، عارم کا سیل فون بج رہا تھا، اس نے بٹن پریس کر کے ریسو کیا، وہ اب فون پر بات کر رہا تھا۔

''آپ جائیں۔'' اسے یونہی کھڑا دیکھ کر وہ فون پر بات کرتے کرتے ذرا دیر کو رکا پھر دوبارہ فون کی جانب متوجہ ہو گیا۔

اسے اس شخص کی پل پل بدلتی کیفیت پر حیرانگی ہوئی، وہ پلٹ کر فلیٹ کی جانب بڑھ گئی، ہینڈل گھماتے ہی دروازہ کھل گیا، روشنی نے سر گھوما کر دیکھا، وہ اب بھی فون پر بات کر رہا تھا، ان دونوں نے بے ساختہ ایک دوسرے کو دیکھا تھا، وہ نظریں چرا کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی کمرے میں آ کر وہ کتنی دیر تک عارم کی خود پر جمی نظریں یاد کر کے الجھتی رہی، جبکہ عارم ہونٹ دانتوں تلے دبائے اپنی بے خودی پر اک سرد سانس بھر کر رہ گیا۔

☆☆☆

خزاں صرف درختوں اور ان کے پتوں پر نہیں اترتی، دلوں میں بھی اترتی ہے اور بدن کو زردی سے بھر دیتی ہے۔

نوریا کی سنگت میں اس نے نیویارک کے بیشتر مقامات دیکھے، میٹروپالٹین کے میوزیم جو اپنے اندر گہری تاریخ رقم کیے تھے، نیویارک کا دل کہلانے والا راک فیلر بڑی اور بلند ترین عمارتوں کا مجموعہ سنہری مجسمے کے گرد آبشاریں گرتی رونقیں اور مسکراہٹیں سمیٹتے مقام، ہر وہ مقام جو دنیا میں اپنی شہرت رقم کرتا تھا، یہاں کے حسین اور خوش لباس لوگ، جو زندہ رہنے کا حق رکھتے تھے ان کے چہروں پر روشن زندگی کے دیئے دیکھیں شاید ان کی روشنی اس کے چہرے پر منعکس ہو کر اسے زندگی کے قریب لے جاتی اور وہ اپنا دکھ بھول جاتی، وہ اس ملک کا موزانہ اپنی سرزمین سے نہیں کر سکتی تھی، یہ وہ ملک تھا جہاں ایک معذور شخص کے اشاوے پر نیویارک کی ہر بس رک جاتی تھی چاہے شاپ ہو یا نہ ہو، وہ سڑک پار کرنا چاہتا تو ٹریفک تھم جاتی، سفر کی ہمت نہ پاتا تو ایک فون کالز پر خصوصی وین آ جاتی ہے جو قوم انسانیت کا تحفظ کرنے والی بھی اپنے ملک کے افراد کے لئے کیوں نہ ہو اور ہم کٹھور دل جو صرف اپنے لئے سوچ سکتے تھے سربراہ ملک سے لے کر ایک عام آدمی تک ہم صرف اپنے مفاد کے لئے کام کرتے ہیں، انسانیت سے دور تک کوئی واسطہ ناطہ نہ رکھنے والے شہری بے حس شہری، غفلت میں جیتی قومیں ایسے ہی مقدر کی حق دار ہوتی ہیں۔

☆☆☆

صبح وہ آفس جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا، اس کا انداز تھکا تھکا سا تھا، آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے آنکھوں کے سامنے اچانک لرزتی پلکیں اور بھیگا چہرہ لہرانے لگا۔

''روشانے!'' بے اختیار اس کے لبوں سے مدھم آواز میں نکلا تھا، دل نے جو دیکھا نظریں بھی اب وہ دیکھ سکتی تھیں، محسوس کر رہی تھیں، اس کے بے آواز آنسو سسکیوں میں بدلنے لگے۔

اس کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکان آئی تھی وہ آئینے میں اپنے مسکراتے ہوئے چہرے کو تعجب سے دیکھ رہا تھا، وہ کمرے سے نکل کر باہر آ گیا بنا ناشتے کے گھر سے نکلنے کا سوچا جب کچن کے پاس سے آتی آواز پر اس کے قدم رک گئے۔

''بریک فاسٹ۔'' گرینی اس سے پوچھ رہی تھیں۔

وہ کچن میں آ گیا، اس نے فریج سے دودھ نکالا اور اپنے لئے کافی بنانے لگا، گرینی اپنا بریک فاسٹ لئے لاؤنج کی جانب چل دیں تو وہ کافی بنا کر اسٹول گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

گویہ ایک بے اختیاری میں ہوا تھا مگر اس پل جب وہ خود کو یک دم ترو تازہ محسوس کرنے لگا،

پھر وہ اپنے اندر کی آوازوں، اس شور سے گھبرایا تھا۔

رات کے اس پہر یہ دل کیوں چاہا تھا کہ وہ اس کے آنسو صاف کرے اس سے کہے کہ میرے ہوتے ہوئے تم کیوں رو رہی ہو، میں تمہیں کبھی کوئی تکلیف، کوئی نقصان نہیں پہنچنے دوں گا۔

نیویارک کی گلیوں میں پھرتے پھرتے وہ نم آنسو والی لڑکی اس کی سوچوں میں آ کر ٹھہر گئی تھی، اپنے اندر ابھرتے اس شور نے اسے اتنا ڈرایا کہ کافی ختم کر کے وہ فلیٹ سے نکل آیا۔

☆☆☆

پھر کئی دن بیت گئے وہ عارم کا سامنا کرنے سے کترانے لگی، نوریا اور گرینی کے ساتھ ہی زیادہ وقت گزارنے لگی، عارم بھی گھر پر کم دکھائی دیتا۔

پورے چاند کی روشنی میں یہ روشنیوں کا شہر اور بھی خوبصورت لگتا تھا، آج کل وہ راتوں کو کچھ نہ کچھ لکھنے لگی تھی، لکھنے کا عمل اسے سکون بخشتا تو وہ خود کو بہتر محسوس کرتی۔

ابھی بھی لکھتے لکھتے تھکنے لگی تو شیشے نما کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی، سڑکوں پر بھاگتی زندگی تو دیکھ کر وہ کیا مزید لکھے سوچنے لگی۔

جبھی عارم کے کمرے سے ہلکے میوزک کی آواز ابھری، وہ بڑی مدھم سی آواز میں گٹار پر کوئی نغمہ گا رہا تھا، ذرا غور سے سننے پر رات کے اس پہر الفاظ واضح ہونے لگے۔

Ugly sounds are overhead
And the streets are
colourid red
Your live lost every day.
It,s always been that way
But we believe one day
we,ll see,
A world at peace, in
hasmony,
And that is why we say
No was will stop us singing
Our voice will stay strong,

وہ نوریا کے ساتھ فیری کی رائیڈ کے لئے پہنچی تو عارم سمیت سب انہی کے منتظر تھے، عارم، آئرہ اور نوریا کے کچھ قریبی ساتھی ان سے کافی خوشدلی سے ملے جبکہ آئرہ نے اسے اگنور کیا ہی عارم نے بھی قصداً اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کی آمد کا نوٹس لئے بنا وہ نوریا سے محو گفتگو تھا، جانے کیوں اسے تکلیف ہوئی تھی، آج سے کچھ عرصے پہلے وہ اسے یوں نظر انداز کرتا تو وہ پرواہ بھی نہ کرتی لیکن آج وہ بے چینی سے پہلو بدلتی اردگرد موجود خوبصورتی کو دیکھنے لگی۔

فیری کے سفر پر وہ سب گروپ کی شکل میں لطف اندوز ہو رہے تھے، جبکہ وہ نوریا کے ساتھ فیری کے آخری سرے پر کھڑی سمندر کی یخ سرکش ہوا کو محسوس کرتیں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیں۔

''میں نکاح کے بعد عادل کے ساتھ یہاں آئی تھی؟'' نوریا کی دھیمی آواز اسے اس سحر زدہ ماحول سے باہر لے آئی، گردن گھما کر اس نے نوریا کو دیکھا جس کی آنکھوں میں آج بھی اس کے بھائی کی جدائی کا درد پناہ تھا۔

''ہم عمر بھر ساتھ نہ رہتے مگر اتنی جلدی عادل چلا جائے گا ایسا تو میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔'' وہ دور سمندر کی ابھرتی لہروں پر نگاہیں جمائے کسی خیال میں گم بول رہی تھی، اس کا لہجہ

اس کے بھائی کے غم میں بھیگا تھا، عادل بھائی آج بھی نویرا کے لئے اہم تھے چاہے درد کی صورت میں ہی وہ اس کے بھائی، سات سمندر پار منوں مٹی تلے سوئے ہوئے کے لئے اداس اور دل گرفتہ تھیں۔

نویرا نے سر جھٹک کر خود کو ماضی کی یادوں سے آزاد کرواتے ہوئے روشنی کو مسکرا کر دیکھا۔

''یہ منظر، یہ گہرا سمندر، دکھوں کو کم کرنے یا یوں کہوں دکھوں کو چھپانے کی پناہ گاہ ہے۔'' جواباً وہ دھیرے سے مسکرا دی تبھی عارم نویرا کو پکارتا ان کے قریب چلا آیا۔

''نویرا کافی ٹائم۔''

''کافی پینے چلیں؟''

''آپ جائیں، میں کچھ دیر یہی بیٹھوں گی۔'' اس نے آہستگی سے چلنے سے انکار کیا، وہ کچھ دیر اور یونہی کھڑے رہ کر اپنے دکھ ان لہروں کو نظر کرنا چاہتی تھی، سمندر کی وسعت کا صحیح اندازہ اسے یہاں آ کر ہوا تھا، نویرا جا چکی تھی اور وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ چلا گیا تھا یا وہیں کھڑا اس کی نگرانی کر رہا تھا، وہ ساکت کھڑی سمندر میں شور مچاتے پانی کو دیکھتی رہی، جبکہ عارم اسے چپ چاپ کتنی دیر دیکھتا رہا، پھر بالآخر چند قدم گھسیٹ کر اس کے نزدیک آیا اور اس کے بالکل مقابل کھڑا ہو گیا۔

''یہ سمندر بھی بہت خونی ہے جانے اپنے اندر کتنے بے گناہوں کو چھپائے بیٹھا ہے، اسی لئے اپنے دکھوں اور آنسوؤں کو اس سفاک کے سپرد کرنا بھی زیادتی ہوگی۔''

''کس کس زیادتی کا حساب لے۔'' وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔

''آہ۔'' جواباً وہ اک لمبا سانس ہی بھر سکا۔

''آپ بہت اچھا گنگناتے ہیں No was will stop us singing۔'' اس نے اک لائن دہرائی۔

''روشانے میری بات غور سے سنیں۔'' وہ اسے مزید بولنے سے ٹوک گیا اور قدرے اکھڑے انداز میں کہنے لگا۔

''Suffer صرف آپ اکیلی نہیں لاکھوں اور بھی ہیں، آنسو بہانے اور غم زدہ رہنے سے تو حالات نہیں بدل سکتے، دوسروں کے درد کو اپنا سمجھ کر جییں گی تو زندگی کا مقصد بھی مل جائے گا اور اپنا غم بھی کم ہو جائے گا، میں آپ کے سکون کے لئے ہمیشہ دعا گو رہوں گا۔'' وہ اسے دیکھے، سنے بنا مڑ کر اندر چلا گیا اور وہ وہی سمندر کے درمیان تن تنہا کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

وہ اٹھ کر باہر آئی تو گرینی کو بریک فاسٹ بناتے پایا۔

''لائیں گرینی آج بریک فاسٹ میں آپ کے لئے بناتی ہوں۔'' وہ کاؤنٹر کراس کر کے اون کے قریب کھڑی گرینی کے پاس چلی آئی۔

''بریک فاسٹ تو میں بنا لوں گی ہاں تمہاری ہیلپ ضرور لوں گی۔'' بڑی محبت سے بولیں تو وہ مسکرا دی۔

گرینی کے ساتھ وہ بریک فاسٹ تیار کرنے لگی، ابھی رکھ ہی رہی تھی جب گڈ مارننگ کا الاپ ناپتا وہ چلا آیا، روشنی نے اسے دیکھنے کی ذرا کوشش نہ کی۔

''جوائن کرو ہمیں۔'' گرینی نے اسے ناشتے میں شامل ہونے کی آفر کی تو ''شیور'' کہتا وہ اسٹول گھسیٹ کر عین اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

''آج ناشتہ روشانے نے بنایا ہے۔'' چائے کپ میں انڈیلتے وہ ذرا کا ذرا رکا پھر زیر لب مسکرا دیا۔

''گڈ ناؤ شی از نو مور گیسٹ۔'' روشانے نے اک سرسری نگاہ ڈالی اور ناشتہ کرنے لگی۔

''تم بہت اچھی بچی ہو، خدا تمہیں خوش رکھے، یونہی مسکراتی آباد رہو، اتنی جلدی جانے کا فیصلہ کر لیا کچھ دن اور رکتی۔'' گرینی نے ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ اس کی واپسی کی اطلاع دی تو عارم چونک اٹھا۔

پچھلے ایک ماہ سے وہ اسے لئے اپنا شیڈول متاثر کرتا گھما رہا تھا اور وہ اسے اپنے جانے کی خبر بھی نہیں کر سکی، غصہ تو بہت آیا مگر خود کو کنٹرول کرتا وہ لاپرواہ بنا بیٹھا رہا۔

''مجھے یہاں آتے ایک ماہ سے زیادہ ہو چکا ہے اور میری چھٹیاں بھی ختم ہونے والی ہیں۔''

''یونہی لکھتی رہنا جب تک یہ قلم اپنی طاقت دکھاتا رہے گا امید کا دیا ضرور روشن رہے گا۔''

''گرینی، قلم کی طاقت میں ملاوٹ کا عنصر زیادہ ہے، سب بکاؤ مال ہیں کئی ماسک زدہ چہرے، جانے کس کا کیا اصل ہو۔'' وہ بڑے سخت لہجے میں بولا اور یہ سختی اور کھردرا پن اس کے چہرے پر بھی آ گیا تھا۔

روشنی کا چہرہ تپ گیا مگر خاموشی میں ہی عافیت جانی لیکن سامنے والا اس کے تاثرات بخوبی سمجھ گیا تھا۔

''آپ برا مت مانئے، میرا اشارہ آپ کی جانب نہیں، گرینی کو اصل حقیقت سے آگاہ کر رہا ہوں۔'' تب فوراً ہی اپنی ٹون نارمل کر کے اپنے سخت جملے کا اثر زائل کرنے کے لئے بولا، وہ مزید بحث اب نہیں چاہتی تھی، یونہی ہنوز خاموش رہی، تبھی گرینی بجتا فون سننے اٹھیں تو وہ دونوں رہ گئے، وہ بھی اس کو دیکھے بغیر اٹھ گیا تو وہ بغیر سوچے سمجھے اس کے پیچھے چلی آئی، قدموں کی آواز پر وہ پیچھے مڑا اسے دیکھ کر وہ ایک پل کے لئے حیران ہوا تھا۔

''میں آپ سے اپنے رویئے کی معافی مانگنا چاہتی ہوں جو میں نے کہا وہ صحیح ہو یا نہ ہو مگر میں کسی کا دل دکھا کر اس گلٹ کے ساتھ واپس نہیں جانا چاہتی۔''

''معذرت تو مجھے آپ سے کرنی چاہیے، پچھلی کچھ ملاقاتوں میں، میں شاید اوور ری ایکٹ کر گیا تھا، مجھے کوئی حق نہیں تھا، میں آپ کو وہ سب کہتا، آپ اپنی سوچ اپنے تجربے کے حساب سے رکھتی ہیں، جہاں تک معافی کی بات ہے تو اس کی ضرورت نہیں، میں نے آپ کو غلط سمجھا ہی نہیں جو آپ نے کہا اور میں نے کہا وہ ایک لاحاصل بحث ہے کبھی نہ بدلنے والے حالات وہی بحث جیسے ٹی وی ٹاک شوز میں ہوتی ہے، ٹاک شو ختم، سب ختم بھول جائیں۔'' وہ کہہ کر چلا گیا لیکن وہ ساکت کھڑی رہ گئی تھی، اس کے لفظوں کے ساتھ اس کا لہجہ بھی کتنا بے گانہ تھا، اس نے دروازے کو دیکھا جہاں سے ابھی ابھی وہ گیا تھا آہستہ آہستہ سامنے کا منظر دھندلاتا گیا، اگلے پل وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

وہ قریبی دوستوں کے لئے تحائف خریدنے نویرا کے ساتھ مال آئی تھی، نویرا ہی چیزیں پسند کر کے اس کے سامنے رکھتی گئی اور وہ خاموشی سے اٹھاتی جاتی۔

''تم کچھ پریشان ہو۔'' شاپنگ ختم ہونے کے بعد نویرا اسے ایک پزا اسپاٹ پر لے آئی، اس کی غائب دماغی کو وہ مسلسل نوٹ کیے تھی سو اس کا اظہار بالآخر کر ڈالا۔

''نہیں، میں پریشان نہیں ہوں۔''

''روشانے، کوئی دکھ ہے تو شیئر کرو۔'' وہ

اسکرین سفید کرتی اور وائپر کے مسلسل حرکت کرتے ہاتھ اسے سمیٹ کر پرے کرتے جاتے اور راستہ دکھائی دینے لگتا۔

جہاں سڑک وسیع ہوتی وہاں تیز ہوا کا شور کار کی بند کھڑکیوں میں سے اندر آنے لگتا، خاموشی سے گرتی برف ہوا کے زور سے بے بس ہوگئی اور اسی لمحے برابر کے قدیم جنگلوں کے جتنے خزاں رسیدہ پتے وہ اپنی ڈالیوں سے جدا ہوئے اور ان کی زردی برف کی سفیدی پر حاوی ہوگئی، راستہ دیکھنا مشکل ہو گیا برف کو تو کار کے وائپر سمیٹ سکتے تھے لیکن یہ زرد پتوں کا جھرمٹ ان کی پہنچ سے باہر تھا، عارم نے سائیڈ پر کار روک کے ونڈ اسکرین صاف کرنا شروع کی، وہ اتر کر اس کے ساتھ پتے سمیٹنے لگی۔

''آپ اندر بیٹھیں ہوا کافی تیز ہے۔''

''تو کیا ہوا اڑ تو نہیں جاؤں گی۔'' جواباً وہ جل کر بولی تو وہ بے اختیار مسکرا دیا، سمٹے پتوں کو ہوا میں اچھالتا اس کا بازو تھام کر رخ اپنی جانب کرتا بونٹ پر بیٹھ گیا، اس کی اس حرکت پر وہ دنگ رہ گئی، وہ اب بھی مسکرا رہا تھا، بڑی پرشوخ نرم دل میں اترتی نگاہیں اس کے اندر اتھل پتھل مچانے لگی، اس کے ہاتھوں میں تھمے زرد پتے لے کر اس نے وہ بھی ہوا میں اچھال دیئے۔

''میں ہرگز آپ کو اڑنے نہیں دوں گا۔'' بڑی مدھم مگر گہری آواز میں وہ گویا ہوا، لرزتی آنکھیں اپنے سامنے روشن چہرے پر ٹھہر گئیں۔

برفباری کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا، وہ عارم کی آنکھوں میں ابھرتے تاثرات کو سمجھنے نا سمجھنے کے مرحلے سے گزرتی ہلکے سے پیچھے ہٹی، وہ بارش میں نہیں برف میں پھواروں میں بھیگ رہے تھے، ہوا کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

رات کے اس پہر چاروں اور خاموشی میں ہوا کے شور کے ساتھ اسے اپنے دل کا شور محسوس ہوا اور یہ بڑھتی آواز اس تک پہنچتی وہ پلٹ کر گاڑی کی جانب بڑھ گئی، اس نے عارم کو خود ساختہ دیکھنے سے خود کو روکا، وہ ونڈ اسکرین کلیئر کر چکا تھا وہاں اب یوں تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، چند سیکنڈ بعد وہ کار میں آ بیٹھا اور باہر بڑھتی سردی محسوس کرتے ہوئے اس نے ہیٹر آن کر دیا، پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے وہ سامنے دیکھنے لگا، جانے کیوں روشنی کو محسوس ہوا جیسے وہ اپنی اس حرکت پر مضطرب ہو، اس نے خود کو کھڑکی سے باہر دیکھنے میں متوجہ کر لیا، ایئر پورٹ کی حدود میں داخل ہونے تک گاڑی میں صرف خاموشی چھائی رہی پھر لاؤنج میں پہنچ کر وہ اپنا بیگ تھامتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

''مجھے برداشت کرنے کا شکریہ۔'' اک دھیمی مسکراہٹ عارم کے لبوں پر ٹھہر گئی، وہ پلٹی۔

''روشانے پھر کب آئیں گی؟'' لاؤنج کی جانب بڑھتے قدم عارم کی آواز نے روک دیئے، دھیرے سے گردن گھما کر اس نے دیکھا وہ اسی کی جانب بڑھ رہا تھا۔

''کبھی نہیں۔'' وہ اس کے قریب آ کر رکا تو نفی میں سر ہلاتی وہ گویا ہوئی۔

''کیوں؟'' اس کے چہرے پر نگاہیں ٹکائے اس نے قیاس کیا۔

''آپ وہاں آنا نہیں چاہتے تو پھر میں کیوں آؤں۔'' وہ جانتا تھا وہ اسے قدرے جتانے والے انداز میں بول رہی ہے۔

''کب لینے آؤں؟'' وہ بولتا اسے حیران کر گیا، چند ثانیے وہ اس کے پوچھے گئے سوال کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی جب خود ہی مزید گویا ہوا۔

''کیا آپ اس سو کالڈ امریکن سے انگوٹھی

پہنے گی۔''

''کیا آپ اس ٹیپکل پاکستانی لڑکی کے ساتھ رہ سکیں گے؟'' پل بھر کو وہ گڑبڑایا پھر چہرے پر بغیر شرمندگی کا کوئی تاثر لائے اسی سنجیدگی سے بولا۔

''مجھے یقین ہے اک دن تمہارا یقین جیت جائے گا اور یہ لہو کا کھیل ختم ہو جائے گا، وہاں زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ مسکرائے گی تم اس قوم کی بیٹی ہو جس کی ایک عظیم ماں نے محمد علی جناح جیسے باکردار شخص کو پیدا کر کے دنیا کے نقشے پر تمہارے دیس کا نام رقم کر دیا۔'' ہلکی نم آنکھیں تشکر سے مسکرا دی۔

''مے آئی۔'' اس نے روشنی کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر انگوٹھی پہنانے کے لئے اس کا ہاتھ تھامنے کی اجازت چاہی اور نرمی سے ہاتھ تھام لیا۔

☆☆☆

جہاز سمندری حدود میں داخل ہوا تو کھڑکی سے نیچے دور نیلے پانی کو دیکھتی وہ سوچنے لگی۔

''میرے بے گناہ بھائی، خدا کسی سے اس کا واحد سہارا نہ چھینے اے ظالم قاتلوں، جن کی خاطر ہم نے اپنا قبلہ بدلا، اپنوں سے بیگانہ بن گئے لہو اور آگ کا کھیل کھیلا، اپنے اقتدار و اختیار کی خاطر لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کو زندہ درگور کیا، جب وقت کی گرفت میں آؤ گے تو کیا پاؤ گے، زندگی جس کے ایک پل کا یقین نہیں، اس کے بعد جس عدالت میں روبرو ہو گئے وہاں ہر وہ شخص انصاف کا طلب گار ہو گا اور اس عدالت کی سزا سے کیسے بچو گے، میں مانگوں کی اپنے بھائی کا انصاف تب تمہیں کوئی بچا نہ سکے گا، تم سب اسی لہو میں ڈوبو گے، اے مولا! مجھے ہمت دے کے میرے لفظ یونہی سچائی پر مبنی رہیں اور میرا ضمیر زندہ آمین۔'' دعا مانگ کر روشانے نے آنکھیں موند لیں بہت سے خوش آئند خواب پلکوں پر دستک دینے کے لئے بیتاب تھے۔

☆☆☆

وفا شرط الفت ہے

فرح بخاری

ناولٹ

آسمان گہرے سرمئی اور کالے بادلوں سے کچھ یوں گھرا تھا کہ پانی بس ان سے چھلک پڑنے کو تیار کھڑا تھا، یوں تو ایسے مواقع ارما ہرگز نہیں گنوایا کرتی تھی، بارش کی ایک ایک بوند سے لطف اٹھانے کا تو مزا ہی الگ تھا لیکن فی الوقت جذبات پر قابو پانا بھی بہت ضروری تھا، آخر کو وہ اپنی نانی کی فرمانبردار نواسی تھی اور نانی کی خدمت ہر مزے پر مقدم تھی۔

فہد اسے تھوڑی دیر پہلے نانو کے ہاں چھوڑ گیا تھا، یہاں آنے پر پتہ چلا کہ ان کی دوائیں ختم ہو گئیں ہیں، اب آگے اتنی لمبی رات آ رہی تھی، ابھی چند ہفتے پہلے ہی انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا، اگلی صبح دوائیں لینے کا رسک ارما نہیں لینا چاہتی تھی، ڈرائیور بھی سہ پہر کو اپنے گھر چلا گیا تھا، نانو امی اس سے دوائیں منگوانا بھول گئی تھیں، اس بات پر بھی ارما کو کافی غصہ آیا کیونکہ نانو دوا وغیرہ کے معاملات میں بالکل بچوں کی طرح لاپرواہ تھیں اور شدید تپ چڑھی اس نئے مہمان پر، مطلب منصور ولا میں آنے والا مہمان، ماموں کی گاڑی لے کر جو صبح سے گیا تو شام ہونے کو آئی واپس آنے کا نام نہیں لے رہا تھا اور اس کا نام بھی ارما نطلے کو رکی۔

''اللہ جانے نام کیا ہے، یعنی حد ہو گئی، یہ بھی کوئی شرافت ہے، نانو امی نے اپنے گھر رہنے کی اجازت کیا دی، ہاتھ پاؤں پسار کر لمبا ہی ہو گیا۔'' اس نے ایک ان دیکھے، انجانے شخص پر دل ہی دل میں غصہ نکالا جس کے متعلق فریال نے فون پر بتایا تھا، پرس میں نسخہ اور پیسے ڈال کر وہ گیٹ سے باہر نکل آئی، عظمت بوا اور نانو پکارتی رہ گئیں کہ موسم خراب ہے اکیلی مت جاؤ، لیکن اس نے ایک نہیں سنی۔

یوں تو فارمیسی دیکھی بھالی تھی اور راستہ بھی

مختصر تھا لیکن پیدل اکیلی جانے کا اتفاق آج پہلی مرتبہ ہو رہا تھا، اب اللہ جانے یہ پہلی مرتبہ پیدل جانے کا اثر تھا یا موسم کی ہولناکی کہ اسے ہرگز راستہ مختصر نہیں لگ رہا تھا، ابھی چوراہے تک پہنچنا تھا پھر وہاں سے دائیں مڑنے پر غالباً اٹھارویں یا بیسویں دکان تھی، جونہی وہ چوراہے سے مڑی تابڑ توڑ بارش کا جیسے شاور کھل گیا، وہ بنا کہیں رکے تیزی سے آگے بڑھتی گئی اور فارمیسی پہنچ کر ہی دم لیا، مطلوبہ دوائیں ایک ہی جگہ سے مل گئیں لیکن بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی، وہ بار بار دکان کی سیڑھیاں اترتی لیکن بارش کا زور دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتی۔

''کچھ دیر انتظار کرلیں بی بی، بارش ابھی رک جائے گی۔'' شاپ والا لڑکا سنجیدگی سے مشورہ دے کر شرافت سے رجسٹر پر جھک گیا، ارما سر ہلا کر باہر دیکھنے لگی، بارش کی تیزی میں تو واقعی کمی آگئی تھی لیکن اندھیرا خاصا بڑھ گیا تھا، ذرا سی دیر میں سڑک بھی ویران لگنے لگی تھی، شہر بھر کے رکشے ٹیکسیاں بھی نجانے کہاں جا چھپے تھے، پیدل جانے کا رسک اب وہ نہیں لے سکتی تھی، بارش دوبارہ تیز ہو سکتی تھی، وہ سیڑھیاں اتر کر اب سڑک کنارے آ کھڑی ہوئی اور ہاتھ کا چھجا بنا کر کوئی رکشہ ٹیکسی دیکھنے لگی، تبھی ایک تیز ہیڈ لائٹ سیدھی آنکھوں میں پڑی اور کوئی گاڑی عین اس کے سر پر آ کے رکی، ارما نے تیز روشنی کی وجہ سے بے ساختہ آنکھیں بند کرلیں، ٹھک کر کے گاڑی کا دروازہ بند ہوا اور قدموں کی چاپ۔

''ایکسکیوز می، آپ ارما رباب ہیں؟'' کان کے قریب ایک بھاری مردانہ آواز گونجی تو اس نے پلکیں اٹھائیں، سیاہ کالی آنکھوں اور کھڑی ناک والا اونچا لمبا وہ ہینڈسم لڑکا یقیناً اسی سے مخاطب تھا۔

''آپ ارما نہیں ہیں تو میں جاؤں؟'' عاجزی سے درخواست کی گئی۔

''آ...... آ...... آپ...... کون۔'' وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔

''میں مبین علی ہوں، مجھے آپ کی نانی امی مطلب خدیجہ آنٹی نے بھیجا ہے بشرطیکہ آپ ارما ہی ہوں۔'' لڑکے نے رسان سے وضاحت کی۔

''تو یہ ہے وہ نیا مہمان۔'' ارما بنا کچھ بولے گاڑی کی طرف بڑھ گئی، مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ منصور ماموں کی گاڑی وہ پہچان گئی تھی۔

''آپ کچھ دیر ویٹ کرلیتیں تو میں خود یہ دوائیں لے آتا، ناحق آپ کو تکلیف اٹھانا پڑی۔''

''مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔'' ماتھے پہ بل ڈالے وہ باہر دیکھنے لگی۔

مسکراہٹ دبا کر مبین نے ایک نظر اس کے بالوں سے گرتے پانی کے قطروں پر ڈالی اور مزید کچھ بھی کہنے کا ارادہ ترک کر کے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

☆☆☆

''چلیں مام...... آئی ایم ریڈی۔'' وہ موبائل فون اور گاڑی کی چابیاں پینٹ کی جیبوں میں پھنساتا عجلت میں سیڑھیاں اترا تو رابعہ نے بے ساختہ محسن کی طرف دیکھا۔

''وہ سعد بیٹا! ابھی تمہارے ابا نے فون کر کے اعظم بھائی سے آنے کی معذرت کرلی ہے۔''

''اور ئیلی۔'' سعد نے حیرت سے باپ کو دیکھا۔

''باہر موسم بہت خراب ہے ہنی، بارش بھی اچھی خاصی تیز ہو چکی ہے اب ایسے میں نکلنا کافی

عجیب سا لگے گا۔'' اعظم بھائی بھی سمجھ رہے تھے اس کی بات کو، انہوں نے بالکل برا نہیں مانا، کہہ رہے تھے آپ کا اپنا گھر ہے جب دل چاہے آ جائیں، محسن نے نرم لہجے میں وضاحت دی۔

''لیکن بارش میں ڈرائیو کر کے جانے کا تو اپنا ہی مزا ہے، یقیناً آپ نے منع کیا ہوگا۔'' اس نے مسکرا کر ماں کی طرف دیکھا تو رابعہ جھینپ گئی، دونوں باپ بیٹا خوب جانتے تھے کہ بادلوں کی گھن گرج اور برستی بارش سے اسے کتنی گھبراہٹ ہوتی تھی۔

''اٹس او کے، کل کا پروگرام رکھ لیتے ہیں، میں ابھی چینج کر لیتا ہوں، کچھ نئے پیشنٹس کی فائلز دیکھنی تھیں، وہ چیک کر لیتا ہوں، مام آپ ایک کافی بھیج دیں میرے روم میں۔'' وہ قدرے مایوس سا واپس پلٹ گیا۔

''کتنا خوش تھا آج سعد۔'' محسن نے محبت سے جاتے ہوئے سعد کی پشت کو دیکھا۔

''کیوں نہ ہو، آج برسوں بعد وہ پہلی مرتبہ اپنوں سے ملنے جا رہا تھا، ساری زندگی اس نے رشتوں سے محرومی میں گزاری ہے، جانے کتنی شدید خواہش ہو گی اس کے دل میں، اپنوں کے قریب جانے کی۔'' رابعہ نے حسرت سے آہ بھری۔

''اچھا کوئی بات نہیں، آج ہمارا وہاں جانا شاید نصیب میں نہیں تھا، پھر بات اب آج یا کل کی ہے ہی کہاں، اصل بات تو یہ ہے کہ اعظم بھائی نے اپنے دل اور گھر کے دروازے ہمیشہ کے لئے ہم پر کھول دیئے ہیں، محض ایک سال پہلے تک جب ابا جی زندہ تھے ہم یہ بات سوچ بھی کہاں سکتے تھے، یہ تو اعظم بھائی کا بڑا پن ہے جنہوں نے اتنا مختصر وقت لیا فیصلے میں اور ابا جی کی خواہش کے برخلاف ہمیں نہ صرف معاف کر دیا بلکہ رابطہ کرنے میں پہل بھی کی، میں ان کا یہ احسان کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔'' محسن خود کلامی کے انداز میں کہتے چلے گئے اور رابعہ خاموشی سے انہیں سنتی رہی۔

☆☆☆

مبین نے شرٹ کے بٹن بند کیے اور کف لنکس لگاتے کمرے سے نکل کر بالکنی میں آیا، رات کی بارش کا اثر تھا کہ صبح بہت دھلی دھلی اور حسین لگ رہی تھی، بالکنی کے عین نیچے لان تھا، سبزے اور رنگ رنگ کے پھولوں کے بیچ سب سے خوبصورت منظر وہ تھا جسے دیکھتے ہی مبین ٹھٹک کر رک سا گیا، وہ رات والی لڑکی نیلے رنگ کے ڈریس میں اپنے کھلے لمبے بال دائیں شولڈر پہ ڈال کر پھول چننے میں مگن تھی، گلابی رنگت، دھوپ کی تمازت سے سنہری چمکیلی سی لگنے لگی تھی۔

''کیا بھلا سا نام تھا؟'' وہ ذہن پہ زور دینے لگا۔

''رملہ، نیلما، عمارہ، او ہاں ارما۔'' مبین نے ہلکے سروں میں شوخ سی سیٹی بجائی اور اپنا ضروری سامان جلدی جلدی ہاتھوں میں لے کر تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا، دل و دماغ پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ پارکنگ پہنچنے تک کہیں وہ لان سے چلی نہ جائے، اسے قریب سے دیکھنے کی خواہش اس وقت ہر بات، ہر کام پر حاوی تھی، لیکن اس جذبے کا دورانیہ نہایت مختصر ثابت ہوا، آخری سیڑھی تک پہنچتے سوچ کے دھارنے نے جیسے اسے گہری نیند سے جگایا اور یک لخت اس کے پیروں کو بریک لگی، فطری شریفانہ سوچ ایکدم عود کر آئی، وہ یہاں جس مقصد اور نیت کے تحت آیا تھا اس میں کہیں ایسی شوخیوں کی گنجائش نہیں تھی، اس نے تھوڑی دیر پہلے کی جذباتیت کو

خود ہی سلانے کی سعی کی اور قدرے سست روی سے پورچ میں آیا، لان کی طرف دیکھنے سے دانستہ گریز کرتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

''ایکسکیوزمی۔'' باریک نرم آواز پر مبین نے چونک کر سر اٹھایا وہ لان کی چار فٹ اونچی باڑھ کے پیچھے کھڑی یقیناً اسی سے مخاطب تھی کیونکہ دیکھ بھی ادھر رہی تھی، وہ بنا کچھ بولے رک گیا اور ارما تقریباً بھاگتے ہوئے لان سے نکل کر پورچ میں آئی۔

''آپ اسی گاڑی میں آفس جائیں گے۔'' پھولی سانسوں پر اس نے بمشکل قابو پایا تھا۔

''اوہ تو یہی تھا لیکن ایسا کچھ ضروری بھی نہیں۔''

''وہ...... دراصل آج فریال اور میں نے مارکیٹ جانا ہے، اگر آپ کے لئے ممکن ہو تو......''

''جی...... جی بالکل، مجھے کوئی پرابلم نہیں ہے۔'' اس نے فوراً چابی ارما کی طرف بڑھائی جو قدرے جھجکتے ہوئے اس نے لے لی اور مبین نے قدم گیٹ کی طرف بڑھائے۔

''بات سنیں۔'' ارما نے ہچکچاتے ہوئے دوبارہ مخاطب کیا تو وہ محض مڑ کر دیکھنے لگا۔

''وہ نانو امی کو پتہ چلا تو مجھے بہت ڈانٹ پڑے گی۔''

''او۔'' مبین بے ساختہ ہنسا۔

''نہیں پڑے گی، میرا ایک دوست اکثر مجھے یہاں سے پک کرلیا کرتا ہے، میں کہہ دوں گا اسی کے ساتھ گیا تھا، آپ بے فکر رہیں۔''

''تھینک یو۔'' وہ خوشی سے کہتی فوراً اندر دوڑ گئی اور مبین جیبوں میں ہاتھ ڈالے کچھ دیر بلاوجہ ہی اس داخلی دروازے کو دیکھتا رہا جہاں سے ابھی ابھی ارما اندر گئی تھی۔

''کیا وہ جذبہ واقعی محض ایک شوخی تھا۔'' ذہن نے سوال اٹھایا تو وہ سر جھٹک کر گیٹ کی طرف مڑ گیا، بنا اپنے دل کو جواب کی مہلت دیئے۔

☆☆☆

''وہ براؤن سوٹ زیادہ اچھا تھا ہے ناں۔'' ہونٹ سیٹی کے انداز میں سکوڑ کر فریال نے کافی پرسوچ نظر سامنے پھیلے سرمئی سوٹ پر ڈالی۔

''توبہ کتنا کنفیوژ رہتی ہو، گھر سے نکلتے وقت کہہ رہی تھیں، برسوں سے گرے سوٹ نہیں بنوایا اور اب مطلوبہ رنگ سامنے پڑا ہے تو براؤن پہ سوئی اٹک گئی۔'' ارما نے ناراض لہجے میں شاپنگ سمیٹی۔

''میں تو نانو امی کو اپنی شاپنگ دکھانے جا رہی ہوں، تم نے اگر یہ سوٹ چینج کرنا ہے تو نانو کو دکھانے کی غلطی مت کرنا وہ دوسری مرتبہ ہرگز مارکیٹ نہیں جانے دیں گی۔''

پچھلے ایک ماہ سے ارما اور فریال کی ایک روٹین سی بن گئی تھی نانی امی کا خیال رکھنا، خدیجہ حیات کو مہینہ بھر پہلے ہارٹ اٹیک آیا تھا اور بروقت طبی امداد کی بدولت ان کی طبیعت سنبھل گئی تھی اب ان کی انجیو گرافی ہو چکی تھی اور وہ بیڈ ریسٹ پر تھیں، شروع شروع کے دنوں میں ان کی دونوں بیٹیوں آمنہ اور نفیسہ نے خود ان کا خیال رکھا، اکلوتا بیٹا منصور بھی جہلم سے چھٹی لے کر اسلام آباد آ گیا تھا، لیکن جہاں منصور کو ایک ہفتے بعد دوبارہ ڈیوٹی جوائن کرنا پڑی وہیں آمنہ اور نفیسہ کو بھی گھر بار کی ذمہ داریوں کی وجہ سے اپنے اپنے گھر رخصت ہونا پڑا لیکن جانتی تھیں، کہ اماں کو اتنے بڑے منصور ولا میں محض عظمت بوا اور ڈرائیور فرید کے حوالے کر کے چلے جانا وہ بھی ان حالات میں، اب قطعاً مناسب نہیں تھا، اماں

کی خوب منتیں ہوئیں کہ وہ ان دونوں بہنوں میں سے کسی ایک کے ہاں آ ٹھہریں لیکن خدیجہ حیات کے لئے اپنے گھر اپنی جگہ کو چھوڑ کر جانا ہارٹ اٹیک سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا، تبھی آمنہ نے ارما کو اور نفیسہ نے فریال کو ان کی دیکھ بھال کے لئے بھیج دیا، وہ دونوں ہی بی ایس سی کے پیپرز دے کر فارغ ہوئی تھیں، کبھی دونوں ایک ساتھ نانی کے ہاں رہ جاتیں تو کبھی تین تین روز کی باریاں رکھ لیتیں، یوں بھی منصور ولا ان کے لئے ایک گھر کم اور ڈریم لینڈ زیادہ تھا، جہاں آ کر رہنا اور نانو امی کے ساتھ وقت گزارنا بچپن سے گھٹی میں پڑا ہوا تھا، ارما کو نانو امی کے ہارٹ اٹیک پر شدید ذہنی دھچکا لگا تھا، اس نے بچپن سے نانو امی کو سارے کام خود کرتے دیکھا تھا، نواسے نواسیوں کی آمد پر ان کے لئے کھانے پکانا، ساتھ مل کر ٹی وی پروگرام مزے سے دیکھنا، منصور کی شادی کے پلان ترتیب دینا بشمول دلہن کی تلاش، سبھی کچھ جوش جذبے سے ڈسکس کرتی نانو امی کے یوں بستر پر آ پڑنے کا منظر ارما کے لئے خاصا جانگسل تھا، نانی کی جی توڑ خدمت کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما تھا کہ وہ جلد از جلد پہلے جیسی ایکٹیو اور صحت مند دکھائی دیں اور کچھ انہی دو کی خدمتوں کا صلہ تھا کہ خدیجہ بیگم اب خود کو پہلے سے کافی بہتر محسوس کرتی تھیں۔

مبین علی کی منصور ولا آمد کا سبب بھی کچھ ان کی طبیعت ہی بنی تھی، مبین علی، منصور کے جگری دوست عمیر کا چھوٹا بھائی تھا، وہ اپنی جاب کے سلسلے میں اسلام آباد آیا تھا، اسے ایک پرائیویٹ کمپنی میں اکاؤنٹس مینجر کی جاب ملی تھی، کمپنی کی طرف سے رہائش کا بندوبست بھی تھا لیکن منصور اور عمیر دونوں نے اسے مشورہ دیا کہ اگر وہ اسلام آباد رہنے کے لئے جا ہی رہا ہے تو بہتر ہے کہ منصور ولا میں قیام کرے تاکہ گھر میں مرد کی عدم موجودگی کا خلا پر ہو سکے۔

منصور خود ریونیو آفیسر تھا، دو سال پہلے اس کی ٹرانسفر جہلم ہوئی تو عمیر کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، وہ دونوں کالج کے دوست تھے اور دونوں کے برسوں پرانے گھریلو تعلقات تھے، ارما، عمیر سے تو خوب واقف تھی کیونکہ نانو امی کے گھر بے شمار مرتبہ اس سے مل چکی تھی بلکہ منصور ماموں کے دوست کی حیثیت سے اسے بھی عمیر ماموں کا درجہ دے دیا تھا، لیکن مبین علی یہاں سب کے لئے ایک نیا چہرا تھا سوائے خدیجہ حیات کے کیونکہ وہ منصور کے ساتھ جہلم آتی جاتی رہتی تھیں۔

ارما کو زیادہ غصہ اس بات کا تھا کہ ان کی خدمتوں میں ایسی کیا کمی رہ گئی تھی جو منصور ماموں نے مبین صاحب کی خدمات کا ٹوکرہ بھی منصور ولا میں بھیج دیا، فریال سے اس کا ہنسی مذاق دیکھ کر وہ مزید چڑ جاتی کہ بھلا کیا ضرورت ہے ایک اجنبی کو سر چڑھانے کی۔

''مبین بھائی یہ...... مبین بھائی وہ...... ہونہہ۔'' وہ برے برے منہ بناتی اپنے آپ میں مگن رہتی تا کہ نہ زیادہ سامنا ہو اور نہ بات چیت کرنا پڑے، مبین سب دیکھ سمجھ رہا تھا لیکن ہمیشہ ہی اسے اپنی شرارتی مسکراہٹ دبانا پڑ جاتی کیونکہ محترمہ کو اس کی مسکراہٹ سے اللہ واسطے کا بیر تھا، اب یہ اور بات کہ ارما کا مسلسل گریز مبین کو اس پتھر کے صنم کے مزید قریب لا رہا تھا، وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خود کو کوستا۔

''مبین علی! اس راہ کی دشواریاں اچھے اچھوں کو خون رلا دیتی ہیں اور وہ پھول جسے محبت کہتے ہیں اس تک پہنچنے کا راستہ اتنا خاردار ہے کہ تار تار دامن میں صرف چھید باقی رہ جاتے ہیں،

پھر یہ بات بھی کون مانے گا کہ پہلی نظر کی محبت کو محض فلمی اور افسانوی سمجھنے والے کا خود پہلی نظر میں ایسا حال ہو جائے گا۔"

خدیجہ آنٹی نے جب برستی بارش میں اسے اپنی نواسی ارما جو تب تک مبین کے لئے ایک ان دیکھی شخصیت تھی کو ڈھونڈنے بھیجا تو اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ چوراہے کا موڑ مڑتے ہی زندگی بھی ایک نیا موڑ کاٹنے والی ہے سڑک کنارے دواؤں کے شاپر کو مضبوطی سے تھامے سرخ سوٹ میں بھیگی اور گھبرائی سی لڑکی پر جب گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹ پڑی تو مبین کا دل یکبارگی دھڑکا اور ایک خواہش جو شدت سے مچل کر باہر آئی وہ یہ تھی کہ کچھ دیر وہ یونہی اسے بیٹھا دیکھتا رہے جس نے تیز روشنی پڑنے پر بے ساختہ آنکھیں بند کر لی تھیں، لیکن برستی بارش میں چونکہ یہ خواہش نری حماقت تھی سو وہ نیچے اتر آیا اور دشمن جاں سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل کیا۔

☆☆☆

"بزی تو نہیں ہو؟" سریلی کھنک دار آواز ماؤتھ پیس میں ابھری تو ایک بڑی دل آویز مسکراہٹ سعد کے لبوں کو چھو گئی۔

"یہ لو اب نہیں ہوں بزی۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر سامنے کھلی فائلیں بند کر دیں۔

"لنچ کے بارے میں کیا خیال ہے، کہو تو آ جاؤں؟" وہ شوخی سے ہنسی۔

"نو ڈیئر سچویشن کافی ٹف ہو جائے گی، ہینڈل کرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔" سعد نے فوراً اس کا خیال رد کیا۔

"خیریت؟ کوئی ٹیم وغیرہ وزٹ پر آئی ہے کیا۔" رمشہ کو یاد آیا چند ہفتے پہلے اچانک ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کے چند لوگ میڈیسن وغیرہ کی چیکنگ کے لئے آ گئے تھے تب بھی وہ دونوں لنچ کے لئے نکلنے والے تھے۔

"او نہیں، ان کو ہینڈل کرنا تو کوئی مسئلہ نہیں، ایز یو نو کہ سعد اللہ ایسے معاملات میں ہمیشہ صاف رہتا ہے۔" اپنی تعریف کا موقع اس نے ضائع نہیں جانے دیا۔

"آئی نو...... دین پرابلم کیا ہے؟"

"یار وہ میرے تایا جی نے کچھ دیر پہلے فون کیا، وہ مجھ سے ملنے ہاسپٹل آ رہے ہیں۔"

"یہاں؟" رمشہ حیران ہوئی، پروگرام بگڑتا دیکھ کر موڈ بھی آف ہو گیا۔

"بس تمہیں بتایا تھا ناں، کچھ دن پہلے ہم نے پہلی مرتبہ ان کے ہاں جانا تھا لیکن بارش کی وجہ سے پروگرام کینسل ہو گیا تھا، شاید دوبارہ انوائیٹ کرنا چاہتے ہیں۔"

"واہ بڑے کیئرنگ ہیں۔" رمشہ نے رشک سے بھنویں اچکائیں۔

"انوائیٹ تو فون پر بھی کیا جا سکتا تھا، ان فیکٹ انہیں ڈائریکٹ انکل آنٹی سے کہنا چاہیے لیکن لگتا ہے معاملہ تمہیں خصوصی اہمیت دینے کا ہے۔"

"ہوں کافی اسمارٹ ہو۔" سعد نے مسکرا کر ایزی چیئر سے پشت ٹکائی۔

"ہاں بھئی امیر سرجن بھتیجے کو کون دوسروں کے لئے چھوڑتا ہے وہ بھی اکلوتا لیکن ڈیئر تم کیوں اتنے ایکسائیٹڈ ہو، وہ ملنے کیا آ رہے ہیں، تم تو سارے کام دھندے چھوڑ کر بیٹھ گئے۔" وہ قدرے خفا سی ہو گئی۔

"ضروری ہے مائی سویٹ فرینڈ، بہت ضروری۔" سعد کی آنکھوں کی چمک کچھ اچانک ہی بڑھی تھی۔

"کیا ضروری ہے۔" رمشہ کا لہجہ بدلا۔

"کیا اچھا بننا؟" اس نے قدرے جتانے کے لہجے میں کہا تو سعد مبہم انداز میں مسکرایا۔

"یہی سمجھ لو۔"

"اور ہمارا لنچ؟"

"لنچ کو ڈنر میں تبدیل کر لیتے ہیں، تمہاری آج نائٹ نہیں ہے ناں تو آٹھ بجے اکٹھے یہاں سے نکلیں گے، ڈنر کے بعد تمہیں گھر بھی ڈراپ کر دوں گا، ایگری؟"

"آف کورس، ایگریڈ۔" وہ خوشی سے چہکی تو سعد نے بھی مسکراتے ہوئے فون رکھ دیا۔

☆☆☆

"نانو امی نے ناشتہ کر لیا بوا؟" کچن میں کھٹ پٹ کی آواز سن کر وہ وہیں چلی آئی۔

"نہیں بیٹا، میں نے کمرے میں جھانکا تو سو رہی تھی، میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔"

"ابھی تک سو رہی ہیں۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور قدرے پریشان سی ان کے کمرے میں آئی، ماتھے پہ ہاتھ رکھا، تو لمحے کو ان کی پلکیں کپکپائیں۔

"ارما۔" انتہائی کم آواز میں شدید نقاہت زدہ لہجے میں فقط اتنا کہا اور ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی لیکن اٹھا نہیں پائیں ان کا آدھا اوپر اٹھا ہاتھ لڑکھڑا کر دوبارہ گرا تو ارما کا دل اچھل کر حلق میں آیا، وہ ٹھیک نہیں تھیں، ارما بھاگ کر کچن میں آئی، بوا کو ان کی طبیعت کا بتا کر اندر بھیجا اور خود فرید کو بلانے باہر دوڑ گئی، وہ سامنے گیٹ پر ہی کھڑا تھا، ہاتھ ہلا کر اسے اندر بلایا اور واپس نانو کی طرف آ گئی، بوا کی مدد سے انہیں اٹھا کر وہیل چیئر پر بٹھایا تبھی فرید کے ساتھ مبین بھی اندر داخل ہوا، شاید اسے فرید نے بتایا تھا۔

"تم لوگ آنٹی کو گاڑی میں بٹھاؤ میں اوپر سے کچھ ضروری چیزیں لے لوں پھر خود ہی انہیں ہاسپٹل لے جاؤں گا۔" وہ فرید کو ہدایات دیتا واپس اوپر چلا گیا، ارما نے قدرے سکون محسوس کیا وہ بھی یہی چاہ رہی تھی کہ مبین ساتھ جائے، فرید اور بوا نانو امی کو گاڑی کی طرف لے گئے اور وہ فون کی طرف بڑھی تا کہ امی کو ان کی طبیعت کے بارے میں بتا سکے لیکن اس سے پہلے کہ نمبر ملاتی کسی نے ریسیور پہ ہاتھ رکھا، ارما نے چونک کر سر اٹھایا تو مبین نے نفی میں سر ہلا کر اسے منع کیا۔

"ابھی کسی کو پریشان نہ کریں، ہم سنبھال لیں گے، انشاء اللہ۔" نرمی سے کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

خدیجہ حیات کو دل کے عارضے کے علاوہ شوگر کا بھی مسئلہ تھا، اس روز بھی شوگر لیول انتہائی کم ہو جانے کی وجہ سے وہ نڈھال ہو گئی تھیں، ہسپتال میں یہاں سے وہاں ارما نے جانے کتنے چکر کاٹ ڈالے تھے، مبین نے آ کر رپورٹس کے متعلق بتایا تو وہ حیرت اور خوشی سے بلاوجہ اسے دیکھے گئی۔

"کیا ہوا؟" مبین کو سمجھ نہیں آئی کہ ارما خوش ہے یا پریشان۔

"کچھ نہیں۔" وہ جھینپ کر قریبی بینچ پر بیٹھ گئی۔

"میں سمجھی شاید پھر سے خدانخواستہ دل میں تکلیف اٹھی ہے۔"

"ہاں ڈر تو میں بھی گیا تھا لیکن شکر ہے مسئلہ صرف لو بلڈ پریشر کا تھا۔" وہ رومال سے پیشانی صاف کرتا ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔

"نانی کب تک یہاں رہیں گی؟"

"انہیں ڈرپ لگی ہوئی ہے اندازاً دس پندرہ منٹ اور ہیں، پھر سب ساتھ ہی نکلتے ہیں۔" مبین نے جواب دیتے ہوئے موبائل جیب سے نکالا۔

''چاہیں تو اب گھر والوں کو بتا دیں۔''
''جی امی کو بتا دیتی ہوں۔'' ارما نے نمبر ملا کر امی سے بات کی اور انہیں بجائے ہسپتال آنے کے نانی کے گھر پہنچنے کا کہا، موبائل فون مبین کی طرف بڑھاتے ہوئے ارما نے اک نظر اسے دیکھا۔
''شکریہ آپ نے آج چھٹی کی، اتنا تعاون کیا اور......''
''کیسی باتیں کر رہی ہیں، اگر میں اتنا بھی نہیں کر سکتا تو میرے یہاں رہنے کا فائدہ نہیں ہے اور شکریہ ادا کر کے مجھ پہ یہ ثابت مت کریں کہ وہ آپ کی زیادہ سگی ہیں۔'' آخری جملہ مبین نے مسکرا کر کہا تو وہ شرمندہ ہو گئی، مبین اٹھ کر دور چلا گیا وہ بے دھیانی میں اسے دیکھتی رہی، ناگواری کا ایک تاثر جو بلاوجہ ہی مبین کے لئے پیدا ہو گیا تھا یک لخت اس میں کمی کا احساس ہوا، گریز کا خود ساختہ خول بھی کچھ ٹوٹا سا محسوس ہوا، شاید نانی کے حوالے اس کا ذمہ دارانہ رویہ دیکھ کر۔

☆☆☆

''جلدی کرو بھئی، دو مرتبہ بوا بلانے آ چکی ہیں، ابھی نانو خود آ گئیں ناں، بہت مزا آئے گا تم سب کو۔'' ارما نے جھٹ پٹ جیولری پہن کر بالوں میں برش پھیرا اور ان تینوں کو تنبیہ کرتی باہر نکل آئی، ان دونوں کی مشترکہ دوست عصمہ کی شادی تھی، پچھلی شام سے ہی دونوں نانی کے ہاں تھیں، تارا اور صبا کچھ دیر پہلے پہنچی تھیں، ان سب کی تیاری تو ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی ارما اس خیال سے نانو کے کمرے کی طرف بڑھ گئی کہ پوچھے انہوں نے کب اور کس کے ساتھ نکلنا ہے، باہر نکلی تو خزاں کی خشک ہواؤں نے بال بکھیر کر اس کا استقبال کیا، وہ چہرے پر آئی لٹوں کو ہٹاتی چند قدم مزید آگے آئی تو نظر مبین پر پڑی جو برآمدے کے کونے پر لان کی طرف منہ کیے کھڑا تھا، آہٹ پر گردن موڑی تو ارما سے آنکھیں چار ہوئیں، جانے کیا تھا اس کی سوئی سوئی نگاہ میں، وہ جھجک کر آگے بڑھ گئی۔

مبین نے ایک گہرا سانس لیا اور دو اسٹیپ نیچے اتر کر قدم لان میں رکھے، آج جانے کیوں طبیعت بہت بھاری سی ہو رہی تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ ایسا صبح سے نہیں تھا بلکہ پانچ بجے جب وہ آفس سے لوٹا تو خدیجہ آنٹی نے کہا کہ ارما اور فریال وغیرہ کی دوست کی شادی ہے اور اسے انہیں ڈراپ کرنا ہو گا، پھر کمرے تک جاتے جاتے، اس کی کیفیت عجیب ہونا شروع ہو گئی تھی، مبین نے بہت سوچا کہ شاید آفس کے کسی معاملے کی وجہ سے اس کی طبیعت بوجھل ہے، لیکن اب تو یقین ہو گیا کہ ایسا کچھ نہیں تھا، چند لمحے پہلے ارما سے نظریں کیا چار ہوئیں مبین کے بھاری اعصاب پر گویا کسی نے دو چار مزید پتھر رکھ دیئے تھے، گہرے مونگیا سوٹ کے ساتھ کرسٹل وائٹ جیولری پہنے وہ بلاشبہ بہت حسین لگ رہی تھی، پر جانے کیوں اچانک ہی ایک بے کار سی سوچ نے مبین کے وجود کا احاطہ کیا اور اس کا دل چاہا ابھی ارما کو روک کر کہہ دے کہ ہو سکے تو وہ شادی میں نہ جائے لیکن سوچنے اور کہنے میں بہت فرق ہوتا ہے، نہ ہی اسے یہ حق حاصل تھا اور نہ ہی روکنے کا کوئی جواز، آج رہ رہ کر اسے امی کی یاد آ رہی تھی، وہ کہا کرتیں مبین مجھے تمہاری چھٹی حس سے بڑا ڈر لگتا ہے، کسی وہم یا خیال کا تمہارے دل میں جگہ پا لینا مجھے بہت اپ سیٹ کر دیتا ہے، مبین کے وجدان کی تیزی انہوں نے اس کے بچپن میں ہی محسوس کر لی تھی، پیش آنے والے کسی برے یا منفی عمل سے پہلے وہ ایکدم نہایت خاموش، سست اور ڈھیلا سا ہو جاتا، چاہنے کے باوجود وہ اپنی کیفیت میں تبدیلی پیدا نہ کر سکتا اور کبھی بلاوجہ بہت ایکٹیو، پر جوش اور شوخ نظر آتا اور اس کی یہ خوشی جلد ہی ماحول میں کسی خوش آئندہ خبر کی صورت میں ظاہر ہو جاتی۔

وہ تھکا سا برآمدے اور لان کی درمیانی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا تبھی ارما لاؤنج سے نکل کر واپس برآمدے میں آئی، مبین کو یوں بیٹھا دیکھ کر وہ رکی، اس کی حیثیت یہاں گھر کے فرد جیسی تھی، ایسے ڈرائیوروں کی طرح اس کا انتظار میں بیٹھنا نہ تو اچھا لگ رہا تھا نہ ہی کوئی مناسب رویہ تھا، فریال اور تارا وغیرہ پر بھی سخت غصہ آیا جنہیں قطعاً کسی بات کا احساس نہیں تھا وہ کچھ سوچ کر چند قدم آگے آئی۔

''سوری آپ کو زحمت ہو رہی ہے، میں سب کو بلا لاتی ہوں۔''
''بات سنیں۔'' عجلت میں اندر جاتی ارما کو خاصی غائب دماغی سے وہ پکار بیٹھا تھا۔
''جی......؟'' وہ رکی لیکن چند لمحے انتظار کے باوجود وہ کچھ نہیں بولا اور پھر اچانک ہی اٹھ کھڑا ہوا۔
''کچھ نہیں، آپ باقی سب کو بلا لیں میں گاڑی میں ویٹ کر رہا ہوں۔'' بنا اس کی طرف دیکھے وہ جلدی سے کہتا آگے بڑھ گیا اور وہ حیرت سے اس کی پشت کو دیکھتی رہی۔
''جانے کیا کہنا چاہ رہا تھا، عجیب ہے یہ بھی۔'' وہ آہستہ روی سے کمرے کی طرف چل پڑی۔

شادی والے گھر کے آگے گاڑی رکی تو فریال نے اسے دو گھنٹے بعد واپس آنے کا کہا، اندر داخل ہونے سے پہلے ارما نے ایک مرتبہ پلٹ کر دیکھا، جانے کیوں وہ اسے کافی پریشان اور الجھا الجھا سا لگا تھا۔

''ارے سنو ارما، یہاں تو سعد بھائی بھی ہیں۔'' وہ چند پرانی کلاس فیلوز سے مل رہی تھی جب صبا اس کے کان میں گھسی۔
''اچھا...... کہاں ہے؟'' وہ اشتیاق سے مڑی، صبا نے دائیں جانب اشارہ کیا تو ذرا فاصلے پر وہ دکھائی دے گیا، پچھلے دنوں چچا کے گھر تصویروں میں اسے دیکھا تھا، لائٹ گرے فل سوٹ میں بلاشبہ وہ کافی جاذب نظر دکھائی دے رہا تھا، کسی سے بات کرتے اچانک اس کی نظر صبا پر پڑی تو فوراً پہچان گیا کیونکہ صبا سے اس کی دو مرتبہ ملاقات ہو چکی تھی، اس نے ہاتھ ہلایا تو وہ مسکراتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔
''کیسی ہو صبا؟''
''بالکل ٹھیک، سعد بھائی، آپ یہاں کیسے؟'' وہ خاصی پر جوش لگ رہی تھی۔
''دولہا صاحب کے بیسٹ فرینڈ ہونے کا شرف حاصل ہے۔'' بات کے دوران ہی اس نے باری باری ان تینوں کو دیکھا جو مکمل اسی کی طرف متوجہ تھیں، صبا کو فوراً تعارف کی ضرورت محسوس ہوئی۔
''ان سے ملیں سعد بھائی، یہ ارما ہیں۔''
''او......تو یہ ہیں ڈیئر کزن جو ہم سے اتنی دور دور رہتی ہیں۔'' وہ اسے گہری نگاہ کے حصار میں لے کر خوشدلی سے بولا۔
''ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ ایکدم شرمندہ ہو گئی۔
''دونوں مرتبہ اتفاقاً ہی ایسا ہوا کہ آپ لوگ آئے لیکن میں اپنی نانی امی کے ہاں تھی، دراصل وہ بیمار ہیں تو اس لئے میں اور فریال آج کل وہاں ہوتی ہیں۔'' ارما کے اشارہ کرنے پر سعد نے فریال کی طرف دیکھا۔

''یہ ہماری خالہ زاد ہیں سعد بھائی، یہ بڑی فریال اور چھوٹی تارا۔'' صبا نے تعارف کو مزید آگے بڑھایا۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر، کافی ذکر سنتے تھے آپ کا۔'' فریال نے مسکرا کر اضافہ کیا۔

''اچھا۔'' وہ قدرے حیرت سے ہنسا۔

''ان کے ہاں ہمارا ذکر، حیرت سے زیادہ اعزاز کی بات ہے۔'' جانے کیوں ارما کو اس کے لہجے میں ہلکی سی طنز کی کاٹ محسوس ہوئی، چونک کر سر اٹھایا تو وہ پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھا، چمکتی شوخ نگاہ جیسے آر پار ہوئی جا رہی تھی، اس نے گھبرا کر فریال کو دیکھا۔

''چلو عصمہ سے مل آئیں۔''

''ہاں...... آؤ۔'' اس نے فوراً پیش قدمی کی اور ارما ایکسکیوزمی کہہ کر آگے بڑھ گئی، انہیں اسٹیج کی طرف آئے بمشکل پانچ دس منٹ ہوئے تھے کہ سعد بھی وہاں آ گیا، عصمہ کے شوہر سے باتیں کرتے اس نے بے شمار بار ارما کی طرف دیکھا، اس کی معنی خیز گھوریاں ارما کو سخت کوفت میں مبتلا کر رہی تھیں، عجیب سمجھ میں نہ آنے والے انداز تھے اس کے، ارما کا دل بڑے زور سے دھڑکا، بعد میں جتنی دیر بھی وہ سب وہاں رہے سعد اسے مسلسل اپنے آس پاس ہی دکھائی دیا۔

''ارے مانو، یہ صاحب تو پورے عاشق ہو گئے تم پر۔'' فریال نے نوٹ تو کر لیا پر گھر تک صبر نہیں کر پائی۔

''نہیں یار، ویسے ہی فراجا ذرا بولڈ لگ رہا ہے۔'' ارما نے بات اڑانے کی کوشش کی۔

''ارے نہیں، تم دیکھ لینا، اپنا گھر بسانے کے موقع پر پہلا ریڈ تمہارے ہاں ہی کرے گا، بلکہ سیدھا تمہیں لے ہی نہ اڑے، سگا ہونے کا اضافی فائدہ بھی تو ہے اسے۔''

''اللہ نہ کرے، تم بھی ناں۔'' ارما نے زور سے اس کے بازو پہ مکا مارا۔

''رشتہ داریوں پہ اپنی ریسرچ سنبھال کر رکھو، چلو تارا اور صبا کو بلاتے ہیں، کافی ٹائم ہو گیا ہے ہمیں آئے۔''

''ارے...... میں نے تو مبین کا نمبر ہی نہیں لیا، اب اسے بلائیں گے کیسے۔'' فریال کو اچانک خیال آیا۔

''او۔'' ارما نے سوچنے کے لئے تھوڑا وقت لیا۔

''گھر فون کر لیتے ہیں، ظاہر ہے وہ واپس ہی گیا ہو گا، بوا یا نانو سے کہتے ہیں اسے بھیج دیں۔'' اس نے پرس سے اپنا موبائل نکالا، فون بوا نے اٹھایا ارما نے مبین کا پوچھا تو انہوں نے کہا کہ تب سے وہ تو گھر ہی نہیں آیا۔

''اب کیا کریں، مبین تو گھر گیا ہی نہیں۔'' اس نے پریشانی سے فریال کو دیکھا، صبا اور تارا بھی گھومتی گھومتی واپس آ پہنچیں۔

''سعد بھائی کے ساتھ چلیں، وہ ہمیں ضرور ڈراپ کر دیں گے۔''

''پاگل ہوئی ہو۔'' صبا کا مشورہ اسے ایک آنکھ نہیں بھایا، فریال نے بھی مشکل سے ہنسی روکی، ساتھ ہی چاروں نے باہر کا رخ کیا، وہ مبین کے متعلق سوچتی سست روی سے سب سے آخر میں باہر نکلی اور یہ دیکھ کر تو جیسے ڈھیروں سکون اس کے اندر تک اتر گیا کہ مبین اپنی سابقہ جگہ پر موجود تھا، وہ گاڑی سے تھوڑا ہٹ کر ان سب کے بیٹھنے کا انتظار کرنے لگا، فریال وغیرہ تو اندر گھس گئیں لیکن وہ سیدھی اس کے پاس آئی۔

''کہاں تھے آپ؟ بوا نے بتایا کہ گھر ہی نہیں آئے۔'' جانے کیسا اپنائیت بھرا غصہ تھا وہ بس دیکھ کر رہ گیا۔

''یہیں تھا، بیٹھیں آپ۔'' سنجیدگی سے کہتے ہوئے وہ گاڑی کی طرف بڑھ گیا، اب کیا کہتا اس سے کہ چھٹی حس کے وسوسوں نے اسے دور کہیں جانے ہی نہیں دیا اور تب سے وہ یہیں بیٹھا تھا اور پہلا سکون کا سانس اس نے تب لیا جب ارما ساتھ خیرت کے گیٹ سے باہر نکلی نگاہوں کے چند سیکنڈ کے تبادلے نے اس پر بہت کچھ واضح کیا تھا، ارما نے اسے دیکھ کر ایک طمانیت بھرا سانس لیا تھا، سکون اور ٹھہراؤ کی وہ کیفیت جو محض چند سیکنڈز پر مبنی تھی نہ چاہتے ہوئے بھی مبین کو خوشی پہنچا گئی، البتہ قریب آنے پر اس کا سوال کہ ''کہاں تھے آپ؟'' نے صاف واضح کر دیا کہ اندر گزارے دو گھنٹوں میں وہ بھی بے سکون اور پریشان رہی تھی، پر کیوں؟ مبین اپنی چھٹی حس کے اشاروں کو آج پہلی مرتبہ خود سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

گھر واپس پہنچتے گیارہ بج گئے، گاڑی پورچ میں رکی اور وہ سب آپس میں ہنستی بولتی اندر چلی گئیں، مبین نے شیشے وغیرہ چڑھا کر چھوٹا موٹا سامان سمیٹا اور لاک لگا کر اندر کی طرف قدم بڑھائے، تبھی ارما بھاگتی ہوئی واپس آئی۔

''وہ...... چابی...... آئی مین گاڑی کی چابی۔''

''کیا ہوا؟ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہیں؟'' وہ پریشان ہو گیا۔

''میری گولڈ رنگ کھو گئی ہے شاید گاڑی میں ہو۔''

''او چلیے دیکھ لیتے ہیں۔'' مبین فوراً مڑا، لاک کھول کر بیک سائیڈ کے دونوں دروازے کھول دیئے، ایک طرف سے ارما دیکھنے لگی اور دوسری طرف سے وہ خود۔

''آرام سے ارما۔'' اس کی بوکھلاہٹ اور عجلت دیکھ کر مبین کو ٹوکنا پڑا کیونکہ اس انداز سے ڈھونڈنے پر ممکن نہیں تھا کہ چیز مل پاتی۔

گاڑی کی سینٹر لائٹ اور موبائل کی ٹارچ آن کر کے اس نے ارما کو باہر رہنے کا کہا، وہ واپسی پر ڈرائیونگ سیٹ کے عین پیچھے بیٹھی تھی، مبین نے ٹارچ گھما کر ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے دیکھا تو کونے میں چمکتی ہوئی چیز پھنسی دکھائی دی، اس نے مسکرا کر انگوٹھی کھینچی اور لائٹیں دروازے بند کر کے باہر آ گیا۔

''یہ لیں۔''

''اوہ تھینکس گاڈ۔'' اس نے فوراً انگوٹھی جھپٹی۔

''اتنی پریشان کیوں ہو گئی تھیں، ایک رنگ ہی تو تھی۔'' وہ ابھی بھی مسکرا رہا تھا۔

''وہ دراصل میں...... میری نہیں تھی۔'' ارما جھینپ گئی۔

''امی کی پہنی تھی۔''

''ہوں، پھر تو خصوصی خیال رکھنا چاہیے تھا۔''

''بس پتہ نہیں کیسے، پریشانی میں مسلسل گھمائے جا رہی تھی تو۔''

''پریشانی۔'' مبین چونکا۔

''کیسی پریشانی؟'' سارے حواس ایکدم چوکنا ہو گئے تبھی بے ساختہ سوال کر بیٹھا۔

''کچھ خاص نہیں، ویسے ہی۔''

''کیا شادی میں کچھ بات ہوئی؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا اصرار بڑھ رہا تھا ارما نے حیرت سے اسے دیکھا، وہ دونوں آپس میں اتنے فری ہرگز نہیں تھے کہ دکھ سکھ شیئر کرتے، پھر یہ کیسی بے تابی تھی مبین کی اور اندازہ بھی اتنا ٹھیک، بلاشبہ وہ سعد سے ملاقات کی وجہ سے اپ سیٹ تھی۔

''سوری۔'' اس کی حیرت دیکھ کر مبین نے لہجے کی بے چینی پر قابو پایا۔

''میں بلاوجہ پرسنل ہو گیا۔'' حیرت انگیز طور پر دونوں ہی ابھی تک پورچ میں کھڑے تھے، نہ مبین نے اندر کی طرف پیش قدمی کی تھی اور نہ ہی ارما آگے بڑھی تھی۔

''پریشان تو آپ بھی تھے جانے سے پہلے اور کچھ کہنا بھی چاہ رہے تھے۔'' ارما کو یاد آیا۔

''ہاں۔'' اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

''ایک الجھن ہے جو سلجھ نہیں رہی آپ اپنی پریشانی کی وجہ بتا دیں تو شاید سلجھ بھی جائے۔''

''جی؟'' کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ اسے دیکھنے لگی، اب اس کی پریشانی سے مبین کا خاک کچھ لینا دینا تھا۔

''میرا خیال ہے اندر چلتے ہیں۔'' ہلکا سا مسکرا کر اس نے اندر کی جانب اشارہ کیا، اچانک ہی دماغ کی تنبیہ نے بہکتے دل کو مٹھی میں لیا تھا، یہاں تو خود کو سنبھالنا ایک امتحان ہو گیا تھا، کیسے ایک سادہ دل معصوم سی لڑکی کو سمندروں سے گہرے جذبوں کی کھوج پر لگا دیتا، وہ...... جو اس کی آنکھوں کی گہرائی سے بھی خائف رہتی تھی، ذرا سی نظر کیا اٹھا دیتا، گڑبڑا کر دائیں بائیں ہونے لگتی تھی، اس وقت بھی حیرت آنکھوں میں سموئے اس کے لفظوں پر غور کر رہی تھی جب اچانک تارا دروازے میں آئی۔

''انگوٹھی نہیں ملی کیا؟'' وہ زور سے چلائی۔

''ہاں مل گئی۔'' وہ تیزی سے اندر روانہ ہوئی۔

''کافی مشکل سے ملی ہے۔'' دیر ہو جانے کا سیدھا سا جواز بنا کسی کے مانگے فراہم کرتی لحظے بھر کو مبین کے ہونٹوں پر ہنسی چھوڑ گئی، وہ سینے پہ ہاتھ باندھے لبوں کی ہنسی فوراً معدوم ہوئی اور دل ایک انجانے خوف سے دھڑک اٹھا، جو وہ نہیں چاہ رہا تھا غالباً ہونے جا رہا تھا اور سراسر قصور وار بھی وہ خود تھا، فنکشن سے واپسی پر نادانستگی میں وہ دو یا تین مرتبہ اسے بیک ویو مرر میں دیکھنے کی غلطی کر بیٹھا تھا جسے ارما نے فوری طور پر محسوس کیا تھا تبھی تو جونہی اس کی نظر مرر کی جانب اٹھتی عین اسی لمحے ارما بھی بے ساختہ اسے دیکھتی، شاید اس شدت، اس تپش کی وجہ سے جو مبین کی آنکھوں سے سیدھی ارما کے دل تک پہنچی تھی۔

☆☆☆

''صبح محسن بھائی کا فون آیا تھا، میں نے آج انہیں ڈنر پہ انوائیٹ کیا ہے۔'' ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اعظم نے آمنہ کو دیکھا۔

''جی اچھا میں انتظام کر لوں گی۔'' وہ بیڈ پہ بکھری فائلیں سمیٹنے لگیں۔

''ارما ہے گھر پہ؟'' دروازے کا ہینڈل دباتے اچانک انہیں خیال آیا۔

''جی وہ تو اماں کے گھر گئی تھی ناں آج صبح ہی۔''

''تیسری مرتبہ وہ لوگ آ رہے ہیں اور ارما گھر پر نہیں ہوتی کیا سوچیں گے۔''

''میں نے محسن بھائی اور رابعہ کو اماں جی کی طبیعت کے بارے میں بتایا تھا پچھلی مرتبہ۔'' انہیں پتہ ہے کہ ارما نانی کا خیال رکھتی ہے، آمنہ نے صفائی دینے کی کوشش کی، جانے کیوں اعظم کی تیوری کا ایک بھی بل اسے اندر تک سہما دیتا تھا۔

''آج سعد اللہ بھی آ رہا ہے، بہتر ہو گا کہ تم ارما کو بلوا لو۔'' آرڈر کے انداز میں کہتے وہ واش روم چلے گئے، دوٹوک رویہ ان کی فطرت کا حصہ تھا۔

تفصیلات بتانے کی نہ انہیں عادت تھی نہ ضرورت، آدھی سے زیادہ باتوں کے مطلب آمنہ خود ہی سمجھ جایا کرتی تھی، یہ بھی بائیس سالہ رفاقت کا کمال تھا کہ اب اسے ہر بات کا مطلب پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، باہر آ کر اس نے جلدی سے اماں کا نمبر ملایا، فون اتفاق سے ارما نے ہی اٹینڈ کیا۔

''ہو سکے تو ابھی چلی آؤ مانو، تمہارے چچا وغیرہ آج آ رہے ہیں، سعد بھی ہو گا، تمہارے ابو چاہتے ہیں آج تم انہیں گھر پر ملو۔''

''پلیز امی! کل ہی تو آئی ہوں اور میرا بالکل موڈ نہیں واپس آنے کا۔'' اس نے منہ بسورا۔

''ضد مت کرو ارما، تمہارے ابو ناراض ہو جائیں گے، میں نفیسہ آپا سے کہتی ہوں کہ تارا یا فریال کو اماں کے پاس بھیج دیں۔'' آمنہ نے اسے مزید بحث کا موقع نہیں دیا۔

''اور ہاں تم فرید کے ساتھ آ جانا، تمہارے ابو تو ابھی آفس سے آئے ہیں کھانا کھا کر ریسٹ کریں گے اور فہد آج یونیورسٹی ٹرپ پہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے شاید شام تک واپسی ہو۔''

''جی اچھا۔'' ماں کے قطعی انداز پر وہ فقط اتنا ہی کہہ پائی، لیکن جب نانو سے پتہ چلا کہ فرید آج چھٹی پر ہے تو خوشی سے اچھل پڑی۔

''چلو شکر ہے، اب نہیں جانا پڑے گا۔''

''صرف اپنے بارے میں سوچ رہی ہو، ہوں ماں کے بارے میں کون سوچے گا؟'' خدیجہ بیگم نے مسکرا کر اس کی ٹھوڑی اونچی کی اور...... اور سوالیہ انداز میں بھنویں اچکائیں تو ارما جھینپ گئی۔

''یہ امی اتنا ڈرتی کیوں ہیں ابو سے، آپ بھی نانا سے اتنا ڈرتی تھیں۔''

''تمہارے نانا تو نہایت حلیم اور نیک دل طبیعت کے تھے، ہمیشہ چہرے پہ مسکراہٹ سجی رہتی تھی، بس ہوتا ہے ہر ایک کا اپنا مزاج، تمہارے ابو جانے کن حالات اور کیسے ماحول میں پلے ہوں گے، اپنے غصے پر شاید ان کا بھی اختیار نہ ہو، بس تم لوگ سمجھ داری کا ثبوت دیا کرو اور تم تو میری سب سے پیاری اور فرمانبردار بچی ہو۔'' انہوں نے پیار سے ارما کو اپنے ساتھ لگایا تو اس نے لاڈ سے ان کے کندھے پر سر ٹکایا۔

''تو پھر نانو میں کیسے جاؤں گی؟''

''مبین آفس سے آ چکا ہو گا اسے کہتی ہوں وہ چھوڑ آئے گا۔''

''مبین!'' دل لحظے کو عجیب مدھر سروں میں اوپر نیچے ہوا، اگلے ہی پل اس نے خود کو اس سمجھ میں نہ آنے والی کیفیت سے نکالا۔

کمرے میں آ کر اس نے اپنا ضروری سامان سمیٹا، سوچیں بہت اوندھی سیدھی اور منتشر سی تھیں، گھر میں مختلف نوعیت کی دعوتیں، پارٹیز آئے دن ہوا ہی کرتی تھیں لیکن ابو کی طرف سے ایسا فرعون نامہ پہلے کبھی جاری نہیں ہوا تھا اور سعد کی آمد پر بطور خاص اس کی موجودگی پر زور دینا، اوپر سے سعد کی نظر التفات و عنایت، مطلب تو ایک ہی نکلتا تھا، کوئی ہفتہ بھر پہلے وہ سب بھی محسن چچا کے گھر گئے تھے، عصمہ کی شادی کے بعد یہ اس کی سعد سے دوسری ملاقات تھی، اس کے بے باک انداز اور مہربان رویے میں ارما نے مزید اضافہ محسوس کیا تھا، گھر دکھانے کے بہانے وہ اسے اکیلے ہی اپنے ساتھ لے گیا تھا، وہ تو پہلے ہی اس کی چبھتی نگاہوں سے گھبرائی سی رہتی تھی اب تو معنی خیز جملے بازی بھی شروع ہو گئی تھی، حالانکہ دل ہی دل میں اکثر اسے یہ سوچ کر سعد پہ ترس آتا تھا کہ بڑوں کی لڑائی کی وجہ سے بلاوجہ

اس بے چارے کو رشتوں کی محرومی سہنا پڑی تھی، لیکن اب جس زاویے پر سعد سوچنے لگا تھا اس سے ارما کو کوفت محسوس ہوتی، دراصل محسن رضا نے اپنے والد ضمیر الحسن کی مرضی کے خلاف رابعہ سے محبت کی شادی کی تھی، وہ خود ایک ڈاکٹر تھے اور رابعہ ان کے ہاسپٹل میں نرس تھی، حالانکہ اعظم اور محسن کا رشتہ والد کی پسند سے طے ہو چکا تھا اور دونوں کی شادی ایک ساتھ ہونا قرار پائی تھی لیکن عین شادی سے ہفتہ پہلے محسن نے والد کی پسند کو ٹھکرا کر رابعہ سے بیاہ رچا لیا، ضمیر الحسن کی عزت پر ایسا بھرپور تازیانہ پڑا کہ انہوں نے علی الاعلان محسن کو عاق کر دیا اور زندگی بھر کوئی تعلق نہ رکھنے کا عہد بھی، رابعہ کی محبت کے نشے میں چور محسن نے ہمیشہ کے لئے باپ کا گھر چھوڑ دیا اور اپنی ایک الگ آزاد دنیا بسا لی، وہ ایک کامیاب ڈاکٹر تھے دولت کی کوئی کمی نہ تھی، ایک خوشحال کامیاب زندگی کا آغاز ہو گیا اللہ نے اولاد بھی عطا کر دی، پہلی مرتبہ وہ تین ماہ کے سعد اللہ کو ہاتھوں پر لئے باپ سے معافی مانگنے اور انہیں ان کا پوتا دکھانے لے آئے، لیکن ضمیر صاحب نے اپنا عہد نہ توڑا اور محسن مایوس لوٹ گیا، لیکن اس کے بعد وہ تواتر سے عیدین وغیرہ پر باپ کو منانے کے لئے آنے لگا لیکن نہ تو انہوں نے اپنی ضد چھوڑی اور نہ ہی محسن نے اپنا وطیرہ ترک کیا، البتہ سعد صرف بچپن میں ہی اپنے باپ کے ساتھ آتا رہا، گزرے دس بارہ سالوں میں وہ پھر کبھی باپ کے ساتھ نہیں آیا۔

اور سال بھر پہلے جب ضمیر الحسن صاحب کا انتقال ہوا تو اس کے چند ماہ بعد اعظم خود بھائی کے پاس گیا اور اسے اپنی طرف سے تعلقات کی بحالی کی نوید سنائی، یوں قریب دو ماہ سے دونوں گھرانوں کا آپس میں باقاعدہ میل جول شروع ہو چکا تھا، خوش تو ارما بھی بہت تھی تعلقات دوبارہ قائم ہونے پر، لیکن یہ خصوصی توجہ اسے ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی، کیونکہ ابھی تو ٹھیک سے ایک دوسرے کو دیکھا سمجھا بھی نہیں تھا، بلکہ جتنا دیکھ اور سمجھ لیا تھا وہ تو سراسر غیر تسلی بخش تھا، سعد کی بے چینی بے تابی اسے بہت مصنوعی اور اظہار نہایت بناوٹی لگتا، رشتہ بظاہر بے حد مضبوط لیکن انداز بہت کھوکھلے سے تھے۔

تعلقات کی بحالی بذات خود ایک بہت بڑی کامیابی تھی فی الحال کچھ عرصہ اسی خوشی کو انجوائے کرنا ہی بہت کافی تھا، لیکن چچا کی فیملی کچھ زیادہ ہی سرگرم نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی اور بس اسی بات سے ارما کو سخت گلہ تھا، لیکن کہتی کس سے، جب اپنے ابو ہی سب سے زیادہ پرجوش نظر آ رہے تھے۔

''آ جاؤ بیٹا، بی بی بلا رہی ہیں، مبین نے کھانا کھا لیا ہے وہ تمہیں لے جانے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔''

''جی بوا، ابھی آئی۔'' اس نے جلدی سے چیزیں سمیٹ کر بلا ارادہ ہی خود کو آئینے میں دیکھا، بیک کومبنگ کچھ جچ نہیں رہی تھی اس نے کیچر سے بال آزاد کر کے الٹی مانگ نکالی، کچھ چھوٹی لٹیں چھوڑ کر باقی کے بال کان کے پیچھے اڑس لئے آنکھوں کے نیچے پھیلے کاجل کو ٹشو پیپر سے صاف کیا اور آئی بروز کو انگلیوں سے درست کیا، آئینے میں خود سے آنکھیں چار ہوئیں تو شرمندگی محسوس ہوئی۔

''حد ہوتی ہے خوش گمانی، خود فریبی کی بھی، یا شاید نہیں ہوتی۔'' اپنی ہی سوچ پر ندامت محسوس کرتی وہ باہر آ گئی، نانو امی لاؤنج میں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

''میں کل ہی واپس آ جاؤں گی نانو، فہد صبح

یونیورسٹی کے لئے نکلے گا تو اسی کے ساتھ آ جاؤں گی، ہم ناشتہ ایک ساتھ ہی کریں گے انشاءاللہ، پھر مل کر لان میں نئے پودے لگائیں گے، صبح کا اخبار بھی میں ہی آپ کو پڑھ کر سناؤں گی۔''

اچانک آ پڑنے والے جدائی کے وقفے نے اسے اچھا خاصا افسردہ کیا تھا، وہ کچھ یوں خدا حافظ کہہ رہی تھی جیسے پردیس جانے والے ائرپورٹ پر اپنے پیاروں سے ملتے ہیں، خدیجہ بیگم نے خوب انجوائے کیا۔

''اچھا اب جاؤ، آمنہ انتظار کر رہی ہو گی۔''

''دیکھنا نانو، ان چچا چچی کو ایسی جلی روٹیاں کھلاؤں گی کہ آئندہ کسی دعوت کا نام نہیں لیں گے۔'' اس نے دانت کچکچا کر غصہ نکالا تو عظمت بوا نے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا۔

''جاؤ بھاگو اب۔'' خدیجہ بیگم نے ہنستے ہوئے اسے زبردستی دھکیلا، مبین نے گاڑی اسٹارٹ کی تو ساتھ ہی پلیئر بھی آن ہو گیا۔

میں تو تم سنگ نین ملا کے
ہار گئی سجناں ہار گئی سجناں

لتا کی مدھر آواز میں شاید پچاس کی دہائی کا گانا بجا تھا، ارما کو کافی سنا سنا سا لگا، بول ہی عجیب سا فسوں طاری کر رہے تھے، اس نے بے ساختہ مبین کو دیکھا جس کی مکمل توجہ پیچھے گیٹ کی طرف تھی، وہ پورچ سے گیٹ کی طرف ریورس میں گاڑی چلا رہا تھا، اس لئے سارا دھیان اسی جانب تھا جبکہ ارما کا گانے کی طرف، جس کے بول اور دھن بری طرح حواسوں پر چھا رہی تھی۔

نہ ملتیں یہ بیرن اکھیاں
چین نہ جاتا دل کبھی نہ روتا
کاش کسی سے پیار نہ ہوتا
میں تو تم ....

ٹک کی آواز آئی اور گانا بند، ارما نے چونک کر دیکھا، گاڑی گیٹ سے نکال کر سڑک پر لاتے ہی مبین نے پلیئر آف کر دیا تھا، وہ باہر دیکھنے لگی۔

''اتنا اچھا گانا تھا، بدتمیز نہ ہو تو۔''

تقریباً آدھا راستہ طے ہو چکا تھا لیکن وہ خاموشی سے محض گاڑی چلانے میں مصروف تھا، پتہ نہیں کیوں ارما کو اس کی سنجیدگی سے اچھی خاصی سبکی محسوس ہو رہی تھی۔

''اس سے اچھا تھا فرید کے ساتھ چلی آتی، لیکن نانو کو بھی سوائے اس کے کسی پر بھروسا نہیں ہوتا اور یہ...... کبھی تو کتنے دوستانہ طریقے سے بات کرتا ہے اور کبھی ایسا بدتمیز اور بدمزاج، لیکن مجھے کیا، میری بلا سے ساری زندگی بات نہ کرے۔'' وہ پوری طرح کھڑکی کے پار متوجہ ہونے کی کوشش کرنے لگی۔

''لیکن یہ ایسا کیوں کر رہا ہے، آنکھوں پر کالا چشمہ لگا کر اور بھی اجنبی لگ رہا ہے، جب بندے کی آنکھیں نظر نہیں آتیں، کیسی بے گانگی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اس کی آنکھیں تو اف، کتنا بولتی ہیں، کیوں ایسے دیکھتا ہے جیسے برسوں سے آشنا ہو، کوئی پرانا ہمدم اور رفیق، دل کے ہر تار سے آگاہ، سب کچھ معلوم ہونے کا دعویٰ کرتی مبہم مسکراہٹ اور بھرپور اپنائیت کا اظہار کرتیں گہری بادامی آنکھیں۔'' وہ اسی سے ناراض مسلسل اسی سے دل ہی دل میں ہمکلام تھی۔

''مجھے آپ کا گھر نہیں معلوم، سوری۔'' وہ بالکل ہی اچانک بولا تھا، ارما نے بوکھلا کر سر گھمایا۔

''جی......؟''

''خدیجہ آنٹی نے کہا تھا آپ سیکٹر ایف میں رہتی ہیں جو کہ غالباً شروع ہو چکا ہے۔''

''او اچھا۔'' ارما سیدھی ہوئی۔

''فی الحال سامنے ہی جانا ہے، آگے میں بتاتی رہوں گی۔'' وہ ذہنی دھارے کو نارمل کرنے میں قدرے کامیاب ہوگئی تھی۔

''گاڑی تو آپ بھی چلا لیتیں ہیں ناں؟'' پہلا باقاعدہ اضافی جملہ جو اس پورے سفر میں مبین کے لبوں سے ادا ہوا تھا، لیکن ارما کو نری بے عزتی معلوم ہوا، یعنی توڑ موڑ کر کہا گیا کہ جب خود ڈرائیو کر سکتی ہو تو مجھے کیوں تکلیف میں ڈالا۔

''گاڑی چلانا تو آتی ہے لیکن ابو اور نانو وغیرہ اکیلے کہیں آنا جانا الاوڈ نہیں کرتے، ویسے میں تو فرید بھائی کے ساتھ آنا چاہ رہی تھی لیکن آج وہ چھٹی پر ہیں۔'' لگے ہاتھوں وضاحت بھی کر دی، مبین مسکراہٹ پر قابو پانے میں ناکام رہا لیکن شکر ہے وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی، یقیناً وہ اس کے روڈلی ہیویئر پر خوب خفا تھی، یہ نامعلوم روکھا پن اس کی سمجھ سے باہر تھا، لیکن مبین مجبور تھا، خود پر عائد کی پابندیاں اتنی سخت تھیں کہ لاکھ چاہنے پر بھی وہ اس خوبصورت ڈرائیو سے نہ خود محظوظ ہو سکا اور نہ ارما کی جلتی بجھتی امید کی لو کو بڑھا سکا، بے دردی سے بس یہی سوچ پایا۔

''کاش آج یہ ناامیدی مکمل مایوسی میں تبدیل ہو جائے اور ارما اس کی طرف لپکتے اپنے دل کو بے اختیار ہونے سے بچالے۔''

پہلا لیفٹ ٹرن لینے پر جلد ہی اس کا گھر آ گیا، گاڑی سلور گیٹ کے سامنے رکی تو ارما نے ازراہ مروت سے اسے دیکھا۔

''آپ بھی آیئے۔''

''جی نہیں شکریہ، گھر جا کر آرام کروں گا۔'' وہ بلاوجہ سی ڈیز پلٹنے لگا۔

''بے وقت زحمت دینے پر معذرت چاہتی ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے ارما، اٹس اوکے۔''

''ضرورت تو ہے ناں۔'' ارما نے گہری سنجیدگی سے کہا تو پہلی مرتبہ مبین نے اسے سر اٹھا کر دیکھا۔

''آپ نانو کے ہاں مہمان ہیں، یہ زحمت سراسر زیادتی ہی تو ہے۔'' وہ بنا جواب سنے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھ گئی اور مبین نے ایک گہری سانس لے کر گاڑی آگے بڑھا دی، پلییئر ایک مرتبہ پھر خود بخود آن ہو گیا۔

کیوں جھوٹے سے پریت لگائی
کیوں چھلیے کو میت بنایا
کیوں آندھی میں دیپ جلایا
میں تو تم سنگ نین ملا کہ ہار گئی سجناں

☆☆☆

''ابو کو اتنا مہربان بھی نہیں ہونا چاہیے، آخر کو دادا ابا ان سے خفا ہو کر دنیا سے گئے ہیں۔'' ارما نے پاس بیٹھی صبا سے سرگوشی کی۔

''ہاں لیکن اب تو صلح ہو گئی ہے۔'' صبا کو اس کا اعتراض پسند نہیں آیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ابو کچھ ایسے شو کر رہے ہیں جیسے ہم صلح کرنے کے لئے مرے جا رہے تھے، بھئی ایک فاصلہ قائم رہنا چاہیے کم از کم شروع شروع میں۔'' ارما کی سوئی اٹکی تھی ان بے جا نازنخروں پر، ابھی شام کو ہی محسن چچا، رابعہ چچی اور سعد ان کے ہاں آئے تھے، وہ تو اچھا ہو کہ فہد اسے کھانے کے بعد اپنے کمرے میں لے گیا تھا اور ذرا دیر کو نجات مل گئی تھی وفور شوق لٹاتی نگاہوں سے، جو سراسر اسے الجھن اور کوفت میں مبتلا کرتی تھیں۔

گھر میں کچھ دنوں سے اس کی اور سعد کی شادی کی باتیں ہونے لگی تھیں، جنہیں سن کر وہ خوب چڑ جاتی تھی، اس رات بھی مہمانوں کے

جانے کے بعد صبا نے باقاعدہ سعد کا نام لے کر اسے چھیڑا تو وہ بری طرح خفا ہو گئی آمنہ نے دونوں کو بحث کرتے ہوئے تو قریب آ گئیں۔

''اتنا غصہ اچھا نہیں ہے ارما، کیا برائی ہے سعد میں؟''

''امی مجھے وہ بالکل پسند نہیں ہے نہ ہی میں نے اس انداز میں کبھی سوچا ہے سعد کے بارے میں۔''

''تو اب سوچ لو چندا، تمہارے ابو سعد سے تمہاری شادی کا پکا ارادہ کر چکے ہیں، شاید انہیں تمہارا انکار پسند نہ آئے۔''

''تو کیا وہ میری رائے کو اہمیت نہیں دے گے۔''

''شاید نہیں۔'' آمنہ نے دوٹوک جواب دینا مناسب سمجھا۔

''تمہارے چچا کا اسٹیٹس ہم سے کہیں اونچا ہے، پھر سعد کا عہدہ، نام، میں نے دیکھ لیا ہے، تمہارے باپ کو آج کل سوائے سعد کے کچھ بجھائی نہیں دے رہا لیکن خیر...... اگر وہ ایسا سوچتا ہے تو تمہارا ہی اس میں بھلا ہے، بچوں کے اچھے مستقبل کی فکر کرنا ہر ماں باپ کا فرض ہے، پھر ایسی بھی کیا برائی ہے سعد میں۔'' وہ سمجھانے کے انداز میں اس پر ہر پہلو واضح کر گئیں۔

''لیکن امی! وہ کچھ عجیب سا ہے، کوئی بات ہے جو مجھے کھٹکتی ہے۔'' اسے کچھ یاد آنے لگا۔

''بس زیادہ مت سوچو، اللہ پاک اچھا ہی کرے گا انشاء اللہ۔'' وہ اسے تسلی دیتی اٹھ گئیں۔

☆☆☆

''ارے واہ بوا! بڑی خوشبو آ رہی ہے، آج کچھ خاص اہتمام ہے ناشتے میں؟'' وہ فریش ہو کر سیدھی کچن میں آ گئی۔

''اٹھ گئیں بیٹا!'' بوا نے اپنی پرشفقت مسکراہٹ سے نوازا۔

''منصور آیا ہے ناں اس لئے۔''

''اچھا...... ماموں آئے ہیں۔'' وہ چہکی۔

''کس وقت پہنچے، ابھی کہاں ہیں؟''

''رات کافی لیٹ پہنچا تھا، تم شاید سو چکی تھیں، ابھی جاگا ہے تو بی بی نے کہا ناشتہ بنانا شروع کر دوں۔''

''لائیں میں بھی آپ کی مدد کر دیتی ہوں۔'' وہ فوراً آگے بڑھی، بوا اچھے خاصے اہتمام کے موڈ میں تھیں، اکیلے کام نمٹانا یقیناً بہت مشکل تھا۔

''پھر دو دن کے لئے آئے ہو، اتنی ساری لڑکیاں دیکھ رکھی ہیں آمنہ اور نفیسہ نے، جانے کب کوئی فائنل ہوگی۔'' خدیجہ بیگم نے شکوہ بھری نگاہ منصور پر ڈالی، ارما تھرماس رکھ کر خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔

''آپ بھی ناں اماں۔'' وہ بری طرح جھینپ گیا۔

''اتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں آپ جسے چاہیں پسند کر لیں، مجھے منظور ہوگا، لیکن پلیز مجھ پر نہ ڈالا کریں۔''

''جس طرح دو ملاؤں میں مرغی حلال نہیں ہوتی، یہی حال تمہاری بہنوں کا ہے، ایک لڑکی آمنہ کو پسند آتی ہے تو نفیسہ بیگم منہ بنانے لگتی ہیں اور جو اسے اچھی لگتی ہے اس پر آمنہ کو اعتراض ہوتا ہے، اچھا ہو کہ تم خود کسی کو فائنل کر دو، کم از کم کہیں بات تو طے ہو۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' اس نے نرمی سے ماں کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔

''آج تو آپ کو چیک اپ کے لئے لے جانا ہے ناں، کل دیکھتے ہیں انشاءاللہ۔''

"ہاں بس ٹالتے رہو اسی طرح۔" وہ خفا خفا سی پلیٹ پر جھک گئیں۔
"آپ فکر نہ کریں نانو، اس مرتبہ میں اور فریال بھی میدان میں اتر آئی ہیں، فریال کہتی ہے ہماری ماؤں سے کچھ ہونے والا نہیں، اب ہمیں ہی کچھ کرنا ہوگا۔"
"ہاں بس تمہاری کمی تھی۔" منصور نے چڑایا تو وہ ہنس پڑی۔
"مبین کہاں ہے اماں، ہمارے ساتھ ناشتے میں شامل ہوتا۔" منصور کو اچانک خیال آیا۔
"ارے بہت لاپرواہ ہے کھانے کے معاملے میں، کچن میں کھڑے کھڑے دو گھونٹ چائے پی کر چل پڑتا ہے، ابھی نیچے آنے والا ہے تم ہی سمجھاؤ ذرا۔" وہ اسے بتانے لگیں اور ارما اپنا کپ لئے وہاں سے اٹھ گئی، جانے کیوں مبین کے نام پر محسوسات بہت عجیب ہونے لگتی تھیں۔

☆☆☆

"اُف میرے خدا، جانے کیا سوچتی رہتی ہے یہ لڑکی، سر پر دھوپ پڑ رہی ہے لیکن اسے کچھ ہوش ہی نہیں۔" تھوڑی دیر پہلے ہی منصور سے فون پر اس کی بات ہوئی تھی، وہ خدیجہ حیات کو لے کر ہاسپٹل گئے ہوئے تھے، مبین کو معلوم تھا کہ گھر پر اس وقت ارما اور بوا اکیلی ہیں، لیکن پہلی حیرت اسے کھلا گیٹ دیکھ کر ہوئی، اس نے گیٹ بند کیا تب بھی ارما کو خبر نہیں ہوئی، مبین نے ہاتھ میں پکڑی فائلز پورچ میں رکھے بڑے گملے کے کنارے پر ٹکائیں اور لان میں داخل ہو گیا محترمہ تب بھی بے خبر تھیں۔
"آپ ٹھیک تو ہیں؟" اس نے قدرے جھک کر بات کا آغاز کیا تو ارما حقیقتاً بوکھلا کر اٹھی۔

"ج...... جی...... السلام علیکم!" اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔
"وعلیکم السلام! منصور بھائی وغیرہ تو کافی دیر ہوئی چلے گئے ہیں آپ نے گیٹ بھی بند نہیں کیا۔"
"بس خیال نہیں آیا۔" وہ شرمندہ سی نیچے دیکھنے لگی، مبین نے سنجیدگی سے کچھ دیر بغور اس کی کیفیت کا جائزہ لیا۔
"بیٹھ جائیں۔" وہ بے تکلفی سے کہہ کر خود بھی سامنے رکھی چیئر پر بیٹھ گیا، ارما بھی کسی معمول کی طرح سامنے ٹک گئی۔
"سوچ بچار شروع سے آپ کی عادت ہے یا آج کل ذرا زیادہ۔" وہ پہلی مرتبہ مسکرایا لیکن ارما خاموش رہی، اس کی جھجک بجا تھی لیکن مبین کا سوال بھی غلط نہیں تھا، بھلے وہ اس سے بے تکلف نہیں تھا بلکہ کچھ دنوں سے تکلف کی اس دیوار کو مزید اونچا کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا لیکن اگر وہ واقعی پریشان تھی تو یہ بھی مبین کی برداشت سے باہر کی بات تھی کہ چپکے چپکے اسے جلنے کڑھنے دیتا، پھر وجہ بھی نامعلوم۔
"ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں مگن رہنے والی پیاری سی لڑکی اب جانے خلاؤں میں کیا ڈھونڈ رہی تھی۔" مبین نے بہت سنبھل کر جملے کا انتخاب کیا۔
"آپ کسی الجھن میں لگتی ہیں، برا نہ مانیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ کیوں پریشان ہیں؟"
"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" وہ چونک گئی۔
"آپ کے چہرے پہ لکھا ہے۔"
"آپ کو چہرے پڑھنا آتا ہے؟" اب کے اس نے حیرت سے دیکھا۔

"پتہ نہیں، لیکن آپ کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے۔" وہ رکا۔
"جیسے آپ کنفیوژ ہیں۔"
"اچھا۔" وہ پھیکا سا ہنسی اب اور کہتی بھی کیا۔
"میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اپنی سوچوں کو آزاد چھوڑ دیں، ذہن پرسکون ہوگا تو حل خود بخود نکلتے آئیں گے۔" وہ روانی سے بولے گیا تو ارما ایک بار پھر حیران ہوگئی۔
"تو کیا آپ کو یہ بھی پتہ ہے کہ میں کیوں پریشان ہوں۔"
"اوہ نہیں۔" مبین بے ساختہ ہنسا۔
"پتہ ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتا، ویسے بھی مجھے تو لگتا ہے، ابھی آپ پر بھی یہ واضح نہیں کہ آپ کیوں الجھن میں ہیں، پہلے آپ تو سمجھیں اپنے دل کی بات مجھ تک پہنچتے تو وقت لگے گا۔" اس بار مبین نے سنجیدگی سے وضاحت کی تو جانے کیوں ارما کی پلکیں پانی سے بوجھل ہو گئیں، سامنے بیٹھا شخص اسے یوں اس کے بارے میں بتا رہا تھا جیسے کتاب کھلی ہو، اس نے بہت بے بسی محسوس کی جبکہ مبین اس کی بھیگی پلکیں دیکھ کر ازحد گھبرا گیا۔
"سوری، اگر میری کسی بات سے آپ کا دل دکھا ہو، میں تو صرف یہ چاہ رہا تھا کہ......" الفاظ اس کے منہ میں رہ گئے، ارما ہتھیلیوں میں چہرا دے کر اور بھی شدت سے رونے لگی۔
"ارے پلیز...... روئیں تو مت۔" مبین نے چہرے پہ رکھے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ سے ہٹانا چاہا تو وہ جھٹ پیچھے کو ہوئی اور خود ہی اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں، اس کی عجلت پر مبین کو ہنسی آ گئی۔
"چلو، اگر اس برسات کو روکنے کا یہی طریقہ تھا تو میں پہلے ہی ہاتھ بڑھا دیتا۔" جانے کیا سوچ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"تھوڑی واک کر لیں؟" مبین نے تائید چاہی لیکن وہ یونہی بیٹھی رہی۔
"آئیں بھئی۔" بالکل ہی بے ساختہ اس نے ہاتھ آگے کیا اور ارما فوراً کھڑی ہوگئی۔
"آپ سے بات منوانا تو بڑا ہی آسان ہے، یعنی جب بھی آپ بات نہ مانیں تو آپ کی طرف ہاتھ بڑھا دوں۔" وہ ہنسے ہی گیا اور اس بار ارما بھی اپنی ہنسی نہ روک سکی، مبین کا مقصد بھی اس کی ذہنی رو تبدیل کرنا تھا، دونوں کچھ دور تک خاموشی سے چلتے چلے گئے۔
"تو...... موسم کی بات کریں؟" مبین نے خاموشی توڑی۔
"سنا ہے جب بولنے کو کچھ باقی نہیں رہتا تو بندہ موسم کی بات کرتا ہے۔" ارما نے ہلکا سا طنز کیا تو مبین نے ہنس کر تائید کی۔
"تو ایک سنجیدہ بات پوچھوں؟" اس نے اجازت طلب نظروں سے دیکھا تو جواباً وہ چپ ہی رہی۔
"ابھی روئی کیوں تھیں آپ......؟"
"وہ تو......" ارما گڑبڑا گئی۔
"بس آپ مجھے میرے بارے میں ایسے بتانے لگے جیسے سب جانتے ہوں تو۔"
"تو آپ کو رونا آ گیا۔" اس نے شرارت سے جملہ جوڑا تو ارما کو ہنسی آ گئی۔
"نہیں، مجھے ویسے ہی رونا ذرا جلدی آتا ہے۔"
"بڑی ہی لڑکیوں والی عادت ہے۔" وہ بے ساختہ بولا تو ارما مسکرا دی۔
"میں آپ سے ایک بات پوچھوں۔"
"جی جی سو باتیں پوچھیں۔"

''آپ اس رات کچھ کہتے کہتے رک گئے تھے جب ہم شادی پر جا رہے تھے۔''

''او۔'' مبین کچھ سوچنے کے لئے رکا۔

''ایسی کوئی اہم بات نہیں تھی مجھے بھی اب ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔'' اس نے صاف ٹالنے کی کوشش کی۔

''پھر تو موسم کا ٹاپک ہی ٹھیک تھا۔'' ارما نے رکھائی سے کہا تو مبین سمجھ گیا وہ برا مان گئی ہے۔

''ارما یہ جو ہم اس وقت ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، آپس میں باتیں کر رہے ہیں، یہ اس اعتماد اور بھروسے کا ثبوت ہے جو آپ کی فیملی والے مجھ پر کرتے ہیں، پھر بھی میں مانتا ہوں مجھ سے کچھ کوتاہیاں ہوئی ہیں جنہیں سدھارنے کی میں پوری کوشش کر رہا ہوں، میرا مشورہ ہے اگر کچھ باتیں دل میں رہ جائیں تو بہتر ہوگا۔''

''یعنی کوئی بات تو ہے۔'' وہ بے ساختہ کہہ بیٹھی۔

''آپ جانتی ہیں یا جاننا چاہتی ہیں۔'' مبین مسکرایا تو ارما لاجواب ہو گئی کیونکہ وہ جانتی بھی تھی اور جاننا چاہتی بھی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے، آپ کچھ پوچھنا چاہتی ہیں تو آپ کو اجازت ہے، میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ آپ میری وجہ سے کسی پریشانی کا شکار رہیں، اگر آپ میری وجہ سے آج روئی ہیں تو میرے لئے بہت تکلیف کی بات ہے۔''

''نہیں میرے رونے کا تعلق آپ سے نہیں ہے، بس آج کل میرے حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں۔'' وہ حد درجہ افسردہ تھی مبین کے دل کو کچھ ہوا تھا، ارما ضرور کسی بڑی الجھن میں تھی اور وہ جانے کیا کچھ بول گیا تھا۔

''آپ پلیز کھل کر بتائیں، شاید میں آپ کے کسی کام آسکوں، کبھی کبھی اپنوں کی نسبت کسی غیر سے مشورہ کر لینا زیادہ بہتر ہوتا ہے، آپ یقیناً مجھے ایک مخلص دوست پائیں گی۔'' اس لمحے سادگی سے مشورہ دیتا وہ اسے غیر تو ہرگز نہیں لگا، دل جانے کیا کچھ کہنے کو مچل اٹھا لیکن ہوا تو بس یہ کہ اس نے معاملے کے ایک پہلو یعنی آدھی بات پر اکتفا کرتے ہوئے اپنی الجھن شیئر کرنے کا فیصلہ کیا اور مبین تو تھا ہی ہمہ تن گوش۔

''میرے چچا زاد ہیں سعد اللہ، نیورو سرجن ہیں، ان لوگوں سے ہمارے تعلقات کئی سالوں بعد اب بحال ہوئے ہیں، اس سے پہلے ہم ایک دوسرے کو صورت سے بھی نہیں پہچانتے تھے، میرے دادا ابو نے محسن چچا کو پسند کی شادی کی وجہ سے عاق کیا تھا اور مرتے دم تک معاف نہیں کیا، اس لئے بڑا ہونے تک ہم کبھی آپس میں ملے نہیں تھے لیکن ابھی سال بھر پہلے دادا ابا کی وفات کے بعد ابو اور چچا میں صلح ہو گئی اور ہمارا آنا جانا شروع ہو گیا۔'' وہ ذرا دیر کو رکی۔

''ہوں...... ہوں۔'' وہ پوری توجہ سے سن رہا تھا۔

''وہ لوگ دو مرتبہ ہمارے گھر آئے لیکن میں چونکہ یہاں تھی تو ان سب سے مل نہیں پائی، اس روز میری دوست عصمہ کی شادی میں میرا پہلی بار سعد اللہ سے ملنا ہوا۔''

''وہی دوست جس کی شادی میں آپ میرے ساتھ گئے تھے۔'' وہ چونکا۔

''جی اسی رات کی بات ہے، میرے لئے اس روز کی اتفاقی ملاقات بہت خاص تھی، ہمارے گھرانے برسوں ایک دوسرے سے دور رہے ہیں، باقی سب کی طرح میری بھی یہی خواہش تھی کہ ہمارے گھروں کا آپس میں ملنا جلنا پھر سے شروع ہو جائے، میں سعد سے پہلے

تعارف کے لئے بہت بے چین تھی، لیکن مجھے حیرت ہوئی یہ جان کر کہ سعد بھی مجھ سے ملنا چاہتا تھا، اس کی طرف سے جو رسپانس مجھے ملا وہ میری توقع سے بڑھ کر تھا۔'' وہ ذرا دیر کو رکی اور دھیان سے اس کی بات سنتے مبین کو لگا کہ ارما کی الجھن حل ہوتے شاید اس کی پریشانیوں میں اضافہ ہونے والا ہے۔

''کیا اس رات کے بعد دوبارہ ان سے ملنا ہوا۔'' وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''جی دو تین مرتبہ ہم پھر بھی ملے ہیں اور۔'' وہ اٹک کر رکی۔

''اور......؟''

''اور ہر مرتبہ اس کی بے تابی میں اضافہ ہی دیکھا۔'' بالآخر اس نے کہہ دیا۔

''تو آپ پریشان کیوں ہیں، ان سب باتوں سے تو آپ کے لئے خوشی کے پہلو نکلتے ہیں۔'' اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

''میں بھی خوش تو بہت ہوں لیکن......''

الفاظ اس کے منہ میں رہ گئے، کیونکہ مبین کا موبائل فون بجنے لگا تھا، وہ کال اٹینڈ کر کے معذرت کرتا تھوڑا دور چلا گیا اور جب تک وہ واپس آیا بوا چائے لے کر لان میں آ گئی تھیں، مبین خاموشی سے اپنا کپ لے کر اندر کی طرف بڑھ گیا اور وہ اپنے کپ سے اٹھتے دھوئیں کو دیکھتے ہوئے یہی سوچ گئی کہ جو کہنا تھا وہ تو دل میں رہ گیا اور جو کہہ دیا وہ اپنے معنی اور مفہوم کے حوالے سے یقیناً کچھ سے کچھ ہو گیا تھا، مبین اب سعد کے لئے اس کے جذبات کے متعلق کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب تھا۔

☆☆☆

''ہیلو۔'' وہ ریموٹ لے کر چینلو تبدیل کرنے بیٹھی ہی تھی کہ فون کی بیل بجی۔

''اوہو تو سویٹ کزن آج گھر پر ہیں۔'' بے تکلف شوخ لہجے پر پہلے تو ارما خوب چونکی لیکن پھر سمجھ گئی کہ مخاطب کون ہے۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام! بھئی بڑا نیک شگون ہے، اب تو میری آواز بھی پہچاننے لگی ہو۔'' سعد نے بھی بھرپور شوخی سے کہا۔

''آپ نے مجھے کزن کہا، اس لئے پہچان گئی، ہمارے بس چند ہی گنے چنے کزنز ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اتنا فرینک نہیں۔'' ارما نے صاف گوئی سے واضح کیا۔

''چلو خیر، یہ بتاؤ، آج شام کو ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''ڈنر......؟'' ارما نے زیر لب دہرایا۔

''باقی سب سے پوچھ کر بتاتی ہوں۔''

''باقی سب کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے؟ صرف تم اور میں چلیں گے۔''

''جی......؟'' ارما حقیقی حیرت سے چلائی۔

''آہستہ یار، ڈنر پر ہی لے جا رہا ہوں، کے ٹو پر تو نہیں۔'' وہ اس کی حیرت پر بھرپور انداز میں ہنسا۔

''خیر تم سات بجے ریڈی رہنا، میں تمہیں گھر سے پک کروں گا۔''

''لیکن ایسے کیسے۔'' وہ بوکھلا گئی۔

''مجھے سب سے پوچھ لینے دیں، ابو کیا سوچیں گے۔''

''ابو جو سوچیں گے مجھے پہلے سے پتہ ہے۔'' وہ عجیب انداز میں ہنسا اور فون بند کر دیا۔

ارما نے امی کو بتایا اور ساتھ ہی اپنے نہ جانے کا عندیہ بھی دے دیا، وہ تو چپ ہو گئیں لیکن اعظم حسن نے گھر آتے ہی آمنہ سے کہا کہ شام کو ارما تیار رہے، سعد اسے باہر لے جائے گا،

آمنہ نے کہنے کی کوشش بھی کی کہ دونوں کا اکیلے جانا مناسب نہیں لگتا لیکن اعظم نے یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ وہ ان دونوں کی شادی کے لئے سیریس ہیں۔

''اچھا ہے اگر پہلے تھوڑی انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے۔'' ارما نے سنا تو بہت ناراض ہوئی لیکن آمنہ نے ہاتھ جوڑ کر اسے چپ رہنے کا کہا۔

''پلیز آج انکار مت کرو، پھر تمہارا کزن ہی تو ہے، ڈنر کر لینے میں کیا حرج ہے، شادی کی بحث کو آئندہ پر چھوڑ دو پلیز۔'' انہوں نے منت بھرے لہجے میں کہا تو ارما نے اثبات میں سر ہلا کر ماں کے دونوں ہاتھ تھامے۔

''اوکے آپ پریشان نہ ہوں، میں تیار ہوتی ہوں۔'' وہ جانتی تھی کہ مزید ضد کی تو ابو، امی سے جھگڑا کریں گے، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے بلاوجہ امی کو باتیں سننی پڑیں۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بے مقصد سڑکوں پر گاڑی گھماتے سعد اللہ نے ڈھیروں ڈھیر باتیں کی تھیں، ارما کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ بنا اس کے رسپانس کی پرواہ کیے نہایت رومانٹک گفتگو کیے جا رہا تھا، حالانکہ صاف دیکھ رہا تھا کہ ارما ہرگز اس کی طرف ملتفت نہیں ہے، پھر بھی اس کی چھیڑ چھاڑ اور معنی خیز جملے بازی جاری تھی۔

ریسٹورنٹ پہنچنے تک ارما نے ٹھان لیا کہ اب چپ رہ کر سعد اللہ کو مزید بڑھاوا نہیں دے گی، اس لئے خود ہی بولنا شروع کر دیا، کھانے کے دوران اس نے سعد اللہ کے پروفیشن سے لے کر سیاست تک ہر بورنگ ٹاپک پر مسلسل اس کا سر کھایا اور سعد اللہ کے پاس سوائے اس کے سوالوں کے جواب دینے کے کوئی راستہ نہیں چھوڑا، واپسی کے سفر میں بھی وہی بولتی رہی، بالآخر سعد نے کہہ ہی دیا۔

''تم اپنی عمر سے تیس سال بڑوں والی گفتگو کرتی ہو، ذرا اپنے مزاج میں شوخی اور رنگینی پیدا کرو، جیسے باقی لڑکیاں ہوتی ہیں۔''

''او تو آپ کو ایسی لڑکیاں پسند ہیں۔'' ارما نے بھنویں اٹھائیں۔

''بھئی لڑکیاں تو شرارتی، لاپرواہ اور چنچل ہی اچھی لگتی ہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''چلیں اللہ کرے آپ کو آپ کی پسند کے مطابق ایسی ہی پارٹنر ملے۔'' ارما نے گاڑی کے دروازہ کھولتے ہوئے دعا کے انداز میں کہا۔

''محبت بھی تو کروں گا۔'' وہ ایک ادا سے بولا۔

''یعنی جذباتی بلیک میلنگ۔'' ارما نے بے ساختہ کہہ کر بغور اس کی طرف دیکھا تو سعد نے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''تمہیں اچھی لگے گی یہ جذباتی بلیک میلنگ۔''

''میں اپنی بات نہیں کر رہی تھی۔'' وہ ایکدم نروس ہو گئی اور بنا مزید کچھ کہے باہر نکل آئی۔

''یہ تو بہت بدتمیز ہے۔'' وہ تیز دھڑکنوں پر قابو پاتے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

گھر والے جتنا اسے سعد کے قریب لانے کی کوشش کر رہے تھے خصوصاً ابو، وہ اتنا اس سے دور بھاگ رہی تھی اور جتنا زیادہ وہ ان دنوں مبین کے متعلق سوچ رہی تھی اتنا وہ ریزرو ہو رہا تھا، دو روز پہلے اس نے نانی امی سے بات کرنے کے لئے فون کیا تو کال مبین نے اٹینڈ کی، ارما نے کافی خوشدلی سے سلام دعا کا آغاز کیا، مبین نے آگے سے صرف اتنا کہا۔

''ایک منٹ میں ابھی آنٹی کو بلاتا ہوں۔''

ارما حیرت سے ریسیور کو دیکھے گئی۔

''ہو سکتا ہے مصروف ہو، یا کہیں جانے کی

جلدی ہو، لیکن وہ ایسا تو نہیں کرتا پتہ نہیں۔'' وہ اسی سوچ میں گم تھی جب نانو امی آ گئیں، ارما نے ان سے وعدہ کیا کہ دو تین روز تک چکر لگائے گی۔

☆☆☆

''السلام علیکم نانو امی!''

''آؤ بھئی وعلیکم السلام! صبح سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔'' نانی امی نے پیار سے اس کی پیشانی چوم کر پاس بٹھایا۔

''ابھی یہی بات عظمت سے کر رہی تھی کہ ان دونوں نے میری عادتیں بگاڑ دی ہیں اب تم یا فریال نہ ہوں گھر میں تو مجھے مزا نہیں آتا۔''

''کھانا لگاؤں ارما بیٹی!'' بوا اٹھنے لگیں۔

''نہیں بوا! اتنے جلدی تو بالکل نہیں، فی الحال چائے پینے کا موڈ ہے اور میں خود ہی بناؤں گی۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ دونوں بھی لیں گی ناں؟''

''ہاں بنا لو، کھانا ہم بھی لیٹ ہی کھائیں گے، فی الحال نماز پڑھ لیں۔'' بوا نے دو جائے نماز سامنے پھیلائیں، ارما کچن میں آ گئی، ابھی کیتلی چولہے پر رکھی ہی تھی کہ گھر مکمل اندھیرے میں ڈوب گیا۔

''اوہ۔'' ارما نے ہونٹ سکیڑے۔

یقیناً لائٹ کافی دیر سے نہیں تھی اور یو پی ایس کام کر رہا تھا اور اب وہ بھی کام چھوڑ گیا تھا، اس نے ماچس جلا کر ایمرجنسی لائٹ چیک کی لیکن وہ بھی چارج نہیں تھی، ارما نے موم بتی جلا کر پہلے نانو کے کمرے میں رکھی اور واپس آ کر دوسری اپنے لئے جلائی، اسی وقت مبین کچن کے دروازے میں آیا، ارما نے سیدھا ہوتے ہوئے سلام جھاڑا۔

''وعلیکم السلام! ایک کینڈل چاہیے اگر ہو تو۔'' عجلت بھرا سنجیدہ لہجہ۔

''جی ہے۔'' ارما نے فوراً ماچس اور کینڈل اس کی طرف بڑھائے۔

''آپ چائے پئیں گے؟'' اس نے مڑ کر جاتے مبین سے سوال کیا۔

''ہوں۔'' مبین نے کچھ دیر سوچا۔

''سب کے لئے بن رہی ہے تو ٹھیک ہے۔''

''اوکے پھر میں اوپر ہی لے آتی ہوں، بس پانچ منٹ۔''

''اوپر آنے کی زحمت نہ اٹھائیں، پانچ منٹ کی بات ہے تو میں باہر ویٹ کر لیتا ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے کہہ کر باہر نکل گیا اور ارما اس کو دیکھ کر مسکرا دی۔

''تو جناب ریزرو ہی نہیں ناراض بھی ہیں، خود کو ٹرائی اینگل کا تیسرا کونا سمجھ کر پکچر سے نکلنے کی عملی کوشش کر رہے ہیں۔'' ارما جان گئی کہ اس روز کی ملاقات میں آخری جملے سے مبین نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہو گا، جس کا مظاہرہ اس کے سرد رویے سے صاف جھلک رہا تھا، اس کا رہا سہا شک بھی دور ہو گیا، ہنسی روک کر وہ چند قدم آگے آئی۔

''باہر کافی اندھیرا ہے آپ یہاں اندر بیٹھ جائیں۔''

''ہوں۔'' وہ بنا مزید کچھ کہے اندر کی چھوٹی ٹیبل کے ساتھ بیٹھ گیا، چائے تیار تھی ارما نے پہلے دو کپ نانو اور بوا کے لئے ٹرے میں رکھے اور دروازے کی طرف بڑھی۔

''میں بس ابھی آئی۔''

ان دونوں کی چائے کمرے میں رکھ کر وہ فوراً واپس پلٹی، ارما نہیں چاہتی تھی کہ نماز سے فارغ ہو کر بوا اس کے پیچھے کچن میں آ جائیں،

تکتے جگ بیت گئے

شگفتہ شاہ

لان کی ادھوری بات کو پورا کرنے کا یہی سب سے مناسب موقع تھا جسے وہ ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی، ارما اپنا اور مبین کا کپ لے کر ٹیبل کے قریب آئی، وہ سامنے رکھی کینڈل کے پگھلتے قطروں سے کھیل رہا تھا۔

''آپ کو اعتراض نہ ہو تو کیا ہم یہیں بیٹھ کر چائے پی سکتے ہیں؟'' ارما نے اجازت طلب انداز میں پوچھا تو مبین نے محض سر ہلا دیا، ارما نے ٹرے سامنے رکھی اور چیئر پر بیٹھ گئی، مبین نے خاموشی سے کپ لبوں سے لگایا، ارما نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا جو بالکل اس کی جانب متوجہ نہیں تھا یا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''چہرہ پڑھنے کے لئے کینڈل کی روشنی کافی ہوگی؟''

''جی؟'' مبین نے چونک کر سر اٹھایا۔

''جاننا چاہتی ہوں اب وہ کنفیوژن دور ہوئی۔''

''میرے کہنے کا اتنا یقین ہے آپ کو؟'' اس نے نظریں ہنوز کپ پر جما رکھی تھیں۔

''چہرہ پڑھنے کی حد تک تو ہے۔'' وہ ہلکا سا مسکرائی۔

''یعنی؟'' وہ قطعاً نہیں سمجھا۔

''میرا خیال ہے چہرے تو آپ ٹھیک ٹھیک پڑھ لیتے ہیں لیکن اندازے لگانے میں غلطی کر جاتے ہیں۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟'' وہ حیران ہوا۔

''چلیں اس پر بعد میں بحث کرتیں گے، پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیں جو میں نے اپنی کنفیوژن کے حوالے سے پوچھا تھا۔'' وہ اس وقت کافی ایزی سچوئیشن میں بیٹھی تھی یہ اعتماد ہی مبین کو چونکانے کے لئے بہت کافی تھا، اس فیصلہ کن انداز کے پیچھے اس کی دی کوئی تحریک تو ہرگز کارفرما نہیں تھی، تو کیا سعد کے حوالے سے اسے صحیح وہم لاحق ہوا تھا، شاید یہ اسی کا دیا اعتماد ہے، وہ سوچوں سے باہر نکلا۔

''لگتا تو ہے کہ آپ کی الجھن اب قدرے ذہنی سکون میں تبدیل ہو چکی ہے، کیا کچھ طے پا گیا ہے۔''

''میں نے ٹھیک سمجھا تھا آپ اندازے لگانے میں واقعی غلطی کر جاتے ہیں۔'' وہ مدھر انداز میں ہنسی، مبین اس شوخی کا مفہوم سمجھنے سے اب بھی قاصر تھا۔

''آپ چاہیں تو اس روز کی بات آج مکمل کر سکتی ہیں، اس دن سچوئیشن کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ میں پوری بات نہیں سن پایا تھا۔''

''اب اس کی ضرورت نہیں۔'' وہ کچھ مبہم سا مسکرائی، مبین کا دل حقیقی معنوں میں اوپر تلے ہوا، وہ خوش تھی اور خوشی کی وجہ کچھ بھی ہو سکتی تھی، اپنی کوتاہیوں کا ازالہ تو وہ بے حسی کی چادر اوڑھ کر کر چکا تھا، رد کیے جانے والے ایسے خوش نہیں ہوتے، یقیناً وہ اپنا جھکاؤ کسی ایک جانب کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور ظاہر ہے جھکاؤ وہیں ہوا ہوگا جہاں سے اچھا رسپانس ملا تھا، مبین کو عجیب سی گھٹن ہونے لگی، جب فیصلے دل پر جبر کر کے کیے جاتے ہیں تو بے چینی اور گھبراہٹ یونہی دل میں ڈیرے ڈال لیا کرتی ہے۔

''جی...... آپ کچھ بتا رہی تھیں۔''

''شاید آنے والے دو تین ہفتوں میں میری اور سعد کی بات طے پا جائے۔'' جملہ تھا یا دھماکہ، مبین کو لگا وہ پتھر کا ہو گیا ہے۔

(باقی اگلے ماہ)

جونہی کار کو حیدر آباد کے پر رونق شہر سے نکال کر جام شورو کی طرف رخ کیا ہے تو اپنے دل پر پڑے بوجھ کو اور بھی زیادہ محسوس کیا ہے، اداس سوچوں کو دور کرنے کی خاطر دریا کنارے کی ٹھنڈی ہوا کو محسوس کرنا چاہا اور دھیان کو ہٹانے کے لئے آس پاس بکھرے نظاروں کی طرف دیکھتا ہوں اور راستہ طے کرتا رہا ہوں، پھر جیسے ہی جام شورو والی پل کو کراس کیا ہے تو، پتا نہیں کیوں، خود بخود کار کی اسپیڈ کو ہلکا کیا ہے اور دائیں طرف مڑ کر ''المنظر'' کی طرف رخ کرتا ہوں۔

آج پھر ویسا ہی موسم ہے اور ویسا ہی شام کا یہ پہر، میرا ذہن بار بار ماضی کے جھروکوں سے جھانکنا چاہتا ہے، میں نے کار کا دروازہ کھولا اور ''المنظر'' کے لان میں رکھی ٹیبل کی طرف بڑھا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا، آس پاس نظر دوڑائی تو دوسرے لوگ بھی نظر آئے، میری عجیب اداس کیفیت ہو رہی ہے، شام ڈھل رہی ہے اور فضا گھر لوٹنے والے پرندوں کے غولوں اور چڑیوں کی چہچہاہٹ سے خوبصورت لگ رہی ہے، آس پاس لوگوں کی دھیمی آوازیں، برتنوں کی ہلکی سی کھنکھناہٹ اور پل پر سے گزرنے والی بڑی گاڑیوں کا شور وقفے وقفے سے آرہا ہے، میرے سامنے ''سندھو'' دریا کی موجو پر ڈوبتے سورج کا عکس بھی نظر آرہا ہے، اتنے میں ویٹر میرے آرڈر کے مطابق چائے لے آیا ہے، میں ہلکی ہلکی چسکیاں لے کر چائے پی رہا ہوں اور میرے خیالات پھر سے بھٹکنے لگے ہیں اور ماضی کی کئی تیکھی اور میٹھی باتیں یاد آرہی ہیں اور بار بار رباب کا چہرا میرے تصور پر چھا رہا ہے جو یادوں کی وادیوں میں لئے جا رہا ہے۔

''ہاں رباب! ہمارا خاندان بھی روایتی گھرانوں میں سے تھا جو جتنے بڑے ہوتے ہیں، اتنے ہی بڑے مسائل اور جھگڑوں میں گھرے ہوتے ہیں اتنے ہی بڑے تر جھگڑے زمینوں، جائیداد اور لڑکے لڑکیوں کے رشتے کے حوالے سے ہوتے ہیں جہاں اکثر ان کے مستقبل کے فیصلے ان کے بڑوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور پھر بھی ایسے غلط فیصلے کیے جاتے ہیں جن کی سزا کئی نسلوں کو بھگتنی پڑتی ہے، ایسے ہی کسی غلط فیصلے کی وجہ سے بابا سائیں اور چاچا سائیں میں شدید اختلافات ہو گئے اور اس کی سزا ہمیں بھگتنا پڑی کہ ہم سب ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے تھے۔''

''رباب! تم تو ہم سب کی بہت پیاری پھپھو کی بیٹی تھیں جنہوں نے بہت دکھ سہے تھے، پھپھا خاندانی دشمنی کے نتیجے میں قتل کر دیئے گئے اور ان کی موت نے پھپھو کو روگ لگا دیا اور وہ اندر ہی اندر کڑھتی رہیں اور کسی کو پتا ہی نہیں چلا کہ کب وہ ٹی بی کی آخری اسٹیج پر پہنچ گئیں اور جوانی میں ہی تمہیں تین سال کی عمر میں چھوڑ کر اس دنیا سے منہ موڑ لیا، تب تم چاچا سائیں کے گھر آ گئیں تھیں اور وہیں پلی بڑھیں تھیں، چاچا سائیں نے ہمیشہ تمہیں بہت پیار دیا اور تم میں اور اپنی بیٹیوں فریدہ اور فہمیدہ میں ذرا برابر فرق نہیں رکھا۔''

''ہاں مجھے آج بھی یاد ہے، جب ہم لوگ حیدر آباد سے شفٹ ہو کر کراچی آ گئے تھے، اس وقت میری عمر پندرہ سال تھی اور تم مجھ سے پانچ سال چھوٹی تھیں، پھر بابا سائیں اور چاچا سائیں کے درمیان رنجشیں اس قدر بڑھ گئیں کہ ہم سب ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے تھے اور حیدر آباد اور کراچی کا فاصلہ ہم لوگوں کے درمیاں کئی درجے بڑھ گیا کہ ہم کئی سالوں تک پھر کبھی مل نہیں پائے۔''

''اتنا عرصہ بیت گیا کہ پھر چاچا سائیں کے بڑے بیٹے ادا اشفاق کی شادی نے ہمیں اکٹھا کیا، جب ان کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تو چاچا سائیں اور چاچی بابا سائیں کو منانے آئیں کہ ہم لوگوں میں یہ قدیم روایت ہے کہ ایسے خوشیوں سے بھرپور موقعوں پر روٹھے ہوؤں کو منایا جاتا ہے۔''

''شادی اٹینڈ کرنے کے لئے ہمارا پورا خاندان تم لوگوں کے پاس حیدر آباد آیا، تب تک بہت کچھ بدل چکا تھا اور تم بھی تو کتنا بدل گئی تھیں، وہ چھوٹی سی شرارتی اور معصوم سی بچی ''ربا'' اب ایک خوبصورت جوان لڑکی کے روپ میں میرے سامنے تھی، اب تم خاصی سنجیدہ ہو گئی تھیں اور بردبار بھی، تم خاندان کی دوسری تمام لڑکیوں سے مختلف تھیں، جب باقی لڑکیاں شادی کے لئے ہنگاموں میں مصروف ہوتیں، گانے گاتیں، قہقہے لگاتیں، سارا سارا دن شاپنگ کرتیں، میک اپ، ڈریسز اور جیولری کی باتیں کرتیں یا پھر ڈھولک کی تھاپ پر گیت گایا کرتیں تو تم ان سب سے الگ الگ رہتیں، زیادہ تر اپنے کمرے میں یا پھر لان میں درخت کے نیچے بینچ پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھتی یا پھر پینٹنگ بنانے میں مصروف رہتیں، تم بہت اچھی آرٹسٹ تھیں اور فائن آرٹس میں ماسٹر کیا تھا تم نے، اکثر تم دنیا مافیہا سے بے خبر پینٹنگ میں مصروف ہوتیں تو میں تمہیں دیکھا کرتا تھا اور تمہیں تو میری موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا تھا اور پھر نجانے کیسے تم میرے دل کی نہائیوں میں اتر گئیں اور میں خود حیران ہو گیا کہ یہ کیسے ہو گیا کیوں کہ میں یعنی دانیال حسن میں جو سارے خاندان کا سب سے خوبرو اور ہینڈسم لڑکا تھا اور خاندان بھر کی اور یونیورسٹی کی لڑکیاں مجھ پر مرمٹتی تھیں اس لئے خاصا مغرور اور خودسر بھی تھا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں مجھے بگاڑنے والے میرے اپنے اور دوست اور ساتھی تھے جنہوں نے مجھے یہ احساس دلایا تھا کہ میں کوئی بہت ہی اونچی چیز تھا اور پھر دولت کا گھمنڈ بھی تھا اس لئے خاصا ضدی اور مغرور تھا اور یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ جس لڑکی کو بھی چاہتا اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کا آرٹ جانتا تھا، اسی لئے یہ یقین تھا کہ جب میں تم سے اظہار محبت کروں گا تو تم تو خود کو بہت ہی خوش نصیب لڑکی سمجھو گی۔''

''ہاں میں کیسے بھول سکتا ہوں وہ شام جب ادا اشفاق کی مہندی کی رسم ہونا تھی، گھر بھر میں ہنگامہ برپا تھا، قہقہے گونج رہے تھے اور خاندان بھر کی لڑکیاں مہندی کو سجا بھی رہی تھیں اور ناچ گانے کا مقابلہ بھی جاری تھا مگر تم حسب معمول فقط مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے انہیں دیکھ کر انجوائے کر رہی تھیں، کاسنی رنگ کے سوٹ میں تم سادگی میں بھی بہت خوبصورت لگ رہی تھیں اور میں اپنی نظروں کو تم سے ہٹا ہی نہیں پا رہا تھا، اسی رات مہندی کی رسم کی رونقوں اور ہنگاموں کے درمیان موقع ملتے ہی میں نے تم سے اظہار محبت کر دیا تو تم گھبرا کر چلی گئیں اور میں تمہاری کیفیت کو حیاء سمجھتے ہوئے انجوائے کرتا رہا۔''

ادا اشفاق کی شادی کا دن تھا اور حسب معمول لڑکیاں میک اپ کپڑوں کی میچنگ اور جیولری کی باتوں میں مگن تھیں اور خاندان کے لڑکوں کے تبصرے کے مطابق اپنے آپ پر، لیپا پوتی کر رہی تھیں کہ تم نظر آ گئیں تو میں باہر جاتے جاتے رک گیا تھا، تم نے پنک شرٹ اور ٹراؤزر پہنا ہوا تھا اور نازک سا جیولری سیٹ اور ہلکا میک اپ تمہارے حسن کو دو چند کر رہا تھا کہ تمہارے

موبائل کی رنگ ٹون بجی تھی اور تم اپنے دوپٹے اور خوبصورت کھلے ہوئے لمبے بالوں کو سنبھالتی کال سنتی رہیں، تمہاری فرینڈ کی کال تھی جسے شادی میں شرکت کے لئے جامشورو کالونی سے آنا تھا اور اسے کنوینس (سواری) نہیں مل رہی تھی، تم نے کہا تھا کہ تم اپنی کار میں اسے لینے آرہی ہو، مگر اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھا اور کار بھی شادی کے انتظاموں کے سلسلے میں موجود نہیں تھی تو تم بہت پریشان ہو گئیں کہ فرینڈ سے کیا ہوا وعدہ کیسے نبھا پاؤ گی، تب چاچی نے مجھے کہا کہ میں تمہیں لے کر جاؤں، یہ سن کر میرے دل کے گلاب کھل ہی اٹھے تھے مگر تم یہ سن کر پریشان ہو گئیں تھیں مگر انکار بھی نہ کر سکیں اور میرے ساتھ کار میں آکر بیٹھ گئیں۔

''رباب! تمہیں یاد ہے نا کہ جامشورو کی پل پار کرنے کے بعد جب میں نے اچانک ہی کار کو دائیں طرف موڑ کر ''المنظر'' کی جانب آیا اور کار بند کی تو تم بے حد پریشان ہو گئیں تھیں اور میں تمہاری گھبراہٹ سے مزا لے رہا تھا اور پھر کہا۔''

ہو سکے تو میرا ایک کام کرو
شام کا یہ پہر میرے نام کرو

یہ سن کر تم بے حد پریشان ہو گئیں بلکہ روہانسی ہو گئیں تو میں سنجیدہ ہو گیا اور تمہیں بتایا کہ میں بہت دنوں سے تم سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا تھا اس لئے تھوڑی دیر کے لئے یہاں رکا تھا اور پھر میں نے سنجیدہ ہو کر تم سے کچھ باتیں کیں تھیں اور اپنا دل کھول کر رکھ دیا اور محبت کا اظہار کیا تو تم یہ سب سن کر گھبرا گئیں اور میری نظروں اور جذبوں کی تپش سے پریشان ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں، میرے والہانہ پیار کے اظہار سے تمہارا چہرہ گلنار ہوا جا رہا تھا اور آنکھوں میں حیرانگی کے رنگ ان کی خوبصورتی میں اور بھی اضافہ کر رہے تھے، پھر جب میں نے تم سے تمہارا فیصلہ سنانے کے لئے کہا تو تمہارا چہرہ تو دھواں دھواں ہو گیا اور تم نے میری محبت کے جواب میں فقط خاموشی کا جواب دیا تو میرا دل ٹوٹ گیا میں نے تو سمجھا تھا کہ تمہارا چہرہ تو کھل اٹھے گا اس اظہار سے اور تم شرما جاؤ گی مگر تم نے مجھ سے چلنے کی التماس کی تو مجھے اپنی تذلیل کا احساس ہوا اور میں نے ایک دم کار اسٹارٹ کر کے جھٹکے سے ریورس کی اور پھر تیز رفتاری سے کالونی کی طرف رخ کیا، پھر وہاں سے تمہاری فرینڈ کو پک کرنے اور واپسی کے سفر کے دوران میں نے خاموشی اختیار کی۔

''رباب! آج بھی مجھے یاد ہے، تم چاہو تو ساری عمر پوری دنیا سے مجھ سے یا پھر خود سے ہی چھپاؤ مگر اس شام میں نے تمہاری آنکھوں میں نئے رنگ ابھرتے دیکھے تھے اور تمہارے گالوں پر جیسے گلاب کھل اٹھے تھے اور اس کے بعد کچھ دن ادا اشفاق کی شادی کے ہنگاموں میں گزرے، میری نظریں تمہارا طواف کرتی رہتیں اور تم یہ سب محسوس کر کے سمٹ سمٹ جاتیں اور مجھ سے چھپتی پھرتیں۔''

''شادی کے بعد ہم لوگ کراچی لوٹ آئے مگر میں اپنا دل وہیں بھول آیا تھا، اب جیسے میں وہ پہلے والا دانیال حسن رہا ہی نہیں، ہر وقت تمہاری یاد، تمہارا چہرہ میرے خیالوں میں بسا رہتا مگر اس سارے عرصے میں تم نے میری محبت کا جواب کبھی بھی محبت سے نہ دیا، بے شک تم نے زبان سے تو کبھی نہیں اقرار نہ کیا مگر تمہاری خوبصورت پراسرار آنکھیں کئی راز کھول دیتیں تھیں اور میں یہ سب کچھ محسوس کرتے ہوئے بہت خوش ہوتا پھر بھی میرے اندر کا مغرور اور

خودسر دانیال حسن چاہتا تھا کہ تم اپنی زبان سے اپنے دل کے ہارنے کا اظہار کرو کیونکہ اس معاملے میں، میں بہت انا پرست ہو چکا تھا، میں اپنے کانوں سے تم سے جیون بھر ساتھ نبھانے کا اقرار سننا چاہتا تھا مگر تم تو میرے لئے پراسرار بنی رہیں تو آخر کار میں چڑ گیا تھا، تمہاری اس خاموشی سے اور مجھے بھی ضد ہو گئی کہ جب تک تمہارے منہ سے محبت کا اظہار نہیں سنوں گا تب تک اپنے والدین کو تمہارے گھر نہیں بھیجوں گا رشتہ لینے کے لئے، اس طرح ہم دونوں کے بیچ خاموش محبت اور جنگ ایک ساتھ جاری تھی، دونوں معاملوں میں نہ تو میں ہار ماننے کو تیار تھا اور نہ ہی میں، آج جب میں کافی میچور ہو چکا ہوں تو سوچتا ہوں کہ کیا محبت میں اتنا ضد اور جنگ ہوتی ہے؟''

کچھ عرصے کے بعد میرے والدین میری شادی کے لئے فکر مند ہو گئے اور انہوں نے سوچا کہ بابا سائیں اور چاچا سائیں کے اختلافات بظاہر تو ختم ہو گئے تھے اور اب اس رشتے کو مزید مضبوط بنانے کے لئے بہترین طریقہ یہ ہو گا کہ میری شادی چاچا سائیں کی بڑی بیٹی فریدہ سے ہو جائے گو کہ تب بھی مجھے یقین تھا کہ اگر میں اپنے دل کی بات اپنے والدین سے کروں اور تم سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کروں تو نہ تو میرے والدین کو اعتراض ہوتا اور نہ ہی چاچا سائیں کو کیونکہ تم تو ان دونوں کی پیاری بہن کی نشانی تھیں اور سب کو ہی بے حد عزیز تھیں، مگر اس وقت مجھ پر ایک غصہ اور جنون سوار تھا اور میں نے اپنی ناقدری کا بدلہ لینے کے لئے اور فقط اپنی انا کی تسکین کی خاطر فریدہ سے شادی کرنے پر رضا مند ہو گیا اور ہم دونوں کی منگنی بہت دھوم دھام سے ہو گئی، منگنی سے شادی ہونے کے عرصے کے دوران میں ہر طرح سے تمہارا دل جلاتا رہا، مگر تم نے کبھی کوئی شکوہ شکایت نہ کی بلکہ خاموشی سے ہر زخم سہتی رہیں ہاں کبھی کبھار تم روہانسی ہو جاتیں تو مجھے بڑی تسکین ملتی، اب تم پہلے سے بھی زیادہ اداس اور الگ تھلگ رہنے لگیں تھیں، پھر میری فریدہ سے شادی ہو گئی تو میں نے تم لوگوں کے ہاں آنا جانا بہت کم کر دیا، فریدہ بہت پیاری اور محبت کرنے والی بیوی تھی مگر میرے اندر کا ضدی اور انا پرست شخص تمہاری محبت کو بھول نہ سکا۔

کبھی کبھی تو سوچتا تھا یہ میں نے کیا کر دیا، میں مطمئن نہیں تھا اور لگتا کہ جیسے میں نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی محبت اپنی انا پر قربان کر دی تھی۔

اور کل کسی کام سے حیدر آباد آیا تھا اور تمہارے گھر آیا تو تمہارے سوا گھر میں ملازموں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا کہ سب کسی شادی کی تقریب میں گئے ہوئے تھے اور تم تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی شاید بہت کمزور لگ رہی تھیں بلکہ جیسے بدل گئی تھیں۔

''رباب! تمہاری خوبصورت آنکھوں کی وہ چمک کیوں ماند پڑ گئی ہے جنہیں دیکھ کر شیخ ایاز کی ایک وائی کی یہ سطریں یاد آجاتی تھیں۔''

محبوب کی آنکھوں کی ٹھنڈک ایسی
کہ جیسے صحرا میں رات ڈھلے
کوئی کیا کرے ....

''اف کتنا ظالم ہوں میں؟ میں نے تمہیں کتنا ستایا ہے، کتنا جلایا ہے، کل بھی تو میں نے تم پر اپنا غصہ اتارا، کیسے کیسے نشتر نہ چلائے، طنز کیا مذاق اڑایا، تمہیں کچوکے لگاتا رہا اور تم پہلے تو ہمیشہ کی طرح ہونٹوں پر ایک اداس مسکراہٹ بکھیرے سب کچھ خاموشی سے سنتی رہیں مگر پھر تمہاری آنکھوں میں سندھو دریا کی لہریں سی اٹھیں

اور جب مہران موج میں آیا اور آنکھوں کے تمام بند توڑ کر اک سیلاب لے کر آیا تو مجھے بہت سکون محسوس ہوا کہ میں نے تو ہمیشہ سے یہی چاہا تھا کہ تمہیں ہارتے ہوئے دیکھوں۔"

"آج تھوڑی دیر پہلے جب میں تمہارے گھر سے نکل کر کراچی جانے کے لئے کار میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ تم تیزی سے میرے قریب آئیں اور اپنے ہاتھوں میں پکڑا ہوا بڑا سا گفٹ پیک میری طرف بڑھایا اور تھکے تھکے سے قدموں سے واپس لوٹ گئیں۔"

اب جب جامشورو کی سرخ خوبصورت شام آہستہ آہستہ گہرا سرمئی پیرہن اوڑھ رہی ہے، شفق کے گہرے رنگ سندھو دریا کی لہروں پر لہرا رہے ہیں تو میں بھی ماضی کی یادوں سے نکل کر حال میں لوٹ کر آیا ہوں تو اب مجھے اس گفٹ کا خیال آ رہا ہے کہ آخر اس میں کیا ہے؟ میں کار کی طرف بڑھتا ہوں اور سیٹ پر پڑا پیکٹ اٹھا کر ریپر ہٹاتا ہوں تو میری نظر ایک خوبصورت پینٹنگ پر پڑتی ہے جو تمہاری بنائی ہوئی ہے، اس میں بھی شام کے گہرے ہوتے ہوئے رنگ ہیں اور ایک لڑکا اور لڑکی ہاتھوں میں ہاتھ دیئے اپنے روشن گھر کی طرف بڑھ رہے ہیں جبکہ دوسری جانب ایک درخت کے موٹے اور کھوکھلے تنے کے پیچھے، بکھرے ہوئے پیلے پتوں کے درمیاں ایک لڑکی اداس نظروں سے انہیں دیکھ رہی ہے، اچانک سے میری نظر پیکٹ میں پڑے ایک لفافے پر پڑتی ہے تو میں چونک پڑتا ہوں اور پینٹنگ کو احتیاط سے کار کی پچھلی سیٹ پر رکھ کر لفافہ لئے دریا کے کنارے لگی ریلنگ کے قریب آتا ہوں اور لفافہ کھولتا ہوں، تمہارا خط ہے اس میں میرے نام، میں خط کو پڑھتا ہوں۔

دانیال!

سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کس طرح مخاطب کروں، کزن کی حیثیت سے یا پھر اس بے نام رشتے کے حوالے سے جس میں تم نے مجھے سالوں سے جکڑ رکھا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ بہت ناراض ہو مجھ سے کیوں کہ میرے رویے کی وجہ سے تمہاری انا کو بہت ٹھیس پہنچی ہے اور تمہارا دل ٹوٹا ہے کہ میں نے تمہاری محبت کا جواب کبھی بھی محبت سے نہیں دیا ہے اور پیار کا خوبصورت اقرار جو تم میری زبان سے سننا چاہتے ہو، مگر میری زبان بند رہی، میں نے تو سوچا تھا کہ اس بات کو راز ہی رکھوں گی اور تم مجھے آخر کار بھول ہی جاؤ گے اور مجھے اپنے دل سے نکال دو گے، مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اتنے ضدی نکلو گے اور تمہاری انا پرستی تمہیں بے سکون رکھے گی یہ دیکھ کر آج میں تمہیں سب کچھ بتانا چاہتی ہوں کہ میری بے رخی کا سبب کیا تھا۔

دانیال تمہیں معلوم نہیں کہ ادا اشفاق کی شادی پر جب ماموں جان تمہارے بابا سائیں کو منانے کے لئے آئے تھے تو ان کی صلح کن شرائط پر ہوئی تھیں، زمینوں اور جائیداد کے معاملات کے علاوہ یہ بھی شرط رکھی گئی تھی کہ فریدہ کا رشتہ تمہیں دیا جائے گا، تو پھر تم ہی بتاؤ کہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے میں کس طرح تمہاری محبت کا جواب اسی طرح دیتی؟ ماموں جان کے مجھ پر ہزاروں احسان ہیں، انہوں نے فریدہ، فہمیدہ اور مجھ میں ذرا برابر بھی فرق نہیں رکھا ہے، تو پھر میں کیسے احسان فراموش بن جاتی؟

جانتی ہوں کہ تم ماموں جان سے فریدہ کے بجائے میرا رشتہ مانگتے تو وہ خوشی سے مان جاتے مگر دانیال میں نہیں چاہتی تھی کہ میں دونوں بھائیوں کے بیچ میں آؤں کیونکہ میری تو اپنی بھی

یہی خواہش تھی کہ دونوں بھائیوں کے بیچ سمدھیوں کا رشتہ بھی جڑ جائے تو یہ اور بھی مضبوط ہو گا اور ہمارا خاندان پہلے کی طرح پھر بکھرنے نہ پائے گا، فریدہ تو میری سگی بہن کی طرح ہے اس لئے اس کی خوشی مجھے اپنی خوشی سے زیادہ عزیز ہے۔

البتہ اگر میرے محبت کے اقرار سے تمہاری انا کی تسکین ہو سکتی ہے تو لو آج میں اقرار کرتی ہوں کہ تم ہی تھے جس نے مجھے پیار کے حسین احساس سے آشنا کیا تھا اور اب زندگی بھر کوئی اور شخص میرے من کے تار چھیڑ کر محبت کا کوئی گیت بکھیر نہ پائے گا کیونکہ میرے دل پر تو لطیف سائیں کا یہ بیت پہلے سے نقش ہے۔

سک کنجی سیریں جنین تراں تیئں تار
توں پی رہیو روح میں توں ئی اکھنیاں بار
پریں تنہجے پار موں وا جھائیندی ورہہ تھیا
(جوں جوں تیروں دریا میں توں توں بڑھے ہے پیار
تو ہی جوت ہے نین کی تو ہی روح میں یار
تجھ کو دریا پار تکتے جگ بیتے ہیں)

"اف خدایا، رباب یہ سب کیا ہو گیا؟ یہ یہ میں نے کیا کیا تمہارے ساتھ، ہاں آج کے بعد شاید میری انا کی تسکین ہو جائے اور شاید میرے دل کو سکون مل جائے کیونکہ میرے دل اور روح پر جو بوجھ تھا وہ ہلکا ہو گیا ہے، مگر مجھے لگ رہا ہے کہ میں محبت کی بازی جیت کر بھی ہار گیا ہوں اور تم ونر ہو۔"

میں اپنے خیالوں میں مست ہوں کہ اچانک ٹھنڈی ہوا کا تیز جھونکا میرے ہاتھ سے تمہارا خط چھین کر سندھو کے پانی پر پھینک دیتا ہے اور مہران کی موجیں بے چین ہو کر اسے جکڑتے ہوئے دور بہت دور لے جا رہی ہیں، میں آخری حد نظر تک کاغذ کے اس صفحے کو دیکھتا ہوں جو تمہارے پیار کا امین تھا اور پھر تھکے تھکے قدموں سے واپس جا کر کار میں بیٹھ جاتا ہوں۔

اور......اب...... جب میری کار جامشورو کو بہت پیچھے چھوڑ کر اور حیدر آباد کو الوداع کہہ کر کراچی کی طرف رواں دواں ہے اور رات ہر سو اپنے پر پھیلا چکی ہے، تب ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے درمیاں میں سوچتا ہوں کہ۔

"رباب! تمہارے پیار کا واحد پیامبر سندھو کی لہروں کے حوالے ہو چکا کہ کیوں کہ تمہارا پیار بھی مہران کے پانی کی طرح شفاف اور پاک ہے اور دریا کی موجوں سے مل کر امر بن جائے گا کیونکہ محبت کے دریا کے جوش اور صدیوں سے بہتے مہران کو کوئی مات نہیں کر سکتا ہے۔

☆☆☆

درد کے اُس پار کہیں

نایاب جیلانی

بارہویں قسط کا خلاصہ

امام فریدے ایک ایکسیڈنٹ کی بدولت شاہوار بٹو سے ملتا ہے، ان کی ملاقات دوستی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

"سرکاری مرکز صحت" میں امام فریدے ایک لڑکی کو دیکھ کر چونک جاتا ہے، اس لڑکی کے نقوش امام فریدے کی بہن کومے سے ملتے جلتے ہیں، یہ انکشاف امام فریدے کو حیران کر دیتا ہے۔

ہیام "احسان منزل" کے مکینوں کے ساتھ گھل مل جاتا ہے، اسے اسامہ اور نشرہ کا کردار اس گھر میں بہت دلچسپ لگتا ہے، ہیام کی اسامہ سے بہت دوستی ہو جاتی ہے جس پہ نشرہ اسامہ کو محتاط رہنے کا مشورہ دیتی ہے۔

نیل بر، حمت کو ساتھ لے کر سرکاری بنگلے پہ امام فریدے سے ملنے کو جاتی ہے، امام فریدے، نیل بر کو دیکھ کر برہمی کا اظہار کرتا ہے، لیکن جب اس کی نگاہ حمت پہ پڑتی ہے تو اس کے تاثرات بدل جاتے ہیں۔

ہیام کو اپنے گھر پیسے بہت ارجنٹ بھجوانے ہیں، مسٹر بیہ کے مشورے پہ وہ اسامہ کی خدمات حاصل کرتا ہے۔

اب آپ آگے پڑھیئے

تیرہویں قسط

سپیریئر کالج میں آج اس کا پہلا دن تھا۔

اور اس کی حالت اس وقت کے جی کے بچے جیسی تھی، جو پہلے دن اسکول آکر بولایا بولایا سا ہر ایک چہرے میں اپنی ماں کو تلاشتا ہے، گو کہ وہ کسی چہرے میں اپنی ماں تو نہیں تلاش کر رہا تھا تاہم ہر ایک اجنبی چہرے کو دیکھتا کچھ کنفیوز ضرور ہو رہا تھا۔

پہلے دن پہلی کلاس خیر و عافیت سے گزر گئی تھی، دوسرا اور پھر تیسرا دن بھی گیا، ہر طرف امن و امان ہی رہا، بہت دن سے نہ سہی، نومی نے پڑھائی میں دلچسپی لینی شروع کر ہی دی تھی، کیونکہ اسامہ کی وارننگ ابھی تک دماغ میں تازہ تھی، اس نے آخری مرتبہ اسے جتایا تھا۔

''اگر اب بھی فعل ہونے کا سابقہ ریکارڈ قائم رکھا تو پھر تیار ہو جانا، میں تمہیں کسی فیکٹری کی لیبر میں بھرتی کروا آؤں گا، تاکہ تم اپنا پیٹ خود پال سکو، ہم سے ''ویلے مسٹنڈے'' کے خرچے نہیں اٹھائے جاتے۔'' اسامہ کی دھمکی بھی کارگر ثابت ہو چکی تھی اور اس کے الفاظ بھی ضائع نہیں ہوئے تھے، اسامہ کی نصیحتوں کے زیر اثر نومی نے بڑی شرافت کے ساتھ بالآخر کتابوں میں دل لگانے کی کوشش کر ہی لی تھی، اپنی ساری غیر اخلاقی سرگرمیوں کو بھلا کر، لیکن اس دن بڑا ہی عجیب واقعہ رونما ہوا تھا۔

وہ جو اپنے کالج فیلوز اور کالج کے ماحول میں قدرے ایڈجسٹ کر چکا تھا، اس دن قطعاً نومی کا دل چاہا، یا زمین پھٹے اور وہ اس زمین میں سما جائے یا آسمان اسے چند لمحوں کے لئے اٹھا لے، کم از کم وہ دو شرربار نگاہوں سے وقتی طور پر خود کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

لیکن ایسا بالکل بھی نہ ہوا، نہ زمین پھٹی اور نہ آسمان نے اسے اٹھانے کی زحمت گوارا کی، زمین کے ایسے بوجھ بس زمین ہی ڈھونے کا حوصلہ رکھتی تھی، نومی کو اس لمحے اندازہ ہوا تھا۔

اس کے سامنے وہی نزاکت کا مرقع بنی خاتون کھڑی تھی، وہی...... شانزے مہروز جس کا پرس اور نقدی اڑا کے نومی نے دوستوں کے ساتھ مری میں خوب عیاشی کی تھی، بعد ازاں فون پر اسے دھمکاتا بھی رہا تھا اور آج اسی ''پھنے خان'' نومی کے گلے میں وہ اپنی استادی کا پھندا ڈالے کھڑی تھی، نومی کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا، اسی خاتون نے اگلے دو سال تک اسے تعلیم دینے کا بیڑہ اٹھا رکھا تھا۔

وہ خرابیٔ طبع کی وجہ سے ''لیو'' پہ تھی اور اب مکمل شفایاب ہو کر تدریسی میدان میں عملی طور پر کود پڑی تھی۔

کلاس میں تو نومی کو منہ چھپانے کی جگہ نہیں ملی تھی، لیکن کلاس کے بعد وہ شانزے کو دوبارہ دکھائی نہیں دیا تھا، حالانکہ وہ اس کی الگ سے ''تفصیلی'' کلاس لینے کا بھرپور ارادہ رکھتی تھی۔

لیکن نومی صاحب گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب رہے تھے اور اگلے چار دن تک ''بخار'' کا بہانہ بنا کر کالج سے غیر حاضر رہے، تاہم پانچویں دن اسامہ کی فون کال پہ نومی کی وہ درگت بنی کہ اس سے اگلے دن کالج میں چہرہ مبارک جلوہ گر ہو گیا۔

لیکن پھر خدا کی کرنی یوں ہی ہوئی کہ محترمہ شانزے مہروز نے قطعاً اسے ایک طالب علم کی مانند ٹریٹ کیا تو گویا نومی صاحب کی جان میں جان آ گئی تھی۔

شانزے نے اس کے سابقہ کارنامے پہ جب روشنی ڈالنے سے گریز برتا تو نومی بھی اپنے ''جامے'' میں لوٹ آیا، اللہ اللہ خیر صلا، میم شانزے شاید اس معمولی سی واردات کو بھول گئی تھی، نومی کی تسلی کے لئے یہی کافی تھا، لیکن جب ویکلی پرچوں کا اختتام ہوا اور وہ اپنا رزلٹ کارڈ لینے کے لئے میم کے آفس پہنچے تب نامی کے ہاتھ میں کارڈ تھماتے ہوئے شانزے نے اسے گہری نگاہوں سے ٹٹولا تھا، اسے ایک وقت میں ہراساں کرنے والا اس وقت بڑا ہی کنفیوز کھڑا تھا، شانزے کو بڑا ہی مزہ آیا تھا۔

''تمہیں ایک ڈکیت سے ''طالب علم'' کے روپ میں دیکھ کر بہت اچھا لگا۔'' نومی کے لئے یہ الفاظ کسی طمانچے سے کم نہیں تھے، طمانچہ بھی ایسا جس پہ وہ بلبلا بھی نہ سکا تھا۔

''ویسے اس عمر میں تمہیں کسی جاب سے منسلک ہونا چاہیے تھا۔'' شانزے کے اگلے الفاظ پہ نومی زہر کے گھونٹ بھر کر رہ گیا، نہ ہوتی یہ استانی تو مزہ چکھا دیتا، کچھ اسامہ کی نصیحتیں بھی یاد تھیں، تبھی خود پہ کنٹرول کرنے پہ مجبور تھا، ورنہ نومی اور لاجواب ہوتا؟ بھلا کس کتاب میں لکھا تھا؟

''بہت خوب تم خاصے سدھر چکے ہو، یہ بہت خوش آئند عمل ہے۔'' جانے یہ تعریف تھی یا طنز؟ نومی سر تا پا بھن کر رہ گیا تھا۔

''اور تمہاری شروعات میں ہی کارکردگی بہتر ہے، دیٹس ویری گڈ۔'' اب کہ یقیناً ایپری شیٹ کیا گیا تھا، تاہم نومی کو ذرا بھی خوشی نہیں ہوتی تھی، مخمل میں لپیٹ کر جوتے مارنا شاید اسی کو کہتے تھے، وہ اندر تک کسمسا کر رہ گیا تھا۔

''بڑی نوازش ہے، جو آپ کو میری کارکردگی اچھی لگی۔'' نومی نے بھن کر جواب دیا تھا، شانزے کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی تھی، تو اب آ گیا تھا، اونٹ پہاڑ کے نیچے، اس نے اپنی مسکراہٹ بمشکل چھپائی تھی۔

''امید ہے ایسی کارکردگی کا ہی مظاہرہ کرتے رہو گے۔'' شانزے نے اسے مزید تپایا تھا۔

''آپ جیسے مہربانوں کا سایہ سر پہ سلامت رہا تو اس سے اچھی کارکردگی بھی دکھا سکتا ہوں۔'' اس نے بظاہر شائستگی کے ساتھ دل کی کھولن باہر نکالی تھی، تب شانزے نے اسے پہلی مرتبہ گھور کر دیکھا اور بولی۔

''وائے ناٹ، اب تم جا سکتے ہو۔''

''شکریہ۔'' وہ کڑوے بادام چباتا باہر آ گیا تھا، پھر گہرا سانس بھرتا سیڑھیاں اترنے لگا۔

''آہ، نعمان صاحب، اب آئے ہو نا داڑھ کے نیچے۔'' اس کا اترا منہ سیڑھیاں اترتے کچھ اور بھی اتر رہا تھا۔

☆☆☆

ان دنوں علاقے کے حالات کچھ اچھے نہیں تھے۔

شین قبیلے کے اندر کچھ دھواں سا اٹھ رہا تھا، جس کے اثرات بٹو خاندان پہ بھی پائے جاتے تھے، کیونکہ سباخانہ کی والدہ شین قبیلے میں بیاہی گئی تھیں، یوں رشتہ داری کا بھی تقاضا تھا۔

سردار بٹو ان دنوں شدید ہیجانی پریشانی کے گھیر میں تھے، کسی بھی وقت لڑائی متوقع تھی، اگر

شین خاندان کے سردار لڑائی کے لئے کمربستہ ہوتے تو سردار بٹو کو ان کی حمایت میں آگے آنا تھا، کیونکہ ایک وقت میں سردار کبیر بٹو نے سردار شین خان سے بڑا اونچا کام کروایا تھا، اب شاید وہ وقت آچکا تھا جب سردار شین خان اپنے احسان کا بدلہ واپس لیتا۔

اور یہ تو پھر بیال کی وادی تھی، خون میں رنگی ہوئی، جس کے بارے میں بڑے بڑے انگریز لارڈ بھی کہا کرتے تھے۔

''یہاں ایک ایسا عہد ہے جو انسانی سوچ کی سرحدوں سے پرے ہے اور خاموشی ہے، جو شاید کائنات کے وجود میں آنے کے بعد پہلے دن کی خاموشی ہے۔''

اور اگر کوئی حمت سے بیال کے بارے میں سوال کرتا کہ بیال کیا ہے؟ تو وہ بیال کی تشریح بہت آسانی کے ساتھ کرسکتی تھی۔

''بیال ایک قید خانہ ہے، جس کی دیواریں چٹانیں ہیں، ایک اداس اور تنہا بستی ہے۔'' جبکہ نیل بر کے لئے بیال ایک تفریح گاہ تھی، بیال سے لے کر گلگت تک اور وہ بیال سے زیادہ گلگت سے متاثر تھی، کیونکہ وہاں ہارورڈ کی قبر تھی، جسے انگریزوں کے بقول یاسین ریاست میں سورج کی جانب منہ کرکے قتل کر دیا گیا تھا اور پھر وہ انگریز شاعروں کا محبوب موضوع بن گیا، لیکن حمت کا خیال گلگت اور بیال کے لئے قطعاً الگ سا تھا۔

بیال سوز تھا، درد تھا، ساز تھا، بیال ایک سربستہ راز تھا اور شاید بیال کی تنہائی اس کی دور افتادگی اور اداسی میں ہی اس کی کشش پنہاں ہے، ایک ایسی تہذیب جو کسی حد تک جدیدیت کے رنگ سے بچی ہوئی ہے، ایک ایسا گوشہ جس کے چاروں طرف کھڑے پہاڑوں نے پوری دنیا کا شوروغل روک رکھا ہے۔

اس کی ہوائیں ازل سے وہی ہیں، جو خالق نے زندگی کا سانس دیتے وقت کائنات کو عطا کی تھیں، یہ ایک ایسا قفس ہے جس کے گوشے میں درد بہت ہے، یہاں پہ صرف دریائے سندھ کی ہلکی آواز ہے یا باغوں میں چلنے والی ہواؤں کی سرسراہٹ ہے اور اداسی وہ ہے جو ازل سے بیال کے باسیوں کے اندر رچی بسی ہے اور یہ نیل بر کا بیال ہے اور یہ حمت کا بیال ہے اور اس پہ صندیر خان، شاہوار خان اور ان کے پرکھوں کی حکومت ہے، تو کیا یہ بیال صرف انہی خان زادوں کی ملکیت تھا؟

اس بیال پہ کسی اور کا حق نہیں تھا؟ اس بیال کی سرسبز زرخیز زمین پہ کسی اور کا اختیار نہیں تھا؟ وہ جو جرأت و بہادری میں کسی سے کم نہیں تھا، جو لشکروں کا مقابلہ اپنی عقل سے کرتا تھا، جسے ہتھیاروں کی جنگ سے نہیں، دماغ کی جنگ سے جیتنا آتا تھا، جس کی جرأت اور جواں مردی کے پورے بیال میں چرچے تھے، تو کیا یہ فرخزاد کا بیال نہیں تھا؟ کیا یہ شیر شاہ کا بیال نہیں تھا؟ کیا یہ ''ودھا'' کا پایہ تخت نہیں تھا؟ تو پھر انہیں جلاوطن کرکے ان کی زمین پہ قبضہ کیوں جمالیا گیا، ان کے نام ونشان کو کیوں مٹا دیا گیا تھا؟

کیا کسی بیال کے باسی کی جرأت تھی؟ وہ سردار بٹو کے سامنے اس سوال کی تلوار کو اٹھا سکتا؟ کیا کسی مائی کے لال کی جرأت تھی؟ ہرگز نہیں، کیونکہ یہاں پہ طاقت کی حکومت تھی اور اگر حمت

بہت جرأت کا مظاہرہ کرتی اور سباخانہ کسی تجسس کے ہاتھوں پاگل ہوتی تو پندرہ سولہ سال پہلے ہونے والی ایک کہانی کا پہلا ورق تو کھل ہی جاتا۔

اس بند کتاب کا پہلا باب جو پربت کے اس پر بیال کی زمین کے اندر دفن تھا، جسے کس نے دفن کیا تھا؟ جسے کیوں دفن کیا گیا تھا؟ جسے کس جرم میں زمین میں گاڑ دیا گیا تھا؟ تو کس کی جرأت تھی کوئی ضرخزاد کے بارے میں سوال اٹھا لیتا؟ اور کون اتنا جی دار تھا جو شیر شاہ کے بارے میں پوچھنے کی جرأت کرتا؟ اور کس میں اتنی طاقت تھی جو بی جاناں کے سامنے ودھا کا ذکر خیر کرسکتا؟ لیکن آج کچھ عجیب ہوا تھا، کچھ انوکھا ہوا تھا، کچھ الگ ہوا تھا۔

جب نیل بر اور حمت الگ الگ جذبات لئے سرکاری بنگلے سے امام فریدے کی میزبانی سے مستفید ہو کر واپس آئی تھیں، ہاں تب کچھ عجیب ضرور ہوا تھا، اتنا عجیب جس نے بٹو محل کی دیواروں میں خوفناک خاموشی کی کیلیں گاڑ رکھی تھیں۔

وہ اس وقت بڑے ہال کے وسط میں کھڑی تھیں اور ان کے حواس نارمل نہیں تھے، ان کے پیروں تلے قالین دھنستا تھا اور سامنے کرسیوں پہ کچھ ساکت کر دینے والے وجود فروکش تھے، اگر دائیں دیکھا جاتا تو دور شیشوں کے پار چنار کا ایک طویل برآمدہ نظر آتا اور اگر بائیں دیکھتے تو کانچ کی دیوار کے پار باغ دکھائی دیتا تھا، جس میں انار سرخ ہو رہے تھے اور پک پک کر گر رہے تھے، دائیں جانب انڈس نہیں تھے، بائیں جانب قراقرم نہیں تھے، لیکن قراقرم سے زیادہ سخت، بے جان، اکھڑا ہوا متکبر سردار ضرور موجود تھے اور ان کے چہرے بھورے سورج کی طرح زرد اور گرم تھے، لال انگارے جیسی آنکھیں اور بھینچے ہوئے، یوں حمت کو تو یقین ہو چلا تھا ان کا سفر آخر شروع ہونے والا ہے، لیکن نیل بر اس احساس سے ابھی کچھ دور تھی۔

اسے ابھی اپنی روایات، اقدار اور رسومات سے اتنی واقفیت ہرگز نہیں تھی، لیکن آج کے بعد اس کی یہ خواہش بھی پوری ہو جاتی اور ''سپت سندھو'' میں آریائی حملہ آوروں کی دھول اڑاتا صندیر خان کسی پہاڑ کی مانند شق ہوا ان کے سروں پہ پھٹ پڑا تھا۔

''تو سردار بٹو کی بیٹی نہ ہوتی تو تیرے چیتھڑے اڑا دیتا نیل بر کبیر بٹو، تجھے اندازہ نہیں، تو ہماری ناموس کے بگل بجا آئی ہے، نیل بر تو مجھے ایک سیکنڈ کے لئے بھی دکھائی نہ دے، ورنہ تیرا خون میرے ہاتھ سے ہوگا اور ضرور ہوگا۔'' صندیر خان چلا رہا تھا، جیسے کبھی سردار کبیر خان چلاتا تھا، حمت سے یہ منظر دیکھا ہی نہ گیا، اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں، وہ دیوار سے لگ گئی اور وہ خوف سے تھرتھراتی تھی، اس کے حواس سرپٹ آریائی حملہ آوروں کی طرح آگے پیچھے بھاگتے ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

سامنے اونچی مسندوں پر بڑے بڑے متکبر سردار فروکش تھے، سردار بٹو، اس کا بڑا بھتیجا، پھر اس کا چھوٹا بھتیجا اور پھر اس کا معتمد خاص اور وہ سب خاموش تھے، آنکھوں میں غیض لئے نیل بر کو دیکھ رہے تھے، جبکہ حمت ابھی ان کے غیض اور نگاہ سے محفوظ تھی، کیونکہ وہ دیوار سے لگی کھڑی تھی، بس جہاندار کی نظر کا حصار اس کے گرد تن رہا تھا اور وہ ہر نظر سے جیسے بے نیاز تھی۔

وہ نیل بر کو کٹہرے میں کھڑا دیکھ رہی تھی، جسے شاید معلوب کیا جا رہا تھا؟ آہ، حمت سے سنا ہی

نہ گیا۔

نیل بر کو کیا خبر تھی؟ وہ کس گناہ کے رستے پہ چل پڑی؟ یہ ان سرداروں کی نگاہ میں قابل معافی گناہ نہیں تھا اور ہرگز بھی نہیں تھا، اس نیل بر بے خبر کو بھلا کیا خبر؟ سرکاری بنگلے تک جانا، پل صراط پہ چلنے کے مترادف تھا، تو کیا اسے جہاندار نے روکا نہیں تھا؟ اور وہ رکی نہیں، سمجھی نہیں، مانی نہیں، ضدی تھی نا، سرکش تھی نا، سردار بٹو کی جو اولاد تھی، تو باپ سے مختلف کیسے ہوتی؟

حمت کو لگا، یہ لوگ اس معمولی جرم کے بدلے میں نیل بر کو انارکلی کی طرح دیوار میں چنوا دیں گے، یا پھر ودھا کی طرح زمین میں گاڑ دیں گے اور ودھا وہ تھی جسے معلوب کر دیا گیا تھا اور ودھا وہ تھی جسے محبت کی راہ میں چلنے کے جرم میں سولی پہ چڑھا دیا گیا تھا اور ودھا وہ تھی جس کا ذکر اس گھر میں حرام تھا، مردار جانور کی طرح حرام، اسی طرح نیل بر کا ذکر بھی اس گھر میں حرام ہو جاتا، مردار جانور کی طرح ہی حرام اور ایسا ممکن تھا، بالکل ممکن تھا، ایسا ہونے والا تھا اور بالکل ہونے والا تھا۔

ودھا کی کہانی اس گھر میں پھر سے دہرائی جانی تھی اور بدقسمتی گھوم پھر کر ایک مرتبہ اور اس گھر میں ضرور آئی تھی، کیونکہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اور تقدیر پر سرکشوں کے متکبر چہروں پہ طمانچے مارنے ضرور آتی ہے۔

''تجھے ودھا کا انجام معلوم نہیں؟ تجھے ودھا کے انجام سے باخبر کیا گیا نہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ کیونکہ ممکن ہے؟ اس گھر کی بیٹیوں کو لڑکپن کی حدیں چھوڑتے ودھا کی کہانی نہیں سنائی جاتی؟ بول جواب دے؟ بولتی کیوں نہیں؟'' وہ کسی وحشی شیر کی طرح غرا رہا تھا اور نیل بر کا سارا اعتماد ہاتھوں سے نکلتا جا رہا تھا، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ یہ سب کیوں ہو رہا تھا؟ اس نے ایسا تو نہیں سوچا تھا؟ پھر یہ سب کیوں ہوا؟ اس کی غلطی کیا تھی؟ کیا امام فریدے کو دل میں بسانا؟ اسے آنکھوں میں بسانا؟ اسے راتوں کو جاگ جاگ کر سوچنا؟ تو کیا یہ گناہ تھا؟ اگر گناہ تھا تو صندیر خان کے سر تو نہیں آ رہا تھا، پھر اسے کیا پاگل پن کا دورہ پڑا ہوا تھا؟ نیل بر حیران تھی، پریشان تھی، متوحش تھی۔

ابھی تو اس نے اپنے دل کو ٹٹولا ہی نہیں تھا، ابھی تو اپنے جذبوں کی گہرائی ناپی ہی نہیں تھی، ابھی تو سنہری کرنوں سے خوابوں کو آنکھوں میں سجایا نہیں تھا اور یہ قیامت کی گھڑی آ گئی، اس کی جان کانپ رہی تھی، جسم کانپ رہا تھا، روح کانپ رہی تھی۔

جبکہ صندیر خان پوری قوت سے چلا رہا تھا، باقی سب اسے خاموش اور ساکت تھے جیسے ہال میں موجود ہی نہ ہوں، یا ان کی زبانیں مفلوج ہوں، یا بولنے کے لئے الفاظ ختم ہو چکے ہوں۔

نیل بر نے اپنے باپ کی طرف نگاہ کی، شاید وہ صندیر خان کے عذاب سے اسے بچا لیتے، لیکن اس کے باپ نے غصے کی انتہا پہ نگاہیں پھیر لی تھیں، نیل بر کو پہلا دھچکا تب لگا تھا اور دوسرا دھچکا تب لگا جب صندیر خان حمت کے سر پہ کھڑا اغرایا۔

''بول حمت! بتا اسے ودھا کون تھی؟'' صندیر خان نے حمت کو جھنجھوڑ ڈالا تھا، نیل بر کے جسم میں پھریری دوڑ گئی تھی، وہ حمت کو صندیر خان کے عذاب سے بچانا چاہتی تھی، لیکن اس کا جسم خوف سے مفلوج ہو رہا تھا، پاکستان آنے کے بعد پہلی مرتبہ یہ کیفیات اور ایسی صورت حال سے سامنا پڑا

تھا، نیل بر کے لئے یہ قیامت خیز گھڑیاں تھیں، ناقابل برداشت، انتہائی بھیانک۔

اور وہ ابھی سپت سندھو میں آریائی حملہ آوروں جیسی دھول اڑا رہا تھا جب حمت کی کپکپاتی کمزور بے بس اور نم ناک آواز سنائی دی تھی، یوں کہ نیل بر نے جہاندار کا چہرہ آگ کی طرح تپتا محسوس کیا تھا اور اپنے باپ کا چہرہ نفرت سے سیاہ پڑتا۔

''ودھا میری بہن تھی۔'' حمت کی آواز میں بیال کی وحشتوں کا درد کرلا رہا تھا اور وہ آنکھیں موندے ننگی تلوار پہ چل رہی تھی۔

جہاندار نے بے ساختہ آنکھیں موند لی تھیں اور اس کے چہرے پہ صحراؤں کی ریت اڑ رہی تھی، اس نے پلکوں کے اس پار دیکھا، پربت کی وادیوں کے اس پار سے، پہاڑوں کی اوک سے، پہاڑوں کی نوک سے، پہاڑوں کی اونچائیوں اور برف سے سفید کلس کے پیچھے سے، سپت سندھو میں آریائی حملہ آوروں کی دھول اڑ رہی تھی اور یہ ان کے قدموں کی دھول نہیں تھی، بلکہ اس عجیب و غریب، نادیدہ، تیز رفتار جانور کے سموں سے اٹھتی دھول تھی، جس پر وہ سوار تھے اور اس کی بستیوں، زمینوں، کھیتوں اور ان کی ہریاول کو روندتے چلے آ رہے تھے، ویرانی اور خشکی کے باشندے سبزے کی سرزمین پر چلے آ رہے تھے اور ان کی ٹانگیں ایک ایسے جانور کے پیٹ کے گرد کسی ہوئی تھیں جو اس نے اس سے پیشتر کبھی نہیں دیکھا تھا اور وہ اپنے خوبصورت بیلوں اور سست ہاتھیوں کے ساتھ ان کے مقابلے پر آ تو گیا تھا، لیکن ان بلاؤں کا کیا کرتا، جن پر سوار ہو کر وہ اوجھل ہو جاتے تھے، نظر آتے تھے پھر اوجھل ہو جاتے تھے۔

اس تیز رفتار جانور کا جسم پسینے سے لشکتا تھا، اس لمبے منہ اور بالوں والی گردن کے چوپائے میں ایک وحشی تکبر تھا، جو زمین پر اترا کر چلتا تھا، زمین پر ریت تھی، ریت کے اوپر وہ تھا اور اس کے اوپر طاقت ور فرعون۔

گلگت کی پرانی پولو گراؤنڈ کی سطح پہ ریت بچھی تھی اور گھوڑا اس پہ دوڑ رہا تھا، گراؤنڈ کے اس پار سفید محرابوں والی اونچی عمارت تھی، جس کی بالکونی میں جہاندار کھڑا تھا اور وہ لشکتے جثے لمبے منہ اور بالوں والی گردن، خوبصورت ٹاپوں والے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا، جس کا سوار یونانی نقوش کے عکس چراتا تھا، جس کی آنکھوں میں گلگت کا دریا بہتا تھا، جو نانگا پربت کی پہاڑی جیسا سخت، مستحکم، دلیر، نڈر اور مضبوط تھا، جس کے خواب بہت بلند تھے، جس کے حوصلے اور خیالات بہت بلند تھے۔

سفید جانور کی جلد قراقرم کی سیاہیوں کے اوپر پہلے چمکتے اور اب ماند پڑتے زرد سورج کی کرنوں میں رنگ بدلتی تھی اور اب اسی رنگ میں دمکتی تھی جو گلگت سے پرے ننگی چٹانوں کے اوپر جھانکتی ایک برف پوش چوٹی کا تھا۔

ہوا میں سرد سندیسے تھے، شام ہو رہی تھی اور پولو میچ جاری تھا، ان گھوڑوں کو یوں ہانپتے حملہ آور ہوتے دیکھ کر ایک قدیم خوف اس کے اندر انگڑائی لے کر جاگا تھا، کیا سفید گھڑ سوار ہار جائے گا؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، بالکونی میں کھڑا کم عمر لڑکا چلا رہا تھا۔

''فرخزاد کبھی نہیں ہارا، فرخزاد کبھی نہیں ہارا۔'' اس کم عمر لڑکے کی آواز ابھی تک جہاندار کے کانوں میں گونجتی تھی اور اس کا سانس گھٹ گھٹ کر فنا ہونے لگتا تھا، جی چاہتا پولو گراؤنڈ کے شروع

میں بنی اس سفید محرابوں والی عمارت کی بالکونی میں کھڑا ہو کر چلا چلا کر کہے۔

''فرخزاد ہار گیا، فرخزاد ہار گیا۔'' لیکن اس کے الفاظ اس کی سانس اس کے دم کی طرح اندر ہی گھٹ گئے تھے اور سماعتیں حمت کی کمزور بے بس اور نم ناک آواز کو سن رہی تھیں۔

''ودھا میری بہن تھی۔'' اس کی آواز نوحوں کی مانند ہال میں چکراتی تھی اور انار کے باغ سے بین کی آواز آتی تھی، کوئی بیال کی بستی میں بانسری کی دھن پہ موت کا گیت گا رہا تھا اور کوئی گلگت کی پرانی پولو گراؤنڈ کے پچھواڑے بنے سفید محرابوں والے گھر کی بالکونی میں کھڑا دہاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

''اور ودھا کہاں ہے؟'' صندیر خان حلق کے بل چلایا تھا، یوں کہ نیل بر نے مارے خوف کے اپنے بند ہوتے دل پہ ہاتھ رکھ لیا تھا، جبکہ حمت نے آنکھیں موند کر کسی کنویں میں چھلانگ لگاتے ہوئے اسی سرسراتی نم ناک آواز میں بتایا تھا۔

''ودھا زمین کے نیچے ہے۔'' حمت کی آواز میں شام اتر آئی تھی اور شام نے اداسی کی جھانجھریں پہن رکھی تھیں۔

''اور اسے زمین میں کیوں اتارا گیا؟'' سوالوں نے تلواریں پکڑ لی تھیں اور ہر تلوار کا وار حمت کے وجود کو زخم زخم کر رہا تھا۔

''اس نے جرم محبت کا اعتراف کیا تھا۔'' حمت کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔

''اس گناہ کی اسے کیا سزا ملی؟'' کوئی اس کے کان پاس چنگھاڑا تھا، حمت نے آنسوؤں کے سیلاب کو اندر دھکیلتے ہوئے جواب دیا۔

''زندگی کی قید سے آزادی۔'' اس کی آواز پھٹ پڑی تھی اور وہ اونچی آواز میں دہاڑیں مار مار کر رونے لگی، جہاندار نے اسے زخمی نگاہ سے دیکھا اور رخ پھیر لیا تھا، وہ صندیر خان کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

''تو اپنی اس عم زاد کو بتا دو حمت، ہمارے ہاں جرم محبت کی سزا سولی ہے، پھانسی ہے اور بھیانک موت ہے، اس کو سمجھا دو، اپنے قدموں کو سرکاری بنگلے کی طرف جانے سے روک لے اگر روک نہیں سکتی تو بتا دے، ہمیں قدم کاٹنے بھی آتے ہیں، سر قلم کرنے بھی آتے ہیں، زمین سے باہر نکالنا بھی آتا ہے، زمین کے اندر اتارنا بھی آتا ہے۔'' وہ آنکھوں کی وحشتوں کو اگلتا ابھی تک دہاڑ رہا تھا اور حمت بیال کی خاموش رات کے بعید کی طرح ساکت اور خاموش تھی، لیکن اس کا رواں رواں اقرار کر رہا تھا۔

وہ ایک قیامت سے گزری تھی، نیل بر ایک قیامت سے گزر رہی تھی، طوفان آیا تھا، لیکن چپکے سے گزر نہیں گیا تھا، بلکہ سردار بٹو کے محل میں ہمیشہ کے لئے ٹھہر گیا تھا، سکونت اختیار کر گیا تھا، رک گیا تھا۔

صندیر خان شعلے اگل کر پرسکون اب بھی نہیں ہوا تھا، اس کا سکون نیل بر نے اڑا دیا تھا، اس کا سکون نیل بر نے تہہ بالا کر دیا تھا اور اس کا چین جولین کی قدیم بدھ درس گاہوں کی دھول زدہ رہداریوں اور خانقاہوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا، وہ اپنا سکون کہاں سے تلاشتا؟ اس کا سکون تو سردار

بٹو کی خود سر اولاد اپنے دل کے بدلے بیچ رہی تھی، وہ مجرم کسے ٹھہراتا؟ خان سردار بٹو کو جو اس کے خاندان کی اونچی روایتوں کو مسمار کرنے اور بنیادیں ہلانے کا عزم کر چکی تھی؟ اور پربت کے اس پار ایک قیامت کھڑی تھی۔

جہاندار نے طویل اور گہرا سانس خارج کر کے خود کو بہت پرسکون اور ڈھیلا محسوس کیا تھا، اس کی آنکھیں دور بہت دور گلگت کی سرسبز وادی کے ہریالے عکس سے چمکتی تھیں اور پرانی پولو گراؤنڈ کا پچھلے حصہ اور سفید محرابوں والی بالکونی میں کھڑا نوعمر سا لڑکا، وہ مشکی گھڑ سوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے وکٹری دکھا رہا تھا۔

''اور محبت کو زوال نہیں، موت بیوپار نہیں، زندگی وفادار نہیں اور فرخزاد کے لئے کوئی ہار نہیں کوئی ہار نہیں۔'' اس کی آنکھوں کے پار پربت کے شہزادے کو دیکھا تھا، فرخزاد کے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں دلفریبی سے گونجتی تھی، حالانکہ وہ پولو کے میدان سے جا رہا تھا، وہ جہاندار کی زندگی سے جا رہا تھا، لیکن وقت ایک مرتبہ پھر ودھا اور فرخزاد کو ان کی زندگیوں میں واپس لا رہا تھا۔

جہاندار نے آسمان کو بدلتے دیکھا، سورج کو مغرب میں ڈھلتے دیکھا، اس نے اللہ کے انصاف کو اترتے دیکھا، دور آسمانوں سے، نیلگوں روشن دانوں سے، سنہری چراغ خانوں سے۔

☆☆☆

قیامت ٹھہر گئی تھی، گزری نہیں تھی، رک گئی تھی، ڈھلی نہیں تھی، تھم گئی تھی، کیونکہ اسے تھمنا ہی تھا، بٹو محل میں قیام کرنا ہی تھا، دوسروں کی زندگی کو اذیت ناک ہوئے یہ متکبر لوگ کیوں بھول گئے تھے کہ ایک دن ایسی قیامت سے انہیں بھی گزرنا ہی ہوگا۔

ہال میں ابھی تک کورٹ سجا تھا، ایک عدالت قائم تھی، جس کا جج اور جیوری ابھی تک صحرا کا سورج بن کر نہیں قہر بن کر آگ اگل رہے تھے۔

وہاں ایک کونے میں چپکے سے آئی سبا خانہ کھڑی تھی، ایک اطالوی تخت پہ بی جاناں پورے جلال سے فروکش تھیں اور گہری نفرت بھری نگاہوں سے نیل بر اور حمت کو گھور رہی تھیں۔

وہیں ہال میں شیشے کی دیوار سے کچھ دور جہاندار آ کھڑا تھا اور اس قیامت کو کروٹ بدلتے دیکھ رہا تھا، ان سب میں سب ایک وہی تھا، بلا کا پرسکون۔

بالکل سامنے ہی چوبی ستون سے کچھ آگے سردار کبیر بٹو قہر بن کر اپنی نور نظر کو گھور رہا تھا، جبکہ صندیر خان نانگا پربت کے جلال کی مانند بپھرا ہوا تھا، شاہوار بٹو کی کیفیات بھی مختلف نہیں تھیں، غیرت اور حمیت کے معاملے میں وہ اپنے پرکھوں سے کسی طور بھی کم نہیں تھا۔

ایک البیلی سی لڑکی کی انگلی دبوچے ننھی سی کم سن بچی، جس کے ہاتھ میں پھولوں کی ٹوکری تھی، جسے اٹھا کر وہ نیچے بستی میں اتر رہی تھی، سنہرے خوابوں کی بستی میں، نیلی آرزوؤں کی بستی میں، ارغوانی تمناؤں کی بستی میں، اودھی خواہشوں کی بستی میں، حمت کی کیفیت سے قطعاً مختلف نیل بر کی کیفیات تھیں، وہ ایک شال میں ڈال دینے والی لمحاتی کیفیت اور اثر سے نکل چکی تھی۔

اب وہ ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھی اور ایک ایک بات کا مفہوم سمجھ رہی تھی، جیسے

جیسے اسے اس عدالت کے سجنے کا مقصد اور مطلب سمجھ آرہا تھا، ویسے ویسے اس کا غصہ بڑھتا جارہا تھا، پھر ایک مقام پہ اس کا غصہ سوا نیزے پہ پہنچ گیا تھا۔

تو گویا جہاندار ہی اس عدالت کے سجانے کا اصل موجب تھا، یعنی جہاندار نے اپنی اوقات دکھا دی تھی، وہ اتنا باخبر ضرور تھا جو نیل بر کے اندر اتری کھلبلی مچاتی تبدیلیوں کو کھوج لیتا، اس نے نیل بر کے دل کا راز پالیا تھا اور وہ اس کی نگرانی پہ تو ازل سے مامور تھا، اسے خبر تھی نیل بر کی روٹین کے بارے میں، وہ جانتا تھا نیل بر مڑ مڑ کر سرکاری بنگلے میں کیوں جارہی تھی؟

اور جب وہ نیل بر کا راز پا گیا تو اس نے بنو محل کے فرماں رواؤں کو باخبر کرنے میں لمحہ بھی نہیں لگایا تھا، گویا اس نے اپنی فرمانبرداری کا پورا ثبوت پیش کر دیا تھا، گویا اس نے اپنی وفاداری پہ مہر ثبت کر دی تھی۔

وہ بنو محل کا اصل نگہبان، پاسبان اور دربان تھا، محل کی اونچی عمارت کے کلس پہ سجی سجائی ان کی عزت اور دستار کا محافظ، تو گویا وہ سردار بنو سے لے کر بی جاناں کا آج کے بعد سے منظور نظر تھا۔

یعنی جہاندار کی تپسیا کام آ چکی تھی، وہ ان کا اعتبار اور اعتماد جیتنے میں کامیاب ہو گیا تھا، لیکن اس سارے عمل میں اس نے نیل بر کے اعتبار کو بری طرح سے کھو دیا تھا، جس کی اسے پرواہ نہیں تھی، جس چیز کی اسے پرواہ تھی، وہ فی الوقت جہاندار کو حاصل تھی۔

نیل برا سے نفرت اور زہر بھری نگاہ سے دیکھ رہی تھی اور جہاندار اس نگاہ سے قطعاً بے نیاز تھا، گویا اسے نیل بر کی بیزاری اور نفرت کی کوئی پرواہ نہیں تھی، وہ بڑی بے نیازی کے ساتھ شیشے کی دیوار کے پار انار کا باغ دیکھ رہا تھا، جس سے بہت آگے بہت دور، پھسو کونز کی تکونی چٹانیں تھیں، اپنی ساخت کے لحاظ سے بے حد عجیب اور حیرت انگیز، ایسی غیر حقیقی نوک دار پہاڑیاں جو پوری دنیا میں کہیں نہیں تھیں، یہ ایک حیران کن لینڈ اسکیپ تھی اور اس پہ سے نظر نہیں ہٹتی تھی، نیچے دریا بہتا تھا جس پر روشنی کم ہوتی جارہی تھی، کیونکہ سورج ڈھل رہا تھا، جیسے نیل بر کے نام کا سورج ڈھل رہا تھا۔

لیکن اس کے باوجود پھسو کونز کی متعدد نوک دار چوٹیوں پر دھوپ اس طرح سے تھی جیسے انہوں نے سورج کی روشنی میں سے ایک ایک غوطہ لیا اور بھیگ کر سیدھی ہو گئیں، انہیں ٹاپ ڈن بھی کہا جاتا تھا، یعنی جن چٹانوں پر سورج کی آخری شعاعیں پڑتی تھیں۔

اور یہ منظر نیل بر کی نگاہ کا زہر دیکھنے سے کئی درجے بہتر تھا، وہ ان پھسو کونز کو دیکھنے بے شمار مرتبہ اس کے ساتھ آیا تھا، اس کے سیاہ مشکی گھوڑے پر بیٹھ کر اور وہ پربت کا شہزادہ تھا، جو جھک جھک کر اس کے سنہرے گالوں کو چومتا دور بنو محل کے اونچے کلس کی طرف اشارہ کرتا تھا اور اس کے لہجے میں ہنزہ کے بہتے دریاؤں کی روانی ہوتی تھی۔

''جہانی! او جہانی!'' وہ اس کے سنہرے گال کھینچتا شوخ پریوں سی ہواؤں کے ہاتھ پیغام عشق بھیجتا تھا۔

''محبت دل کا سجدہ ہے۔'' وہ اسے گدگداتا، ہنساتا اور بنو محل کے سنہرے کلس کی روشنی اس کی گہری فسوں خیز آنکھوں میں بھر جاتی تھی۔

وہ پربتوں کا شہزادہ تھا، لیکن پربتوں کا باسی نہیں تھا، وہ پربتوں کا عادی نہیں تھا، اس لئے پربتوں نے اسے ڈھانپ لیا تھا، نگل لیا تھا۔

جہاندار کی آنکھوں میں صحراؤں کی ریت بھر رہی تھی، وہ فرخزاد کے خیالوں سے پیچھا چھڑاتا واپس اس منظر میں لوٹ آیا تھا، وہ منظر جو آنکھوں میں سکون کی شعاعوں کو کوٹ کوٹ کے بھر دیتا، جہاندار اسی منظر میں زندہ رہنا چاہتا تھا، اسی منظر میں سانس لینا چاہتا تھا، وہ نیل بر کی نفرت انگیز نظروں کو دیکھنا چاہتا تھا اور نیل بر کی کیفیات اس پل کیا تھیں؟ اسے اپنے اس گھر سے، اپنے ان رشتوں سے حتیٰ کہ اپنے باپ سے نفرت ہو رہی تھی، جو اس قدر تنگ دل اور تنگ نظر تھا۔

اگر وہ اس قدر تنگ ذہن تھا؟ تو ایک آزاد خیال فرہنگن سے شادی کیوں کی؟ اگر شادی کر لی تھی تو اس آزاد خیال عورت کے بطن سے اولاد کیوں پیدا کی؟ کیا تب سردار بنو جانتا نہیں تھا، وہ اپنی ماں کی طرح آزاد خیال ہو سکتی تھی؟ وہ اپنے حق کے لئے آواز اٹھا سکتی تھی اور اپنے سردار باپ، غیرت مند تایا زاد بھائیوں کے سامنے اپنی پسند کا اس قدر دیدہ دلیری کے ساتھ اعتراف کر سکتی تھی؟ اس بات سے بنو محل کا کوئی فرد بھی واقف نہیں تھا۔

اگر واقف تھا تو جہاندار، اسے خبر تھی، نیل بر اب کیا کرنے والی تھی؟ نیل بر کے ارادے کیا تھے؟ اور وہ کون سا اسم پھونک کر ان سب کو پتھر بنانے کے لئے تل رہی تھی، جہاندار نے ایک گہرا طویل سانس لے کر اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا، اب ضد، انا اور ہٹ دھرمی کی جنگ کا آغاز ہونے والا تھا۔

نیل بر کی انا کو ٹھیس پہنچائی گئی تھی، اسے بھری محفل میں ذلیل کیا گیا تھا اور اس کی ذات پہ انگلی اٹھائی گئی تھی، یوں اسے بے جرم رسوا کیا گیا تھا اور یہ جرم معمولی نہیں تھا۔

جہاندار نہیں جانتا تھا، نیل بر کے منہ زور جذبوں کی گہرائی کہاں تک تھی؟ اور وہ سرکاری ڈپٹی سرویئر جنرل کی محبت میں کس حد تک آگے جا چکی تھی؟ وہ اس بات سے واقف نہیں تھا لیکن اسے اتنی خبر ضرور تھی کہ محبت چاہے منہ زور تھی یا نہیں، لیکن اس وقت نیل بر کا غصہ، توہین اور انا بہت منہ زور ہو رہی تھی اور اس نے پوری عدالت، جیوری، جج اور فیصلے کا لب لباب سمجھ لیا تھا، جس کے تناظر میں اس پہ سخت قسم کی پابندیاں لگا دی گئی تھیں۔

وہ گھر سے نہیں نکل سکتی تھی، وہ آج کے بعد گھر میں قید تھی، اسے ڈپٹی سرویئر جنرل کا نام تک بھول جانے کا حکم ملا تھا، ان رستوں کی طرف دیکھنا تو کجا سوچنے تک کی بھی اجازت نہیں تھی اور یہ لوگ کون ہوتے تھے نیل بر خان پر الزام لگانے والے، حکم چلانے والے اور پابند سلاسل کرنے والے؟ آخر یہ لوگ ہوتے کون تھے؟ کون؟ آخر کون؟ اس نے آگ اگلتی شعلہ فشاں نگاہوں سے ایک ایک چہرے کو گھورا اور نفرت سے چلا کر بولی تھی۔

''میں نیل بر کبیر خان ہوں، کریشان کی بیٹی، مجھ پر تم لوگوں کی رسومات، اقدار اور پابندیوں کے حکم عائد نہیں ہوتے، میں آزاد ملک کی آزاد پیداوار ہوں، میں اپنے فیصلوں میں خود مختار ہوں، آزاد ہوں، تم میں سے کون ہے جو مجھے روک سکے، پابند کر سکے اور مجھ پہ اپنا حکم مسلط کر سکے؟ کون ہے آخر؟'' اس کی آواز میں پربتوں کا جلال عود آیا تھا اور ہال کمرے میں موت کا سا سناٹا تیرنے

لگا، ہر کوئی دہنگ ہوا، حیران ہوا، ششدر رہوا، منجمند ہوا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے بڑمحل کے سرداروں کی آنکھیں لہو رنگ ہو گئیں، چہرے انگارے بنے اور نفرت و غصے کی انتہا پربتوں کی بلندیوں سے کہیں بڑھ کے تھی۔

''بابا خان! سن لیں، آپ باپ ہیں میرے، مجھے آپ کو بتانا ہے اور آپ تک اپنی خواہش کو پہنچانا ہے، میں اسی ڈپٹی سروئیر کو اپنا دل دے آئی ہوں، میں اس سے محبت کر آئی ہوں، سنا آپ نے، کوئی روکنے کی طاقت رکھتا ہے تو روک کر دکھائے؟'' اس نے چیلنج بھری نگاہوں سے ایک ایک فرد کا غیرت سے سرخ اور سیاہ پڑتا چہرہ دیکھا تھا، انگارہ ہوتا چہرہ دیکھا تھا اور بی جاناں نے جیسے اپنا دل تھام لیا تھا۔

''ایسی بے حیائی؟ ایسی بے حمیتی؟ ایسی بے شرمی؟ ایسی دیدہ دلیری؟'' ہر آنکھ پتھرا رہی تھی اور ہر دماغ مفلوج ہو رہا تھا۔

ایک وہی تو تھا، پرسکون، پرچین، جیسے اسے یقین تھا، یہ سب تو ہونا ہی تھا، ابھی نہ ہوتا تو ایک دو ماہ بعد ہو جاتا، ہونی کو کون ٹال سکتا تھا؟ وہ ایک پل چہرے کو پڑھتا بڑا ہی پرسکون اور ٹھہرا ہوا تھا اور نیل بر کے الفاظ جہاندار کی میموری بکس میں جمع ہو رہے تھے۔

''بابا خان! سن لیں، مجھے آپ کو ہی بتانا ہے، آپ تک اپنی تمنا کو پہنچانا ہے، میں اس ڈپٹی سروئیر کو اپنا دل دے آئی ہوں، میں اس سے محبت کر آئی ہوں، سنا آپ نے، کوئی روکنے کی طاقت رکھتا ہے تو روک کر دکھائے؟'' نیل بر چلا چلا کر اپنے الفاظ دہرا رہی تھی اور جہاندار اس کی بہادری اور جوانمردی پہ قطعاً حیران نہیں تھا، کیا کمال کا جگر پایا تھا؟ کیا کمال کا انداز پایا تھا؟ کیا کمال کا دل پایا تھا۔

''میں اپنا دل دے آئی ہوں، میں اس سے محبت کر آئی ہوں۔'' جہاندار اس کے لفظ لفظ کو تول رہا تھا، ترازو کے پلڑوں میں؟ ان میں سے کون سا لفظ زیادہ بھاری تھا؟ کس جملے میں زیادہ وزن تھا؟ کیسی شان بے نیازی تھی؟ گویا دل نہیں، کوئی عام سی معمولی سی دو ٹکے کی چیز لٹا آئی تھی اور جیسے محبت نہیں، کوئی بیوپار کر آئی تھی، کیا کمال کا شاہانہ انداز تھا، قابل تعریف، قابل توصیف؟ قابل توجہ، جہاندار کی ستائش بھری آنکھوں میں چمک اتر رہی تھی۔

''ہوں، تو سردار بڑو کی نور نظر کو اتنا ہی دلیر ہونا چاہیے۔'' اس نے دل ہی دل میں اس کا شانہ تھپک کر ڈھارس پہنچائی تھی۔

جبکہ پورے ہال میں ایک خوفناک سناٹا دریا کی لہروں، ہاں بپھری ہوئی لہروں کی مانند شور مچاتا تھا، بڑمحل کے سرداروں کی آنکھیں لہو رنگ تھیں اور ضبط کے آخری کناروں پہ کھڑے چنگھاڑ رہے تھے۔

''بدبخت خاموش ہو جا، تجھے اپنی جان کی پرواہ نہیں؟ مجھے تیری جان کی پرواہ ہے، تیری جان میں میری جان ہے نیل بر، میری نگاہ سے دور ہو جا، دفع ہو جا، اپنی شکل گم کر لے اور ہزار مرتبہ استغفار پڑھ کے میرے سامنے آنا، تیرے خون سے میں اپنے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا۔'' وہ بوڑھا شیر اپنی کچھار میں غرا رہا تھا، پھنکار رہا تھا، دھاڑ رہا تھا، جہاندار کی آنکھوں میں مصنوعی تاسف بھر گیا تھا۔

''تم پہ یہ وقت بھی آنا تھا سردار؟'' اس کا مصنوعی تاسف افسوس میں بدلتا جا رہا تھا، پھر جہاندار نے مجمعے کو چھٹتے دیکھا، صندیر خان کو جاتے جاتے بھی گرجتے دیکھا۔

''آپ کے پاس صرف ایک ہفتے کا وقت ہے سردار خان بڑو! اس بے حیا کا ٹھکانہ کر لیں، ورنہ اسے آپ نہیں، میں زمین کے اندر گاڑھ دوں گا، یہ کون ہوتی ہے، ہماری غیرت کو سرکار کے اس پسماندہ بنگلے کی چار دیواری میں رولنے والی۔'' وہ ضبط کا آخری زہر بھرا گھونٹ بھرتا باہر نکل گیا تھا، اس کے پیچھے شاہوار بھی چلا گیا، تن فن کرتی نیل بر بھی پاؤں پٹختی نکل گئی، بی جاناں اور سبا خانہ بھی اس کے پیچھے سردار بڑو اور جہاندار اکیلے رہ گئے تھے، اپنی اپنی سوچوں میں گم اور وہ تو جہاندار تھا، وہی جہاندار جس کی آنکھوں میں فرخزاد بستا تھا اور وہی سردار بڑو جس کی آنکھوں میں نیل بر کا پیار بستا تھا، جہاندار سوچ رہا تھا، سردار بڑو کس طرح سے اپنی روایات سے ٹکرا کر جان عزیز بیٹی کے لئے خوابوں کا محل کھڑا کرے گا؟

اور سردار بڑو سوچ رہا تھا، وہ کس طرح سے نیل بر کی خودسری، ضد، ہٹ دھرمی اور منہ زور جذبوں کی چٹانوں کو پاش پاش کرے گا؟ اس کا حل کیا تھا؟ ایک ہفتے بعد کیا ہونے والا تھا؟

صندیر خان اسے حکم دے کر چلا گیا تھا اور ایک ہفتے بعد اسے اپنا حکم سنانا تھا اور اس کے بعد کیا ہونا تھا؟ سردار بڑو کی ذات اور شخصیت کی عمارت میں زلزلہ آ گیا، انہوں نے ہاتھ بڑھا کر جہاندار کا سہارا لیا، جہاندار نے ان کو آگے بڑھ کر سہارا دیا، تو اب معتمد خاص سے مشورہ طلب کرنا تھا، اس نے گہرا سانس بھر کے اعصاب کچھ اور پرسکون کر لئے تھے۔

''جہاندار جاناں!'' اس طرز تخاطب پہ جہاندار کے دل میں نیزے اتر گئے تھے، اسے کوئی بڑی شدت سے یاد آیا تھا۔

''حاضر خاناں۔'' اس نے خان کا ہاتھ تھام لیا، تب اس پہ انکشاف ہوا، پربتوں کا یہ سردار بری طرح سے کانپ رہا تھا، بری طرح سے ہانپ رہا تھا، کیا غصے سے؟ کیا ذلت کے احساس سے؟ کیا نفرت کے احساس سے؟ کیا خوف کے احساس سے؟ جہاندار سب سمجھ گیا، اسے سب سمجھنا آتا تھا، پربتوں کے اس بے رحم سردار کو خوف کا احساس کانپنے پہ مجبور کر رہا تھا، نیل بر کی دیدہ دلیری کے بعد سنائے جانے والے فیصلے کی انتہا کا خوف؟

''جہاندار جاناں! اس کو سمجھاؤ، موت کو آواز مت دے، اس کو روکو، ورنہ صندیر خان اپنے انداز میں ہمیشہ کے لئے روک دے گا، وہ اعتراف گناہ کر گئی ہے، اس ناسمجھ کو اس گناہ کی سزا کا علم ہی نہیں۔'' بوڑھا سردار خوف اور صدمے کے زیر اثر کرلایا تھا، اس کی غیرت پہ کیسے کیسے تازیانے لگے تھے، کوئی بوڑھے سردار کا دل کھول کر دیکھتا تو کانپ جاتا۔

''اعتراف محبت کا گناہ؟'' جہاندار نے جیسے تصحیح کی تھی، بوڑھے سردار کی آنکھوں میں لہو کھول اٹھا تھا اور ماتھے کی رگیں پھڑکنے لگیں۔

''اس کو سمجھا دو، اس گناہ کی میرے علاقے میں، میرے خاندان میں، میرے قبیلے میں کیا سزا ہے، اس کو بتا دو، وہ انگاروں پہ نہ چلے، وہ ودھا گلفام نہ بنے، اس کو پاگل پن میں پڑنے سے روک لو۔'' اس کا وجود ابھی تک کانپ رہا تھا۔

"اس جرم کی سزا؟" جہاندار نے سمجھ کر جیسے سر ہلا دیا تھا۔
"آہ، سزائے موت ہے۔" وہ سر ہلاتا جا رہا تھا اور سمجھتا جا رہا تھا، یعنی ودھا کی قبر کے سرہانے ایک اور قبر بننے کی تیاری ہے جس پہ کبھی عمر بھر کے لئے نہ کوئی چراغ جلے گا اور نہ کوئی فاتحہ پڑھے گا، نہ کوئی ذی روح اس طرف جانے کی جرأت کرے گا، تنہا دو قبروں کے ساتھ ایک اور قبر کا اضافہ ہو جائے گا، روایات کے باغی، منہ زور جذبوں کے قیدی، محبتوں کے مجرموں کی سردار کبیر خان بٹو کے علاقے اور قبیلے میں یہی سزا رائج تھی، قرنوں سے، صدیوں سے، سالوں سے، نسلوں سے، پرکھوں سے۔

☆☆☆

نشرہ کے لئے پھپھو کی کال اچنبھے کا باعث تھی۔
وہ جب سے گئی تھیں دوبارہ رابطہ نہیں کیا تھا، بلکہ دوسرے معنوں میں نشرہ کے وجود کی بھرپور نفی کی تھی، یہ نہیں تھا کہ وہ نیچے یا اوپر کال نہیں کرتی تھیں، ان کی فون پہ بات ضرور ہوتی تھی یہ اور بات تھی کہ نشرہ کو فون پہ بلانا اپنی توہین سمجھتی تھیں۔
پہلے تو نہیں، البتہ نشرہ کو اب اندازہ ہو رہا تھا، پھپھو نے ولید کی ضد کے سامنے صرف سر جھکایا تھا، اپنا دل ہرگز نہیں جھکایا تھا، دل تو ان کا عینی میں اٹکا ہوا تھا، کیونکہ جب بھی ان کی کال آتی، بطور خاص عینی کو بلا کر بات کرتی تھیں، تب نشرہ کے دل پہ کیا گزرتی؟ اس سے کوئی واقف نہیں تھا اور آج نجانے کیا ہوا تھا، پھپھو نے اسے فون پر بلا لیا، نشرہ کے لئے حیرانی ہی حیرانی تھی، فون پہ فارمل سا احوال پوچھنے کے بعد انہوں نے ایک نیا حکم نامہ سنایا تھا۔
"تم برتن مانجھنے کے علاوہ بھی کوئی کام کر لو، یہاں مجھے میڈ کی ضرورت نہیں ہے، سب کام طریقے سے ہو جاتے ہیں، میرے اپنے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں، تم کسی انسٹی ٹیوٹ کو جوائن کرو، کوئی انگلش اسپوکن کورس کرو، خود کو بدلو، یہاں چار لوگوں میں تمہارا تعارف کرواؤں تو شرم ساری نہ ہو، کمال ہے، آج کل کی لڑکیوں والی بات ہی کوئی نہیں، رات کو ولید بھی کہہ رہا تھا، نشرہ خاصی بیک ورڈ ہے، کم از کم سوسائٹی میں موو کرنا تو سیکھو، عینی کو دیکھ کر بھی تمہارا دل خود میں چینج لانے کو نہیں مچلتا؟" پھپھو کی آدھے گھنٹے کی تقریر نے نشرہ کو خوش تو کیا اور بھی غمگین کر دیا تھا، اس کے دل کو بڑا ہی زور کا دھچکا لگا۔
"تو کیا ولید نے بھی کہا، میں بیک ورڈ ہوں، صدیوں پرانی، بوسیدہ اور آج کے دور میں قطعی طور پر مس فٹ؟" نشرہ کے دل سے یہ پھانس نکل نہیں سکی تھی، اس کا دل بھر بھر آ رہا تھا، پھر اس نے خود کو تسلی دے لی تھی، کیا خبر پھپھو نے خود سے جان بوجھ کر کہا ہو، بھلا ولید ایسی بات کر سکتا تھا؟ اس سوچ نے دل کو قدرے ڈھارس پہنچا دی تھی۔
لیکن برا ہو اس کے نصیب کا، اتنے دنوں بعد بالآخر ولید کو بھی نشرہ کا خیال آ گیا تھا، رات کو ولید کی بھی کال آ گئی، پہلے تو اس نے اپنی مصروفیت کی کہانی سنائی، چلو ٹھیک تھا، وہ مصروف ہی ہو گا، نشرہ نے کون سا شکوہ کیا تھا؟ مگر بعد میں اس نے بھی اپنی ممی والی کہانی شروع کر دی تھی۔
"نشرہ! تمہیں ایک بات کہوں؟ پلیز برا تو نہیں مانو گی؟" ولید نے ازلی نرم انداز میں گفتگو

کے لئے تمہید باندھی تو نشرہ سمجھ گئی تھی، ولید کو بات کیا کرنی تھی؟ وہی پھپھو والی؟ میں اس کا اپنی ماں والا انداز نہیں تھا، ان سے بہت مختلف انداز تھا۔

”نشرہ! دیکھو، انسان ہمیشہ ایک سرکل ایک دائرے میں نہیں رہتا، اسے بہت سے نئے ماحول اور نئی دریافتوں سے گزرنا پڑتا ہے، اس لئے چاہیے کہ خود میں تھوڑی سی تبدیلی لائیں، اپنے لئے نہ سہی، دوسروں کے لئے، دیکھو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن میرے گرد رہنے والوں کو فرق پڑتا ہے، ممی چاہتی ہیں تم خود میں تھوڑا چینج لاؤ، تاکہ یہاں ایڈجسٹ کرنے میں تمہیں آسانی رہے۔“ ولید نرمی کے ساتھ بہت ساری باتیں اسے سمجھاتا رہا تھا، وہ باتیں جو وہ یہاں نہیں کر سکا تھا، اسے بتا نہیں سکا تھا اور نشرہ نے خود بھی محسوس نہیں کیا، وہ آج کے دور کا ہی انسان تھا، چمک دمک سے کیسے گریز برت سکتا تھا، روشنی کی دنیا سے یہاں آیا تو اسے نشرہ بہت اچھی لگی، قدیم سی، پرانی، بوسیدہ مگر قیمتی نوادرات جیسی، اب واپس اپنی دنیا میں جا کر اسے وہی چمک دمک اچھی لگ رہی تھی، نشرہ اس کی بات کا لب لباب سمجھ گئی تھی۔

اسے نشرہ تو چاہیے تھی، مگر عینی کے لبادے میں ملفوف یا عینی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی، وہ بار بار اسے ایک ہی بات سمجھا رہا تھا۔

”تم عینی کی کمپنی میں رہو، اس سے سیکھو، دیکھو پہننے اوڑھنے کا سلیقہ آنا چاہیے، وہ بہت ماڈرن نہیں ہے، نہ وہ لبرل یا ویسٹرن ڈریسز پہنتی ہے، اس کے باوجود اس کا پہناوا بہت خوبصورت ہوتا ہے۔“ ولید پہ اتنی دور جا کر عینی کی خوبیاں منکشف ہو رہی تھیں اور نشرہ کی وہ خوبیاں جو اسے خوبیاں لگتی تھیں، اب خامیوں میں لپٹی نظر آ رہی تھیں، یہ نشرہ کی بدقسمتی کا پھیر نہیں تو اور کیا تھا؟ تو ایک بات ازل سے طے تھی۔

نشرہ کی بدقسمتی کا ہیر پھیر ازل سے لے کر ابد تک اس کے ہمراہ رہنا تھا، اسے نہ بدلنا تھا، نہ بدلنا آتا تھا اور نہ بدلنے کے لئے ذرائع تھے، نہ پیسہ تھا، نہ مواقع، وہ اتنی بڑی بات صرف چند دنوں میں دوبئی میں جا کر بھول چکا تھا؟ کہ دوسروں کے سہاروں پہ جینے والی خود میں تبدیلی لانے کے لئے پیسہ یا مواقع کہاں سے لاتی؟

☆☆☆

اور اس کے سامنے ندی کا وہی پل کھڑا تھا۔

لکڑی کا خطرناک سا پل اور اس پہ چلتا اسامہ اور کندھے پہ لٹکتا بیگ جس کے اندر فن گندھارا کا وہ مجسمہ موجود تھا، جو اسی ندی کے اندر ڈوب کر ہمیشہ کے لئے اسامہ کی پہنچ سے دور ہو گیا تھا۔

اس عظیم ٹکر کی بدولت، وہی ٹکر جو عشیہ کو اسامہ سے متعارف کروا گئی تھی اور اسامہ کو عشیہ سے، انہوں نے بہت لمبی ملاقاتیں نہیں کی تھیں، بس ایک دو اتفاقیہ ٹکراؤ کے علاوہ کچھ نہیں تھا، پھر بھی دلوں کے یہ تار ایک دوسرے کے ساتھ بندھ گئے تھے۔

وادی کا سورج اس وقت تابناک تھا اور سورج کا عکس ندی کے پانی پہ لہرا رہا تھا، بالکل اس نسخے کی مانند جو اس ٹکراؤ کی وجہ سے پانی کے اندر گر گیا تھا، یہ وہی پل تھا، لکڑی کا پل اور دو دلوں کو

جوڑنے والا پل، محبت کا پل، ایک نئے بندھن سے آشنا کرنے والا پل۔

دل کی خالی زمین پر محبت کی فصل کاشت کرنے والے بیج وادی کی زرخیز مٹی میں بکھر رہے تھے اور وہ ایک ایک بیج سے نکلتے پودے کی شاخوں پہ کھلتے شگوفوں کو دیکھ کر مسحور کھڑا تھا۔

سامنے پھولوں کا ایک کھیت تھا اور چھوٹی چھوٹی ڈھلانیں تھیں، اس سے بہت دور نوکیلی چوٹیوں کے بہت قریب پولو کا پرانا گراؤنڈ تھا، جس کے پچھواڑے میں سفید محرابوں والی عمارت تھی، جس میں اتنی بالکونیاں تھیں کہ دیکھنے والی آنکھ حیران ہی رہ جاتی، چار جانب بالکونیاں ہی بالکونیاں، لیکن اسامہ کو ان بالکونیوں والی عمارت کے پاس نہیں جانا تھا، اسے پھولوں کے کھیت سے گزر کر اس دومنزلہ مکان تک آنا تھا، جس کا پتہ ہیام نے تھمایا تھا اور جس میں وہ پہلی مرتبہ نہیں بلکہ دوسری مرتبہ آیا تھا، ایک مرتبہ عشیہ کی ماں کو دوائیاں پہنچانے اور دوسری مرتبہ اس وقت، جب وہ اپنے دوست کا پیغام اور امانت لے کر آیا تھا۔

اسامہ کی آنکھیں حیرت سے کھل گئی تھیں اور وادی کا سنہرا سورج اس کی آنکھوں میں پگھلتا تھا، وہ عشیہ کے مکان کے سامنے کھڑا تھا اور وہ عیشہ کے مقام کے سامنے کھڑا تھا، اسامہ کے دل کو پھیریاں سی لگ گئیں۔

کیا تقدیر ایسی مہربانیاں بھی کرتی ہے؟ اور بالکل کرتی ہے، ضرور کرتی ہے، تقدیر کی ستم ظریفی کے اور عنایتوں کے کیا ہی کہنے تھے، اسامہ اتنا حیران تھا کہ بولنا بھی محال ہو گیا اور عشیہ بھی جیسے پتھر کی مورت میں ڈھل گئی تھی، اسامہ کا اس کے گھر چلے آنا؟ ایک قیامت نہیں تھی تو کیا تھا، جو سوچوں سے خیالوں سے خوابوں سے نکل کر مجسم آ کھڑا ہوا تھا۔

عشیہ کا دل پولو کے گھوڑوں کی مانند سرپٹ بھاگنے لگا، دھول اڑانے لگا اور خوف سے چکر کھانے لگا اور ابھی عروفہ کان دباتی، منہ پہ ہاتھ رکھتی بھاگ کر مورے کے کانوں میں صور پھونکنے جا رہی تھی کہ ”مورے! غضب ہو گیا، عشیہ کا عاشق صادق گھر تک پہنچ گیا۔“

وہ اپنے مذموم ارادوں کی تکمیل ہی نہیں کر سکی تھی، جب ایک ٹھہری ہوئی شستہ سلجھی مگر نرم آواز ساعتوں میں روانی سے اتر آئی تھی۔

”میں اسامہ جہانگیر ہوں، لاہور سے آیا ہوں، ہیام میرے گھر میں رہتا ہے، اس کی امانت پہنچانے آیا ہوں، ہیام کا دوست ہوں، دل دار ہوں، نیا نیا بنا یار ہوں۔“ اس نے آگے بڑھ کر ذرا جھجکتے ہوئے مورے کو سلام کیا تو مورے کے چہرے پہ، ہاں پتھریلے چہرے پہ سالوں بعد ہلکی سی مسکراہٹ چمک کر معدوم ہوئی تھی، ان کا ہاتھ اسامہ کے جھکے کندھے پہ ٹھہر گیا۔

”مہمان آیا ہے، بسم اللہ۔“

(جاری ہے)

فلک ارم ذاکر

''خلیل جبران کہتا ہے ''تم جس سے محبت کرتے ہو اسے آزاد چھوڑ دو اگر وہ تمہارا ہے تو تمہارے پاس لوٹ کر آئے گا۔''

اور پروین شاکر نے اس بات کا ذکر یوں کیا ہے۔

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات اچھی ہے میرے ہرجائی کی

نجانے کب کے پڑھے ہوئے اقوال اور شعر آنیہ کو یاد آئے اور ساتھ ہی ان سے جڑے اختلاف کے پہلو ''بقول آنیہ جو ہمارا ہے اسے کہیں اور جانے کی ضرورت ہی نہیں وہ ہمیشہ ہمارا ہی رہے گا اور جو چھوڑ کر چلا جائے وہ گویا کبھی ہمارا تھا ہی نہیں۔'' اب اپنے ہی کہے لفظ اس کا منہ چڑاتے تھے۔

''لیکن ارحم آپ تو میرے تھے آپ نے کیسے راہ بدل لی کیوں کیا ارحم کیوں کیا آپ نے ایسے۔'' آنیہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔

رات گہری اور خاموش تھی صحن میں بچھی چارپائیوں پر سب نفوس نیند کی آغوش میں سمائے دنیا سے بے خبر تھے ایک آنیہ ہی تھی جو گزشتہ چھ ماہ سے ہر رات پل پل انگاروں پہ لوٹتے، کروٹ بدلتے اور روتے ہوئے گزارتی، اس کے لئے تو یہ خیال ہی سوہان روح تھا کہ اس کا ارحم کسی اور کے ساتھ...... اس کے آگے تو سوچ کر ہی دماغ کی رگیں پھٹنے لگتی تھیں۔

آٹھ سالہ مزمل کے رونے کی آواز نے آنیہ کی سوچوں میں بے اختیار خللِ ڈالا تھا، اپنے

مکمل ناول

آنسو پونچھ کر اس نے جلدی سے کروٹ بدلی اور ساتھ والی چارپائی پر روتے ہوئے مزمل کو تھپکنے لگی۔

''امی! پاپا کب آئیں گے، مجھے پاپا کے پاس جانا ہے۔'' مزمل کی بات پر آنیہ کے رکے ہوئے آنسو بے بسی سے پھر سے بہنے لگے۔

''بیٹا آ جائیں گے آپ سو جاؤ شاباش۔'' وہ مزمل کو کھوکھلے دلاسے دے کر بہلانے لگی۔

کبھی اس کا گھر خوشیوں کا گہوارہ ہوا کرتا تھا، آنیہ نے ارحم کے ساتھ شادی کے اٹھارہ سال بے حد مطمئن و خوش و خرم گزارے تھے، اللہ نے انہیں چار عدد بیٹوں عاشر، احمر، آفاق اور مزمل سے نوازا تھا، آنیہ کو بیٹی کی بے حد آرزو تھی مگر وہ اللہ کی رضا پہ شاکر تھی۔

آنیہ خود کو کچھ عرصہ پہلے تک دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھتی، چاہنے اور بے حد خیال رکھنے والا شوہر، فرمانبردار بچے، محبت کرنے والی شفیق ساس جو آنیہ کی ممانی بھی تھیں گو کہ آنیہ اور ارحم کا رشتہ بڑوں کی رضامندی سے طے ہوا مگر اس میں ارحم کی ذاتی پسند بھی شامل تھی۔

ارحم کا ماربل کا اپنا چھوٹا سا بزنس تھا، کاروبار کے سلسلے میں اکثر اوقات وہ کئی کئی دن شہر سے باہر گزارتا، آنیہ کو ارحم کی محبت پر اندھا اعتماد تھا، تبھی تو گزشتہ ڈیڑھ سال سے ارحم پندرہ دن بعد کاروباری دورے پر کراچی جانا اور واپس لوٹنے کا نام ہی نہ لیتا، آنیہ اپنی سادہ لوح طبیعت کے باعث اس کے لئے کبھی کوئی بدگمانی یا شبہ تک دل میں نہ لا سکی۔

آنیہ جب ارحم کی جدائی میں اس کی دید کو ترس جاتی اور اسے جلد واپسی کے لئے اصرار کرتی تو ارحم حیلے، بہانے سے اسے مطمئن رکھتا۔

''ماما آخر پاپا نے کراچی میں ایک اور ماربل کے بزنس سے ہی ہماری اچھی گزر بسر ہو جاتی ہے پھر دو دکانیں بھی تو پاپا کی ملکیت میں ہیں جو انہوں نے کرائے پر اٹھا رکھی ہیں اچھی خاصی رقم بن جاتی ہے ہر ماہ، پھر کیوں پاپا ہم سے دور جاتے ہیں۔'' آنیہ کا بڑا بیٹا عاشر جو ایف اے آئی سی ایس سال دوم کا طالب علم تھا، باپ کی حد درجہ مصروفیات پر کبھی کبھی عاجز آ کر سوال اٹھاتا۔

''بری بات ہے بیٹا آخر ارحم یہ سب تم لوگوں کی وجہ سے ہی تو کرتے ہیں تم لوگوں کے روشن مستقبل کی خاطر دن رات محنت کر کے کماتے ہیں۔''

''ماما لیکن ہم سب ہی پاپا کو مس کرتے ہیں ہمیں ان کی فکر ہوتی ہے ایسے تو وہ اپنی صحت خراب کر لیں گے باہر ہوٹل کا کھانا کھانا پڑتا ہوگا انہیں۔'' عاشر فکرمندی کا اظہار کرتا۔

''ہاں ہمارے پاپا دنیا کے بہترین پاپا ہیں۔'' احمر جو میٹرک کا طالب علم تھا فخر و محبت سے لقمہ دیتا۔

''پاپا اس بار ہم سب کے لئے کیا گفٹ لائیں گے۔'' 7th کا طالب علم آفاق بہت اشتیاق و تجسس سے استفسار کرتا اور مزمل کے ساتھ مل کر مختلف قسم کے اندازے لگاتا، آنیہ سب کی باتوں پر زیر لب مسکرا دیتی۔

☆☆☆

وہ سردیوں کی ایک چمکیلی صبح تھی اور اتوار کا دن تھا، آنگن کے در و دیوار پر بہت دنوں کے بعد یوں بے فکری سے ہر سو دھوپ نے ڈیرے جمائے تھے۔

آنیہ کی ساس عالیہ بیگم آنگن میں بچھے تخت پر براجمان نہایت اطمینان سے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے دھوپ کے ساتھ کینو سے بھی لطف اندوز

ہو رہی تھیں، جبکہ آنیہ گنگناتے ہوئے کچن میں مختلف ڈشز کی تیاری میں مصروف تھی کہ آج شام ارحم کی آمد متوقع تھی، احمر کچن میں ماں کے ساتھ ان کا ہاتھ بٹانے میں مگن تھا، جبکہ آفاق اور عاشر گھر کی صفائی ستھرائی میں لگے تھے اور مزمل اپنے کھیل میں۔

''بھائی ہم لڑکیاں تو نہیں ہیں پھر یہ سارے لڑکیوں والے کام ماما ہم سے کیوں کرواتی ہیں۔'' آفاق وائپر لگاتے ہوئے منہ بسور کر گویا ہوا اور ہزار بار کا کیا گیا سوال پھر دہرایا۔

''یار دیکھو بہن تو کوئی ہے نہیں، تو اس لئے ماما کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹانا ہمارا فرض ہے اور اسی لئے ماما نے ہم سب کو بچپن سے ہی گھر کے چھوٹے موٹے کام خود کرنے کی عادت ڈالی ہے۔'' عاشر نے جھاڑو سے ماربل کا فرش رگڑ رگڑ کر دھوتے ہوئے تفصیلاً سمجھایا۔

''آئے ہائے ایک اتوار کے دن ہی تم لوگ ذرا ماں کو آرام دیتے ہو ورنہ روز پڑھائی کی مصروفیات میں تم لوگوں کو وقت ہی کہاں ملتا ہے، یہ آفاق تو کام چور نکل رہا ہے آنیہ آفاق کو ابھی سے سدھار لو مشرقی لڑکوں کے یہ گن نہیں ہوتے۔'' عالیہ بیگم نے کینو کھاتے ہوئے لمبا چوڑا لیکچر جھاڑا جسے آخر میں مذاق کا رنگ دے دیا اور خود ہی ہنس پڑیں۔

ساری تیاریاں خوش اسلوبی سے مکمل کر کے وہ سب لوگ بن سنور کے شدت سے ارحم کے منتظر تھے، جب داخلی دروازے کی گھنٹی بجی، آفاق، مزمل خوشی سے لپکتے ہوئے باہر پہنچے، آنیہ بھی مسکرا کر آنگن میں ارحم کے استقبال کو نکل آئی، تیز ہوا اس کے وجود سے ٹکرائی تو اس نے بے ساختہ گرم شال کا اپنے وجود کے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا۔

موسم نے اچانک رخ بدلا تھا، فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی، سرد ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے، لیکن آنیہ موسم کے ہر احساس کو نظر انداز کیے خاموش نگاہوں سے ارحم کے ساتھ اندر آتی ایک فیشن ایبل سی دوشیزہ کو دیکھے گئی۔

وہ بائیس تئیس سال سے زیادہ کی ہرگز نہیں تھی، سرو قد، متناسب سراپا، جدید اسٹائل میں تراشے گئے بال، پیازی رنگت، چاند چہرہ، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، بلاشبہ وہ بے حد خوبصورت لڑکی تھی، جدید اسٹائل کے میرون کڑھائی والے آسمانی سوٹ میں میک اپ سے مزین اس کا گلاب چہرہ خوب دمک رہا تھا۔

یکدم آنیہ کو عجیب سی وحشت ہونے لگی اس کا دل اسے کسی انہونی سے آگاہ کرنے لگا، لیکن وہ دل کے خدشے، وہم جھٹک کر بس ٹکر ٹکر ارحم کا خوشی سے دمکتا پرسکون چہرہ اور جذبے لٹاتی نگاہیں دیکھتی رہی جو صرف اس انجان حسینہ پر مرکوز تھیں آنیہ کے وجود کو وہ دیکھ کر بھی انجان تھا یا دیکھا ہی نہ تھا، وہ سمجھ نہ سکی۔

تمام اہل خانہ کو ایک پل کے لئے سانپ سونگھ گیا تھا، ماحول پر عجیب سی خاموشی طاری دیکھ کر عالیہ بیگم اپنے کمرے سے باہر نکل آئیں۔

''پاپا یہ کون ہیں؟'' عالیہ بیگم اور آنیہ کے دماغ میں کلبلاتے سوال کو بچوں نے زبان دے دی اور ارحم کا جواب نہیں بلکہ ایک دھماکہ تھا جو اس نے کیا، آنیہ کے وجود کے پرخچے اڑ گئے۔

''یہ میری وائف ہے۔'' بچے خاموش تھے، عالیہ بیگم خوب واویلا کر رہی تھیں ارحم کو کوس رہی تھیں، مگر آنیہ تو ان سب میں موجود ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھی۔

حیرت، بے یقینی، غم و غصہ، صدمہ نجانے کن

کن کیفیات نے بیک وقت اس کے وجود پر حملہ کر دیا، وہ لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے کو ہٹ گئی اور برآمدے کے ستون سے لگ گئی، جس کے نتیجے میں ستون سے لپٹی خزاں رسیدہ زرد پتوں والی بیل نے اس کے وجود پر سوکھے زرد پتوں کی بارش سی کر دی۔

آنیہ نے دیکھا سرما کی نرم گرم دھوپ تو اس کے آنگن سے کب کی ڈھل چکی تھی، آسمان پر چھائے گہرے بادلوں نے شام سے پہلے شام کر دی، خنک ہواؤں نے آنیہ کے وجود کو منجمد کر دیا تھا اور آنگن میں تیزی سے سوکھے زرد پتے اڑانے لگیں۔

''آنیہ اب پہلے جیسی خوبصورت نہیں رہی وہ میرے ساتھ اب نہیں چل سکتی بس یہ وجہ ہے ورنہ مجھے کوئی شکایت نہیں ہے اس سے اور یہی احسان بہت ہے کہ دوسری شادی کے باوجود میں نے آنیہ کو طلاق نہیں دی، یہ یہاں رہ سکتی ہے میرے گھر میں۔''

ارحم عالیہ بیگم کی نجانے کس بات پر برہمی سے انتہائی کھردرے انداز میں وضاحت پیش کر رہا تھا۔

''بے شرم، بے غیرت، بچے جوان ہو رہے ہیں تیرے، تو نے ان کا بھی نہ سوچا۔'' عالیہ بیگم روتے ہوئے نجانے اور بھی کیا کچھ کہہ رہی تھیں بچے سہم کر آنیہ کی طرف لپکے محبت کرنے والے باپ کا یہ روپ بھلا کب دیکھا تھا۔

آسمان پر بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی کڑک کے بعد بارش کا پہلا قطرہ ان کے آنگن میں گرا۔

آنیہ نے تڑپ کر بچوں کو اپنے ساتھ لگا لیا اور پھر ایک کے بعد ایک آنسو اس کا چہرہ اور بارش کے قطرے تیزی سے اس کا آنگن بھگونے لگے۔

ارحم اپنی نئی نویلی بیوی کو لئے اوپر کے پورشن میں بنے اپنے اور آنیہ کے بیڈروم کی سمت جا چکا تھا، آنیہ کی طرف اس نے ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

☆☆☆

ٹوٹا اک وصل کا تارا تھا
پھر شہر ہجر ہمارا تھا
تیرے غم کی راہ پہ چلتے ہوئے
تیری یاد کا صرف سہارا تھا

ارحم کی بے اعتنائی، بے رخی، اجنبیت بھرا انداز بیگانہ رویہ آنسو کے وجود کو پتھر بنانے کے لئے کافی تھا، نجانے کتنا وقت بیت گیا تھا، برآمدے کی اندرونی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر اسے یوں گم صم بت بنے بیٹھے، دیوار اور فرش کی ٹھنڈک اور دسمبر کے برفاب مہینے کی برستی تیز بارش میں بھیگے یخ بستہ ہوا کے جھونکوں نے اس کے وجود کو سن کر دیا تھا، مگر وہ اردگرد کے ماحول اور سردی کے منجمد کر دینے والے احساس سے قطعی لاتعلق سی ایک کے بعد ایک ذہن میں در آنے والی سوچوں اور خیالوں کے لامتناہی سلسلے میں الجھی خالی الذہنی کی حالت میں بیٹھی تھی، اس کا دل ساری حقیقت آنکھوں سے دیکھ کر بھی قبول کرنے سے انکاری تھا، وہ خود نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کیا سوچ رہی ہے۔

عالیہ بیگم نے بچوں کے کمرے سے نکل کر کوئی دسویں بار دلان کی دیوار کے ساتھ بت بنی بیٹھی آنیہ پر نگاہ کی اور تاسف سے لب کچلنے لگیں۔

شام کو اچانک ارحم کی جانب سے دی گئی خبر نے ان کو خود بے حد گہرے دکھ اور رنج سے دوچار کیا تھا، مگر بچوں کے ساتھ لپٹ کر روتی بلکتی آنیہ

اور سسکتے تڑپتے بچوں کو آگے بڑھ کر انہوں نے جیسے تیسے سنبھالا تھا، اور پوتوں کو تسلی آمیز کھوکھلے دلاسے دے کر جب بہلا پھسلا کر انہیں کمرے میں بیٹھا کر ماں کو کچھ دیر اکیلا چھوڑنے کی تلقین کرتی وہ باہر آئیں تو ان کا کلیجہ اپنی بیٹی جیسی پیاری بہو کو دلان میں اس حالت میں بیٹھے دیکھ کر منہ کو آنے لگا۔

گزشتہ کئی گھنٹوں سے وہ آنیہ کو وہاں سے اٹھانے اور اس کی چپ کو توڑنے کی اپنی سی کئی کوششیں کر چکی تھیں مگر بے سود، وہ جانتی تھی اس کے اوپر کیا قیامت بیت رہی ہو گی مگر اس طوفانی سردی میں اس کے اس طرح سے بیٹھے رہنے سے ان کے دل میں ہول اٹھ رہے تھے انہیں اس کی صحت اور سلامتی کی فکر ہو رہی تھی، انہوں نے اک نظر ہنوز سابقہ انداز میں براجمان دلان میں انرجی سیور کی دودھیا روشنی میں خاموش نگاہوں سے آنگن میں برستی طوفانی موسلا دھار بارش شور مچاتی ہواؤں اور دیوار و در سے لپٹے اندھیرے کو دیکھتی آنیہ پر ڈالی اور گرم شال سے اپنا کپکپاتا بھاری بھرکم وجود سنبھالے اس کے قریب چلی آئیں۔

''میری بچی چلو اٹھو اب اندر چل کر بیٹھو۔''

ان کی بات نے اس کی پوزیشن پر کوئی اثر نہ کیا۔

''آنیہ تم بیمار پڑ جاؤ گی اپنا نہیں تو بچوں کا خیال کر لو اس بوڑھی ماں پر ترس کھا لو کچھ، ان ہڈیوں میں اتنا دم ختم نہیں رہا کہ جاڑے کی برفانی رات میں اس ٹھنڈک کو جھیل سکیں اندر چل کر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔'' ان کی جذباتی بلیک میلنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنیہ نے اس عرصہ میں پہلی بار نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا تھا، ان کے چہرے کی جھریوں میں آنسو رستہ بناتے نیچے اتر رہے تھے۔

''امی! ارحم وہاں میری جگہ کسی اور کے ساتھ۔'' اس نے پہلی بار لب وا کیے اور کپکپاتے لرزتے انداز میں جیسے ارحم کی شکایت کی اور یکلخت ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

عالیہ بیگم نے بے چارگی سے اوپر کے پورشن کی طرف نگاہ کی اور اسے شانے سے لگائے تھپکتے ہوئے دھیرے سے اٹھایا، اٹھنے کی سعی میں بے اختیار ایک طویل آہ اس کے لبوں سے نکلی ایک ہی پوز بنائے رکھنے سے اس کی ٹانگیں اکڑ گئیں تھیں، عالیہ بیگم دھیرے سے اس کی ٹانگوں کو سہلانے لگیں۔

''اس سے اچھا تھا آنیہ ارحم مر جاتا، تم بیوہ ہو جاتیں۔''

''اللہ نہ کرے۔'' وہ بے اختیار دہل کر انہیں دیکھے گئی، وہ ایک ماں ہو کر اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کی تمنا کر رہی تھیں۔

''کم از کم وہ دکھ تو جھیل لیا جاتا کہ اللہ نے لے لیا اسے، زمانے میں عزت تو رہ جاتی، اس عمر میں ایسا کام کر کے بڑھاپے میں میرے سر میں خاک ڈلوا دی کہیں منہ دکھانے قابل نہیں چھوڑا۔'' لمحہ بھر کے توقف سے اپنی بات کی طویل وضاحت انہوں نے سسک کر مکمل کی۔

''نہیں امی اللہ ارحم کو میری عمر بھی لگا دے، وہ ایک بار مجھے کہتے ان کی خوشی کے لئے کچھ بھی کر جاتی، مگر ایسے......'' وہ ایکدم سے تڑپ کر رو دی۔

''اور......او......ر...... وہ......تو...... کہتے تھے، میں صرف آنیہ کا ہوں آنیہ کے سوا ارحم کسی کا نہیں ہو سکتا، وہ...... انہوں نے...... کہا کہ تم میری زندگی ہو، وہ سب...... وہ سب جھوٹ تھا کیا؟'' آنسوؤں کی روانی میں ٹوٹتے ہوئے بے ربط اور کبھی رواں انداز میں ارحم کی مختلف مواقع پر

زندگی میں کہی گئی باتیں انہیں بتاتے ہوئے استفہامیہ انداز میں ان سے پوچھنے لگی، عالیہ بیگم اس کو کھڑا کرنے کی سعی میں اب کامیاب ہو گئی تھیں، مگر ان کے پاس آنیہ کے سوا بھی سوال کا جواب نہیں تھا، وہ اس کے کندھے کے گرد بازو حمائل کیے اسے اپنے کمرے کی اور لے آئیں اور اپنے ساتھ بیڈ پر لٹا لیا وہ چاہتی تھیں کہ آنیہ کے دل میں جو کچھ ہے وہ بولے کچھ تو کہے ارحم کو، کو سے برا بھلا ہو جائے، مگر آنیہ ان کے ہر انداز سے کی نفی کر رہی تھی، نہ کوئی ہائے واویلا کیا نہ ارحم سے نفرت کا اظہار، اب بھی کمبل میں منہ دیئے آنکھیں موندے سونے کی ایکٹنگ پر عالیہ بیگم نے چپکے سے لائٹ بجھا دی، پھر بھی ارحم کی حرکت پر چلتے کڑھتے روتے ہوئے وہ آنیہ کے بولنے کی کچھ کہنے کی منتظر رہیں مگر بے سود، انہوں نے بے اختیار اک سرد آہ خارج کی شاید وہ نہیں جانتی تھیں کہ جس ہستی سے شدت سے محبت کی جائے اس کی طرف سے دیا دھوکہ بے وفائی عورت کو جیتے جی مار دیتی ہے اور پھر درد اپنی پوری گہرائیوں سے قاصر رہتے ہیں، رنج کی انتہا صرف دل جانتا ہے یا پھر خاموشی سے بہتے تنہائی میں بولتے گزرے دنوں کی یاد دلاتے آنسو اور آنسوؤں نے اس بھیگی رات کی بے سکوں خاموشی میں ہمیشہ کے لئے آنیہ کی آنکھوں کا رستہ دیکھ لیا تھا اور وہ رات آنیہ کے اندر اپنا دامن پھیلا کر سدا کے لئے اس کے آنسوؤں اور درد کی ہمراز و امین بن گئی تھی۔

اگلے دو دن تک اسے شدید بخار اور زکام نے آ گھیرا اس کا بی پی خطرناک حد تک گر گیا تھا، عالیہ بیگم کے ہاتھ، پاؤں پھول گئے بچے اپنا غم بھلا کر ماں کی سلامتی کے لئے فکر مند ہو گئے۔

عاشر اسے قریبی پرائیوٹ ہوسپٹل لے گیا بروقت ٹریٹمنٹ ملنے سے اسے بچا لیا گیا مگر چاروں بچے اس صورتحال سے حواس باختہ ہو گئے تھے، ارحم کو ان سب نے اک امید کے تحت آگاہ کیا تھا مگر ارحم کی بے حسی اور کٹھور پن کی بدولت وہ سب اس سے دل ہی دل میں متنفر ہو گئے تھے مگر ادب و لحاظ کی بنا پر کچھ کہہ نہ پائے۔

''ارحم نے کہا تھا وہ عورت جیئے یا مرے میری ذمہ داری نہیں ہے ناں وہ ناں تم سب۔''

عاشر، احمر، آفاق ضبط سے سرخ چہرہ لئے خاموشی سے پلٹ آئے مزمل نا سمجھ تھا پلٹ پلٹ کر پکارتا رہا ''پاپا آپ نے ہم سے کٹی کیوں کر دی پاپا'' مگر ارحم اپنی نئی نویلی بیگم کے ساتھ کار میں بیٹھ کر باہر نکل گیا، عالیہ بیگم یہ سب سن کر آگ بگولہ ہو گئیں جب ہوسپٹل میں عاشر نے انہیں روتے ہوئے سب گوش گزار کیا، لیکن آنیہ کی مخدوش حالت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انہوں نے سب کچھ اس سے مخفی رکھا۔

''ماما، پاپا نے ہم سے کٹی کر دی آپ بھی ہم سے کٹی ہیں کیا آپ بات نہیں کریں گی تو ہم نے کیا کیا جو آپ دونوں کٹی ہو گئے ہم سے، اب ہمارا کیا ہو گا، ہم ایسے کیسے رہیں گے۔''

آٹھ سالہ مزمل کی باتوں نے جیسے آنیہ کو اندر تک سے جھنجھوڑ ڈالا یہ اتنا سا بچہ کیا کہہ رہا تھا بدلتے رویوں کی گتھیاں سلجھانے میں ہلکان وہ بلکنے لگا تھا، اس نے اپنی بیماری کے دوران شاید پہلی بار ارحم کے علاوہ کسی اور کے متعلق سوچا وہ اپنے غم میں اپنے بچوں اور گھر کی ذمہ داریوں کو یکسر فراموش کر گئی تھی۔

☆☆☆

اسے ہوسپٹل سے ڈسچارج ہوئے آج دوسرا دن تھا اس کی آنکھیں دہلیز پر ارحم کے قدموں کی آہٹوں کی آس سے ہٹ کر کچھ دیکھنے

کے قابل ہی کہاں رہی تھیں اب جو آگہی کا احساس ہوا تو مزمل کو بھینچ کر سینے سے لگا لیا پھول سے چہرے کملا کر رہ گئے تھے اتنے دن سے سکول کالج غرض ساری دنیا سے ناطہ توڑے صرف گھر اور ماں کی ہستی تک محدود ہو گئے تھے۔

عاشر، احمر کچن کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھے ساتھ عالیہ بیگم کچھ ہاتھ بٹانے کی کوشش میں ہلکان رہتیں اتنے برسوں میں آنیہ کی خدمتوں میں پلنگ توڑنے کی عادت پڑ گئی تھی اب اتنا سا کام کر کے ہی ہانپ جاتیں اور کچھ ان کی عمر کا تقاضا بھی تھا، آفاق بچارا گھر کی صفائی ستھرائی میں لگا رہتا یا چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھ کر نجانے کیا کچھ سوچتا رہتا۔

اور مزمل نے گھبرا کر ماں سے بات کر لی تھی، جس نے آنیہ کو بہت سی حقیقتوں سے روشناس کرا دیا۔

''میری جان ماما آپ سے کبھی کٹی نہیں تھیں ناں کبھی ہوں گی آپ سب کے لئے ماما نے جینا ہے آپ سب ماما کا سہارا ہو، زندگی ہو، ماما نے آپ سب کو بہت بڑا اور اچھا انسان بنانا ہے۔'' وہ ذرا کی ذرا جبراً مسکرائی۔

اپنے بچوں کے مستقبل کو سنوارنے کی لگن نے اسے پھر سے حوصلہ ہمت اور نئی توانائی سے نوازا تھا۔

''احمر کل سے پڑھائی پر دھیان دینا ہے بس میرا بیٹا اب یہ گھر کے کام چھوڑو اور سب کے یونیفارم نکال کر صبح کے لئے پریس کر کے اپنے بیگز، کتابیں چیک کر کے رکھو۔''

احمر کے ہاتھ سے سوپ کا پیالہ پکڑ کر شفقت سے اسے اپنے پاس بیڈ پر بٹھا کر نصیحت کی، بچے ماں کی ذرا سی توجہ پا کر ہی کھل اٹھے، عالیہ بیگم نے آنیہ کی حالت میں تبدیلی دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا، وہ اسے تھوڑا سا وقت سنبھلنے کے لئے دینا چاہتی تھیں اور چاہتی تھیں کہ اسے از خود اپنے اردگرد کا احساس ہو، جو احساس از خود ہو وہ زیادہ گہرا ہوتا ہے۔

اسی پل عاشر کمرے میں داخل ہوا اس کے ہاتھ میں دوائیوں کا لفافہ تھا جو وہ ڈاکٹر کے نسخہ کے مطابق میڈیکل سٹور سے خرید کر لایا تھا، دوائیوں کا شاپر سائیڈ ٹیبل پر ٹکا کر وہ دادی کے بیڈ پر نیم دراز تکیوں کے سہارے بیٹھی ماں کے پہلو میں جا کر بیٹھ گیا، اس کے چہرے پر تفکر اضطراب و تذبذب کے آثار تسبیح پڑھتی عالیہ بیگم کے ساتھ ساتھ آنیہ نے بھی واضح طور پر محسوس کیے۔

''کیا ہوا بیٹا؟'' آنیہ کے استفسار پر وہ ایکدم سے بکھر گیا۔

''ماما میڈیکل سٹور یہاں سے کافی فاصلے پر مین روڈ پر واقع ہے مگر وہ سٹور والے انکل تک کو پاپا کی دوسری شادی کا علم ہے اور وہ اسی بابت مجھ سے دریافت کر رہے تھے۔'' لمحہ بھر کے توقف سے اس نے سلسلہ کلام پھر سے جوڑا۔

''محلے کے بچوں سے لے کر بزرگ اور خواتین تک راہ چلتے آواز دے کر روک لیتے ہیں اور طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں ہمدردی کی آڑ میں جلے پر نمک چھڑکتے ہیں ہمارے گھر کے ماحول اور آپ کے وجود میں خامیاں تلاش کرنے کی کوشش میں لگے ہیں تاکہ دوسری شادی کی کوئی معقول وجہ مل سکے۔''

کمرے کے اندر تمام نفوس دم سادھے اس کی گفتگو سن رہے تھے ایک مزمل تھا جو ناسمجھی کے عالم میں سب کی اشکبار نگاہیں دیکھ کر سمجھنے کی کوشش میں مگن تھا۔

''ہاں دادی مجھ سے اور آفاق سے بھی

سب ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔" اب کے احمر نے آنسو ضبط کرنے کی سعی میں لرزتی آواز میں بیان کیا۔

"پاپا نے ہمیں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا، ماما ہم اب یہاں نہیں رہیں گے نانو کے گھر چلتے ہیں بہاولپور، یہاں نہیں رہنا ماما، اس گھر میں تو بالکل نہیں۔"

عاشر ماما کے کندھے سے لگ کر سسکنے لگا اور پھر آنسوؤں کا نہ رکنے والا ساون ان سب کی نگاہوں سے بہنے لگا، سب کو سسکتا دیکھ کر ننھا مزمل متوحش سا آنسو بہانے لگا اور دادی کی گود میں سر دے دیا۔

"آنیہ تمہارا جو فیصلہ ہوگا میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن میں صرف تم لوگوں کی وجہ سے اس گھر میں رہ رہی ہوں جس دن تم لوگ یہاں سے گئے مجھے بھی یہاں نہیں پاؤ گے۔" عالیہ بیگم چھکوں پھکوں سوں سوں کرتی بہو کے بولنے کی منتظر تھیں، روکنا چاہتی تو کس منہ سے کس آس کے بل بوتے پر اس کے راستے میں حائل ہو کر دامن تھامتیں۔

"بچوں یہ رونا تو اب نصیب میں لکھا ہے مگر گھر چھوڑ کر نہیں جانا، کہیں نہیں، کبھی نہیں، لوگوں کا کام باتیں بنانا ہے انہیں اپنا کام کرنے دو کسی کی پرواہ نہ کرو تم سب کو ہمت، حوصلے سے کام لینا ہے اچھا شاباش۔" اس کی بات پر سب ششدر رہ گئے اور اس کی ساس خوشی سے اسے لپٹا کر رو دیں جو باتیں وہ بہو کے بنا کہے سمجھ گئی تھیں بچے اس گہرائی سے نابلد تھے، تبھی "کیوں" کیوں کی گردان کرنے لگے۔

"آپ کے پاپا نے جو کچھ کیا ہے اسے کہیں نہ کہیں ہم سب تسلیم کر چکے ہیں اور یہ گھر ہمارا ہے اپنا گھر چھوڑ کر کسی اور کے در پر جانا حماقت ہے، اس سے ہماری مشکلات میں اضافہ ہوگا کمی نہیں۔" وہ رسان سے بچوں کو سمجھانے لگی جبکہ ان کی دادی متاثر کن انداز میں اسے دیکھ رہی تھیں۔

"آپ سب کی تعلیم کا حرج ہوگا اور پھر دنیا میں تماشا الگ بنے گا، ابھی تو ہم اپنے گھر میں بیٹھے ہیں اور بہاولپور میں سب رشتے داروں کو کوئی خبر نہیں ہے۔"

"زمانے کی نظر میں، میں ارحم کی بیوی ہوں اور اس گھر میں مجھے اور میرے بچوں کو ارحم کی توجہ نہ سہی مگر ساری آسائشات اور دو وقت کی روٹی تو مل جائے گی، بچوں کے روشن مستقبل کے لئے میں یہیں اسی گھر میں رہوں گی۔" اب وہ صرف ایک ماں بن کر سوچ رہی تھی۔

بچوں کو اپنے فیصلے کے روشن پہلوؤں سے آگاہ کرتی آنیہ نے ٹھنڈی طویل سانس خارج کر کے گفتگو کا آخری حصہ اپنی ساس پر نگاہ مرکوز کیے مکمل کیا، وہ اسے اپنے ساتھ لپٹائے فرط مسرت سے رونے لگیں، اس کے فیصلے کے احترام میں بچے خاموش رہے۔

"مجھے فخر ہے تم میری بہو ہو تم ایک عظیم عورت ہو، ارحم بدنصیب ہے جو ہیرا چھوڑ کر کوئلہ لے آیا، اس گھر سے تم نہیں بلکہ وہ جائے گی ایک دن انشاء اللہ۔"

"چھوڑیں امی وہ بیوی ہے ان کی، اس کا بھی حق ہے اس گھر پر اور ارحم پر۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز لرز گئی تھی، اس نے بچوں کو کھانا کھانے کے لئے باہر بھیج دیا۔

"ارے کیسی بیوی اس نے تمہارے حق پر تمہارے شوہر پر ڈاکہ ڈالا ہے، شریف عورتوں کے یہ چھن نہیں ہوتے۔" بچوں کے باہر نکلتے ہی عالیہ بیگم چمک کر گویا ہوئیں، ان کی بات پر وہ

چپ چاپ سی اور سوچ میں مگن ہوگئی۔

"اے آنیہ بچی تم ایکبار اس سے بات تو کر کے دیکھو اپنے حقوق کے لئے، اگر اسے چھوڑ نہیں سکتا تو الگ گھر میں رکھے۔" انہوں نے سرگوشیانہ انداز میں مشورہ دیا، جیسے انہیں مان ہو کہ وہ آنیہ کی بات رد نہیں کرے گا، اسے ان کی معصومیت پر ہنسی آ گئی۔

"اوں۔" وہ حق دق اسے ہنستا ہوا دیکھے گئیں گویا اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو گیا تھا انہیں۔

"امی ان کے جذبات اور نگاہ بدل چکی ہے، آپ کس مان کی بات کر رہی ہیں؟ وہ مان تو اس شام ہی چپکے سے میرے دل کے ساتھ ٹوٹ گیا جب وہ اس لڑکی کے ساتھ آئے تھے، ان کی خوشی کسی اور سے وابستہ ہے تو یونہی سہی، میں نے سوچ لیا ہے ان سے کچھ نہیں کہنا، جو ہے جیسے ہے ٹھیک ہے۔" بات کرتے کرتے اس نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر کرب سے آنکھیں موند لیں اور گہرے سانس بھرنے لگی، جیسے بے حد طویل مسافت طے کر آئی ہو، تھکان اس کے وجود میں دھیرے سے اترنے لگی، عالیہ بیگم خاموشی سے باہر نکل آئیں۔

صحن میں رات کے اندھیرے نے ہر سو اپنے ڈیرے جما رکھے تھے، دلان کی دیوار سے لپٹی خزاں رسیدہ بیل کے بیشتر پتے زرد تھے اور آدھی سے زیادہ بیل کو تند ہوا کے جھونکوں نے سر ٹکرا ٹکرا کر بنجر کر دیا تھا اور ہوا باقی ماندہ پتے بھی جھاڑنے پر کمر بستہ تھی، ہوا کے خنک اور نم جھونکے بار بار بیل کی شاخوں سے گلے ملتے اور نتیجتاً آنگن میں یہاں سے وہاں ماربل کے فرش پر سوکھے زرد پتے بکھر جاتے۔

عالیہ بیگم نے اک نظر خزاں کی زد پر آئی بیل کو دیکھا انہیں وہ آنیہ کی زندگی کے موجودہ دور کا حصہ لگی زرد رتوں کا دکھ سہتی ہوئی ہوا کی زد پر بے بس، انہوں نے بے اختیار اک طویل سانس یخ بستہ فضا کے سپرد کی اور سرد فضاؤں کا خمیازہ چھینکوں کی صورت بھگتی ہوئی بچوں کے کمرے میں پناہ لی۔

☆☆☆

"تمہیں معلوم ہے آنیہ، تمہاری کس چیز نے مجھے تمہارا دیوانہ بنایا۔" اس کے بے حد قریب سے کسی نے مخمور انداز میں سرگوشیانہ استفسار کیا تھا۔

اور اس نے شرمگیں انداز میں استفہامیہ انداز سے نگاہ اٹھا کر اپنے بے حد وجیہہ وشکیل ہم سفر کو دیکھا اور ان آنکھوں میں مچلتے والہانہ جذبوں کی تاب نہ لا کر نگاہ جھکا لی۔

"تمہاری سادگی اور معصومیت نے۔"

"افوہ یار ہماری شادی کو دو ماہ ہونے والے ہیں تم ابھی تک مجھ سے اتنا شرماتی ہو۔" تھوڑی چھو کر اس کا چہرہ سامنے کیا۔

"پتا ہے تم شرماتی ہوئی بے حد حسین لگتی ہو، اودے ہوئے لالیاں تو دیکھو۔" اسے شرم سے گلنار ہوتا دیکھ کر وہ کچھ اور قریب ہو کر شرارت پر کمر بستہ ہوا تو اس نے گھبرا کر اس کے سینے میں منہ چھپا لیا۔

"ہاہاہا، میری جان آنیہ!" محبت سے اس کے بالوں میں بوسہ دیا۔

نجانے کب کی بھولی بسری یاد کا عکس اس کے خیال کے پردے پر جھلملایا اس کی بند آنکھوں کا حصار توڑ کر دو آنسو پھر سے باہر نکل آئے اور دل سے ہوک اٹھنے لگی۔

"آنیہ!" خیال کی شدت اس کی سماعتوں پر حاوی ہو گئی تھی اسی لئے ارحم کی گمبھیر آواز اسے

واضح بے حد قریب سے ابھرتی محسوس ہونے لگی اوراس کے مخصوص کلون کی مہک، اس کی موجودگی کا دلفریب احساس، اس نے آنکھیں نہیں کھولیں مبادا تصور ٹوٹ نہ جائے۔

''آنیہ!'' اب کے آواز قدرے بلند اور بیزاری کا عنصر لئے ہوئے تھی، اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں، وہ مجسم حقیقت بنا اس کے سامنے وجود تھا۔

''ارحم!'' اس کے لبوں نے بے اختیار جنبش کی۔

''ارحم! آپ آ گئے۔'' نجانے کس خوش گمانی کے باقی ماندہ احساس کے تحت اس نے اس کی آمد پر خوشی محسوس کی، وہ اس کی طبیعت کا سن کر رہ نہیں سکا، وہ اس سے ملنے اسے اک نظر دیکھنے آیا ہے، اس کی محبت کے رنگ اتنے کچے ہر گز نہیں، اسے اب بھی اس کی پرواہ ہے وہ بس یونہی راستہ بھول گیا تھا، وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی، لیکن لمحے کے ہزارویں حصہ میں اس کے دماغ نے اس کے دل میں آئے ہر خیال کی نفی کر دی کہ اس کے چہرے پر چھائی گہری سنجیدگی اور آنکھوں میں تیرتی بیگانگی اور پتھریلے تاثرات میں کسی خوش کن خیال کا دامن پکڑنا بے حد حماقت کی بات تھی۔

فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا
وہ کہ خوشبو کی طرح پھیلا تھا میرے چار سو
میں اسے محسوس کر سکتا تھا چھو سکتا نہ تھا

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو کر اسے بغور دیکھ رہی تھی اک انجانا سا خدشہ، بے نام سا خوف اسے اپنے حصار میں لے رہا تھا، وہ شاید الفاظ ترتیب دے رہا تھا، محض تین چار روز میں ہی ان دونوں کے درمیان گویا صدیوں کے فاصلے در آئے تھے، کب سوچا تھا کہ ان کا رشتہ کبھی اس نہج اور اس صورت کا ہو جائے گا، اس کی آنکھ کے گوشوں میں آنسو سسکنے لگے۔

''تم اپنے گھر کب جا رہی ہو؟'' بالآخر اس نے لب کشائی کی۔

''کک...... کیا؟'' وہ ٹھٹک کر ہکلائی۔

''میں نے کہا تم اپنے گھر کب جا رہی ہو؟'' اپنی بات دہرا کر اب کے وہ اک اک لفظ چبا چبا کر گویا ہوا۔

''میرا گھر تو یہ ہے میں نے کہاں جانا ہے؟'' وہ اب بھی نہیں سمجھ پائی اور قدرے الجھ کر اسے دیکھا۔

''یہ تمہارا گھر نہیں ہے، یہ گھر میرا ہے تمہارا گھر وہ ہے جہاں سے تم بیاہ کے آئی تھیں، تم وہیں جاؤ گی۔'' آنیہ کا وجود زلزلوں کی زد میں آ گیا تھا وہ لڑکھڑا گئی اور بیڈ کراؤن کا کونا تھام لیا، بے یقینی سی بے یقینی تھی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔

(یہ پورا گھر نیچے سے اوپر تک تمہارا ہے، تم یہاں کی رانی ہو، ارحم کے دل کی ملکہ) اسے اس کی بہت پہلے کہی ہوئی بات یاد آئی۔

اور اب...... اب ارحم کے وجود کے ساتھ وہ اس گھر کو اپنا کہنے کا اختیار نہیں رکھتی تھی، ایسا بھی کبھی ہوتا ہے کیا؟

ارحم کی درشت آواز سن کر ساتھ والے کمرے سے عالیہ بیگم اور بچے نکل کر ادھر آن کھڑے ہوئے تھے۔

''دماغ چل گیا ہے تیرا ارحم، پہلے کیا کم دکھ دیا ہے جو اب ان گھٹیا حرکتوں پر اتر آیا ہے۔'' عالیہ بیگم اس کے الفاظ سن چکی تھیں، انہوں نے اسے بری طرح لتاڑ کر رکھ دیا اور ایک کونے میں لرزتی کانپتی بہو کو ساتھ لگا کر تسلی دینے کے لئے تھپکنے لگیں، ان کا سہارا پاتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''مجھے یہ گھر خالی چاہیے، عجیب ڈھیٹ عورت ہے یہ آنیہ، پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی۔'' وہ بڑبڑایا، ماں کی جھاڑ کو قطعی خاطر میں نہ لایا تھا، یہ وہ گھر تھا جو ہمیشہ سے محبتوں اور خوشیوں کا گہوارہ رہا تھا، اس گھر میں کبھی کسی نے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی، کجا کہ تلخی سے پیش آنا اور دادی کے آگے بولنا، مگر بچے دیکھ رہے تھے باپ کا رویہ دادی کے ساتھ بھی بدل گیا ہے آفاق، مزمل، احمر کے پیچھے چھپے آنسو بہا رہے تھے۔

''امی مجھے یہ گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جانا، مجھے نہیں جانا۔'' وہ خوفزدہ اور پریشان آواز میں روتے ہوئے گویا ہوئی، وہ اپنے دکھوں میں اپنے میکے والوں کو شامل کر کے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''کیوں نہیں جانا ہاں، تم مجھے تین لفظ کہنے پر مجبور نہ کرو آنیہ شرافت سے دفعان ہو جاؤ۔'' اس بات پر امی نے بری طرح بوڑھے ہاتھوں سے ارحم کو جھنجھوڑ ڈالا، جبکہ وہ روتے بلکتے ہوئے اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''نہیں ارحم! میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں میں آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گی بس مجھ سے اپنا نام کبھی مت چھینیئے گا پلیز آپ کو اللہ کا واسطہ، میں چلی جاؤں گی، چلی جاؤں گی۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں اس سے التجا کر رہی تھی، جبکہ امی اس کو کوسنے دینے میں مشغول تھیں۔

''تو نے تو کہا تھا کہ یہ یہاں رہ سکتی ہے اور تو نہیں چھوڑ رہا اسے۔'' اس نے بوڑھی ماں کے ڈھل ڈھل کرتے وجود کو ہلکا سا پیچھے کو دھکا دیا اور جھنجھلا کر اپنا آپ چھڑایا۔

دادی کو احمر نے تھام لیا تھا جبکہ عاشر نے آگے بڑھ کر ماں کو باپ کے قدموں سے جھک کر اٹھایا۔

''ماما ہم اب یہاں نہیں رہیں گے بس چلیں بہت ہو گیا۔''

''ہاں ہاں سب دفع ہو جاؤ جاؤ مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ چیخا اور روئے سخن ماں کی طرف موڑا۔

''اور وہ پہلے کی بات تھی میں نے سوچا تھا چلو بیچاری یہیں رہے لے گی مگر یہ گھر حق مہر میں، میں نے سارا اپنی سیکنڈ وائف کے نام لکھ دیا ہے اور سارا کو آنیہ اور بچوں کا یہاں رہنا پسند نہیں تو بس جو سارا کا فیصلہ وہ میرا فیصلہ۔'' عالیہ بیگم کے مسلسل کوسنے پر اس نے ترخ کر اپنے اس اقدام کی وضاحت دی تھی۔

''ہمیں ایک دو دن کی مہلت دے دیجئے، ہم اپنا ضروری سامان سمیٹ کر یہاں سے چلے جائیں گے۔'' وہ اس سنگدل کے سامنے نیر بہاتی ہاتھ جوڑتی فریاد کناں تھی۔

''آنیہ تم مجھ پر حرام ہو گی اگر اس رات تم میرے گھر پر رکیں۔'' وہ انگشت شہادت کا رخ اس کی جانب کیے وارن کرنے کے سے انداز میں سفاکی سے گویا ہوا۔

''ا...... ر...... ح...... م۔'' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بے حد استعجاب کے عالم میں بے یقینی، رنج و صدمہ کی کیفیت میں اسے پکارتی عاشر کے بازوؤں میں جھول گئی۔

آج اس نے درد بھی اپنے علیحدہ کر لئے
آج میں رویا تو میرے ساتھ وہ رویا نہ تھا

آنیہ کا دنیا و مافیہا سے بے خبر بے ہوش وجود اس کے سامنے تھا، اس کا آنسوؤں سے تر بتر ہوش سے بیگانہ چہرہ، نڈھال بے سدھ وجود، جس کے اوپر بچے اور عالیہ بیگم متفکر، ہراساں

جھکے گریہ وزاری کرتے اسے پکار رہے تھے ہوش میں لانے کے لئے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہے تھے۔

لیکن وہ بے حد اطمینان سے کھڑا کوفت زدہ انداز میں یہ ساری کاروائی دیکھ رہا تھا، آف وہائٹ شرٹ اور گرے کلر کے ٹو پیس میں اس کا دراز قد نمایاں ہو رہا تھا۔

مضبوط کسرتی بدن پر کلین شیو والا سرخ و سفید چہرہ ضبط اشتعال سے کچھ اور سرخی مائل ہو رہا تھا، بڑی بڑی گہری شفاف آنکھیں روشن پیشانی پہ ڈالے گئے بل کی بدولت قدرے سکڑی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں، غصہ کی شدت کے دوران سر کو دیئے گئے بارہا جھٹکوں کی بدولت گھنے براؤن بال پیشانی کے اطراف میں پھسل گئے تھے، آنیہ نے آنکھیں کھولتے ہی بے حد کرب سے اپنے ارحم کا بیگانہ انداز دیکھا اور غالباً آنسوؤں کی دھند میں شاید آخری بار اس کو اپنی نگاہوں میں قید کرنے کی سعی کی اور پھر آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اس کے وجود پر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہٹا دیں، پھر بجلی کی سی تیزی سے کھڑی ہوگئی اور ذرا کی ذرا لڑکھڑائی، بچوں نے دائیں بائیں سے تھام لیا۔

''عاشر رکشہ لے آؤ ہم ابھی اور اسی وقت یہاں سے جائیں گے۔'' اپنی تمام تر ہمتیں مجتمع کر کے ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتے اپنے بکھرے وجود کی کرچیوں کو گھسیٹتے ہوئے وہ بچوں کے چند ضروری کپڑے اور کتابیں بیگز میں بھر رہی تھی، ارحم اوپر جا چکا تھا۔

عالیہ بیگم کے واویلے اور بلند کوسنے جاری تھے انہوں نے ارحم کو اپنا فیصلہ سنا دیا تھا اور آنیہ اور پوتوں کے ساتھ اس گھر سے رخصت کو ترجیح دی تھی، ان کے بیٹے کو چنداں کوئی پروانہ تھی۔

''ارحم کاش تو پیدا ہوتے ہی مر گیا ہوتا، اس سے اچھا میں بے اولاد رہ جاتی، تو نے اپنی اتنی نیک، صابر بیوی کو چھوڑا ہے تجھے اللہ کبھی بیوی کا سکھ نہ دے گا، تو روئے گا ارحم، ایک دن تو اپنی اسی بیوی اور بچوں کے لئے تڑپے گا مگر پھر یہ لوگ تجھے دھتکار دیں گے، تو اتنا ظالم ہو گیا تجھے آنیہ کی بگڑتی طبیعت بھی نظر نہ آئی۔'' وہ آنگن میں کھڑی سینہ کوبی کر رہی تھیں۔

دلان کے ستون سے لپٹی بیل ویران ہو چکی تھی، تند خو ہوا نے اس کو تمام خشک و زرد پتوں سے محروم کر دیا تھا، فضا بے حد سرد و خاموش ہو گئی تھی، نم ہوا کے جھونکوں کی شدت نے بتدریج دم توڑ دیا، کھلے آنگن کے اوپر نظر آتے وسیع آسمان کو شب کے اندھیرے نے اپنے حصار میں لپیٹ رکھا تھا، اماوس رات میں آسمان پر تا حد نگاہ کوئی تارا نہ تھا۔

دور فلک پر اندھیرے کی چادر سے ذرا نیچے منڈلاتے بادل کے اک آوارہ سے ٹکڑے نے اپنے گھر کے در و دیوار پر حسرت آمیز نگاہ کرتی سیاہ عبائے میں ملبوس آنیہ کو عالیہ بیگم اور بچوں کے سنگ رخصت ہوتے دیکھا تو ان کے ساتھ سفر کرنے لگا اور ہوا سے سرگوشی میں مصروف ہو گیا۔

جب ملتان سے بہاولپور کی مسافت طے کرنے کے لئے وہ سب بے حد چپ چاپ، دلگرفتہ، کوچ میں سوار ہوئے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے، سیاہ رات کی سرد ہوائیں یکلخت ہی کوچ کی بند کھڑکیوں اور دروازوں سے سر ٹکرانے لگیں اور بادل کے ٹکڑے کے ساتھ اور بہت سے بادل اکٹھے ہو کر شد و مد سے آنسو بہاتے رہے۔

سوز غم دے کر مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکش دہر سے آزاد کیا

وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ
جن کو تیری نگہ لطف نے برباد کیا
دل کو چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا
اس کا رونا نہیں کہ تم نے کیا دل برباد
اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا
مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

☆☆☆

''زندگی برباد کر دی، ارحم بھائی نے اپنی جنت جیسی پرسکون زندگی، محبتوں سے بنا گھر خود ہی برباد کر دیا۔'' مریم بھابھی آنیہ کو ساتھ لگائے صوفے پر اس کے دائیں طرف براجمان اسے چپ کرانے کی سعی میں ہلکان تھیں، ان کا بس نہ چلتا تھا وہ ارحم کو کچا چبا جاتیں، مریم بھابھی اس کی چچا زاد بھی تھیں انہیں اپنی اکلوتی نند بے حد عزیز تھی اور اس سے دلی ہمدردی محسوس کر رہی تھیں۔

بھیا نے خاندان کے چند بڑے بزرگوں کے ساتھ مل کر ارحم کو سمجھانے کی بے حد سعی کی تھی مگر ارحم سارا کی محبت میں اندھا ہو کر ہر رشتے کا لحاظ کھو بیٹھا تھا، بھیا ارحم کے کہنے پر آنیہ کے جہیز کا سب سامان اور عالیہ بیگم کا ضروری سامان لے آئے تھے، آج بھیا نے اس سے خلع کے لئے مشورہ کیا تھا جس پر وہ پھر سے بکھر گئی تھی، اسے یہ فیصلہ ہرگز قبول نہیں تھا۔

''سمجھنے کی کوشش کرو آنیہ، وہ جو کچھ کر چکے ہیں اور جس طرح سے بنا کسی قصور کے تم سے اور بچوں سے لاتعلق بنے بیٹھے ہیں، ایسے میں ان سے مکمل علیحدگی اختیار کرنا ہی مناسب ہے۔'' مریم بھابھی نے رسان سے اسے پھر سے قائل کرنا چاہا۔

''مجھے ان سے ہمیشہ علیحدہ رہنا منظور ہے مگر ان کا نام اپنے نام سے جدا کرنا ہرگز گوارا نہیں، اس برائے نام تعلق کو ان کے حوالے کو مجھ سے مت چھینیں پلیز۔'' وہ پھر سے سسکنے لگی، بھابھی نے بھیا کو اک گہری سانس بھر کر دیکھا۔

''ہمیں آنیہ کے فیصلے کا احترام کرنا چاہیے۔'' وہ گویا ہوئیں، بھیا مضطرب سے اٹھ کر باہر نکل گئے۔

''جمیلہ آپا مجھے معاف کر دیں، میں آپ سب کی مجرم ہوں میں نے ایسی ناخلف اولاد پیدا کی جسے نہ ماں کی پرواہ ہے ناں فرشتہ صفت بیوی اور بچے عزیز ہیں۔'' عالیہ بیگم آنیہ کی اماں کے سامنے ندامت سے ہاتھ جوڑ کر اشک بہانے لگیں۔

''نہیں بھابھی یہ سب تو نصیب کے کھیل ہیں، کون مان سکتا ہے کہ میری نظروں کے سامنے پلا، بڑھا نیک، قابل بچہ شادی کے اتنے عرصے بعد اس عمر میں کوئی ایسا قدم اٹھا سکتا ہے۔'' اماں چشمے کی اوٹ سے آنسو بہانے لگیں ان کا نحیف و کمزور وجود اس خبر کو سن کر صدمہ سے بکھر گیا تھا آنیہ، بچوں کو دیکھ کر پل پل آنسو بہاتی تھیں عالیہ بیگم کا حال ان سے کچھ مختلف نہ تھا، وہ یونہی بیٹھے بیٹھے اچانک ہی خود کو مورد الزام ٹھہراتے ان سے معافیاں مانگتی رہتیں تھیں، اچھا تھا جو آنیہ کے والد حیات نہیں تھے ورنہ کس منہ سے ان کا سامنا کرتیں۔

بھابھی نے گھر کی انیکسی میں ان سب کی مستقل رہائش کا بندوبست کر دیا تھا اور جب گھر کے اخراجات اور بچوں کی تعلیم کے لئے ایک معقول رقم بھابھی نے اس کے حوالے کرنی چاہی تو آنیہ نے سہولت سے انکار کر دیا۔

''بھابھی! اتنے سالوں میں گھر کے اخراجات سے جمع بچت کرنا میری عادت تھی

میرے اکاؤنٹ میں کچھ رقم موجود ہے میں اب اپنے گھریلو خرچے اور ذمہ داریاں خود اٹھالوں گی آپ لوگ پہلے ہی اتنا کر چکے ہیں اب اور شرمندہ مت کریں۔"

"ہاں بیٹا! ارحم مجھے جو ذاتی خرچ کے لئے ہر ماہ ایک مخصوص رقم دیا کرتا تھا وہ میں ایک طرف جوڑ کر رکھا کرتی تھی سوچا تھا میری موت کے بعد چاروں پوتیوں میں یہ رقم بانٹ دی جائے گی، لیکن اب وہی رقم میرے بچوں کے تعلیمی اخراجات میں کام آجائے گی، اس کا اس سے اچھا استعمال بھلا اور کیا ہوگا۔" عالیہ بیگم نے گفتگو میں شامل ہو کر مریم کو سمجھایا۔

"لیکن پھر بھی آپ لوگوں کی جمع پونجی کسی نہ کسی دن ختم ہو جائے گی، مہنگائی کا زمانہ ہے، یہ پیسے رکھ لو آنیہ، تمہارے کام آئیں گے، اللہ کا شکر ہے اس نے تمہارے بھیا کو بہت دیا ہے تم ہم پر بوجھ نہیں ہو۔" بھابھی نے اصرار کیا وہ قناعت پسند اور وسیع القلب تھیں۔

"میں نے ایک، دو سکولز میں ٹیچنگ کے لئے اپلائی کیا ہے انشاء اللہ جاب بھی مل جائے گی آپ فکر مت کریں۔"

آنیہ ایم اے اسلامیات تھی، برسوں پہلے حاصل کی گئی، تعلیم اب اس کے کام آنے والی تھی۔

اسے اپنی خود داری بے حد عزیز تھی، اسی لئے اس نے گھر کے اندر رہائش کے بجائے انیکسی کو ترجیح دی تھی، تا کہ کھانے پینے اور دیگر امور کی ذمہ داریاں اور خرچ وہ خود اٹھا سکے۔

اس کی ضد کے آگے مریم بھابھی خاموش ہو گئی تھیں مگر انہوں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً بڑی خوبصورتی سے اپنی اس خود دار نند کی مدد کر دیا کریں گی تا کہ اس کی خود داری مجروح نہ ہو اور ضروریات بھی پوری ہو جائیں۔

آنیہ کو مقامی سکول میں مناسب تنخواہ پر ٹیچنگ مل گئی تھی، مزمل کا داخلہ اس نے اسی سکول میں کروالیا، جبکہ آفاق اور احمر کو بوائز کے سکول میں تعلیم کا سلسلہ جاری کروایا، رہا عاشر تو وہ تعلیم چھوڑ کر نوکری کر کے اپنی ماں اور اہل خانہ کی کفالت کرنا چاہتا تھا۔

لیکن عالیہ بیگم اور آنیہ کی منت سماجت اور پڑھا لکھا کامیاب انسان بن کر دکھانے کا ان کا خواب اسے پورا کرنے کے لئے ہتھیار ڈالتے ہی بنی، اور اس نے اپنا مائیگریٹ مقامی کالج میں کروالیا۔

☆☆☆

وہ مزمل کا ہاتھ تھامے سکول سے آف ہونے کے بعد تیز تیز قدم اٹھاتی گھر میں داخل ہوئی، اوائل فروری کا مسکراتا سورج اپنی کرنوں سے دھرتی کو فیضیاب کرتا ہر سو دھوپ لٹا رہا تھا، لان میں اگی چھوٹی چھوٹی خشک زرد اور کہیں کہیں سے جھانکتی سبزی مائل گھاس، پھلوں سے لدی درختوں کی شاخوں اور ایک طرف موجود کیاری میں قطار اندر قطار سر اٹھائے پھولوں و پتوں سے محروم بہار کے منتظر بے لباس شاخوں والے ان گنت پودوں پر دھوپ کا بسیرا تھا۔

وہ دھوپ سے نگاہ چرا کر اندر کی طرف چلی آئی اور اندر کا نظارہ دیکھ کر وہ دھک سے رہ گئی، کچن کے عین سامنے چھوٹے سے برآمدے نما صحن میں ایک کونے سے لگے تخت پر عالیہ بیگم، آفاق کے ساتھ مل کر کھانا کھانے میں مشغول تھیں اور کچن کے اندر کھڑی عبیرہ بری طرح سے روٹی بیلنے اور دنیا جہاں کے نقشے بنانے کی سعی میں مصروف تھی۔

"امی! آپ نے اسے کیوں کچن میں جانے دیا، وہ بچی ہے نا تجربے کار کہیں ہاتھ وات جلا لیا تو بھابھی کو کیا منہ دکھائیں گے۔" سلام کر کے اس نے اپنی ساس سے پریشان کن لہجے میں جواب طلبی کی، مزمل اندر کمرے میں یونیفارم تبدیل کرنے چلا گیا تھا۔

بھیا کے تین بچے تھے، ملیحہ بی کام فائنل ائیر، باسل آئی سی ایس کا طالب علم تھا اور تقریباً عاشر کا ہم عمر تھا پھر سب سے چھوٹی عبیرہ جو احمر کی عمر کی تھی اور اسی کی مانند میٹرک کی سٹوڈنٹ تھی۔

"السلام علیکم پھپھو جانی!" وہ آواز پر پلٹ کر مسکرائی تھی، اس نے اپنی بات کے دوران اس کے سلام کا جواب دیا۔

"میری کب سنتی ہے وہ تم جانتی ہو اپنی بھتیجی کو۔" وہ منمنائیں۔

"افوہ پھپھو جانی کیا ہو گیا ہے، کم آن میں اب اتنی بھی بچی نہیں ہوں۔"

"مگر بیٹا میں نے پہلے بھی کئی بار منع کیا ہے میں کرلوں گی تم کیوں خود کو ہلکان کرتی ہو۔" آنیہ نے محبت سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور وہاں سے ہٹایا۔

"یار پھپھو مجھے اچھا لگتا ہے کچن کے کام کرنا اور ماما اور ملیحہ آپی مجھے کچن میں گھسنے تک نہیں دیتیں ان کی نظر میں، میں جیسے چار سالہ بچی ہوں اور آپ ہیں، آپ بھی مجھے روکتی رہتی ہیں۔"

"اور میں روز تھوڑی نا کرتی ہوں، آج سکول سے لیٹ ہو گئی تھی چھٹی ہو گئی تو آپ کا کام کر دیا، پلیز مجھے بنانے دیں ناں بس آخری روٹی ہے۔" اس کی پٹر پٹر پر آنیہ محض گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"بھابھی سے تمہاری شکایت کرنی پڑے گی۔" اس نے اس کے سر پر پیار سے چپت لگائی۔

مزمل کھانا مانگ رہا تھا عبیرہ کے محنت سے بنائے گئے نقشے دیکھ کر ہنس پڑا۔

"آپی آپ کیسی شکل کی روٹی بناتی ہیں۔" وہ گویا ہوا۔

"ارے پاکستان کا نقشہ آیا ہے آپ کے حصے میں، میرا والا آسٹریلیا کا تھا۔" آفاق اپنی خالی چنگیر اور پلیٹ کچن میں رکھنے آیا تو مزمل کی روٹی کو دیکھ کر لقمہ دیا۔

"مسٹر آفاق تم صورت کو نہیں سیرت کو دیکھو او کے اور رہی صورت تو وہ بھی سنور جائے گی اگر یہ ظالم بزرگ خواتین میرے نیک ارادوں کی راہ میں حائل ہو کر انہیں خاک میں نہ ملائیں تو۔" اسے مصنوعی ڈپٹ کر اس نے اپنا لہجہ خوابناک بنایا، وہ ہنسنے لگا، جبکہ آنیہ اور عالیہ بیگم مسکرا دیں۔

☆☆☆

"آج ماں کی یاد کیسے آگئی تمہیں۔" اسے اتنے دن بعد اپنے روبرو دیکھ کر اماں کے منہ سے بے اختیار شکوہ پھسل گیا۔

"بس اماں، مصروفیات ہی اتنی ہوتی ہیں، سکول سے آکر بھاگم بھاگ روٹی پکانا، امی اور بچوں کو کھانا دینا نماز پڑھنا، پھر ٹیوشن کے لئے بچے آجاتے ہیں ان کو نمٹاتے ہوئے ساتھ ساتھ عصر، مغرب کی نماز کا وقت ہوتا ہے پھر اسی دوران اگلے دن کے لئے ہنڈیا پکانی ہوتی ہے، سبزی امی بنا دیتی ہیں، پھر رات کی روٹی پکا کر کچن سمیٹتے ہوئے بس یہ ہوتا ہے کہ جلدی سے عشاء پڑھ کر بستر سنبھال لوں۔" اس نے خجل سی ہو کر طویل وضاحت دی۔

"آنیہ نے تو اب بچوں سے کام کروانا بھی چھوڑ دیا ہے۔" عالیہ بیگم نے لقمہ دیا۔

"اماں بچے اپنے چھوٹے چھوٹے کام تو خود ہی سنبھال لیتے ہیں، پھر جو کچھ ہو چکا ہے اس

سے بچے بے حد اپ سیٹ ہو گئے ہیں، میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ پڑھائی کی مصروفیات کے بعد جو کچھ ٹائم بچے وہ ملیحہ، عبیرہ، باسل وغیرہ کے ساتھ گزاریں، ان کے ساتھ ہنستے، کھیلتے بہل جاتے ہیں بچے۔"

"اور میں خود جان بوجھ کر اپنے اوپر ڈھیروں ڈھیر مصروفیت کا بوجھ لاد لیتی ہوں اچھا ہے دن آسانی سے گزر جاتا ہے، کچھ سوچنے کی فرصت نہیں ملتی۔" اماں کی بدستور خاموشی اور خود پر مرکوز گہری نگاہوں سے گھبرا کر وہ متواتر بولتی چلی گئی اسی لئے تو وہ ان سے بچتی تھی۔

"میری بچی میں تو ہر پل تیرے سکون قلب اور زندگی کے رستوں پر صبر اور آسانی کے لئے دعا گو رہتی ہوں۔" اس بات پر عالیہ بیگم تاسف و ندامت سے سر جھکا گئیں، آنیہ کی اجڑی زندگی دیکھ کر ان کے دل پر بیتنے والے حالات اس کی سگی ماں کی کیفیات سے مختلف تو ناں تھے، لیکن وہ اظہار کر کے آنیہ کے زخم نہیں کریدنا چاہتی تھیں خواہ کھوکھلی ہی سہی مگر اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر دل بظاہر سنبھل جاتا تھا اور اندر سے روتا تھا۔

لیکن اماں جب آنیہ کو آنکھوں میں بے حزن ملال اور آنسوؤں سمیت لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ بسائے دیکھتیں تو ان کا دل کٹ کر رہ جاتا، اس کی کھوکھلی ہنسی، خودساختہ مسکراہٹ ان کا وجود زخمی کر ڈالتی تھی اور دل آنسو بن کر آنکھوں میں سسکنے لگتا۔

"اماں دعا کرتی رہا کریں دعائیں ہی زندگی کو سہارا دیتی ہیں۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں مخاطب تھی۔

(کاش میں نے کبھی ارحم کی دائمی وفا کی دعا کی ہوتی اس کے دل میں ہمیشہ اسی محبت و چاہت سے بسیرا قائم رکھنے کی دعا، تو شاید وہ بے وفائی کا مرتکب نہ ہوتا)۔

لیکن وہ ہمیشہ اس کی محبتوں پر اندھا اعتماد کرتی رہی اور رب کی مہربانی پر شکر کا کلمہ پڑھتی رہی جس نے "آنیہ اپنا خیال رکھا کر بچی دیکھ کیسے حلقے پڑے ہوئے ہیں تیری آنکھوں کے گرد، تو کیا راتوں کو روتی رہتی ہے کیسا ورم ہے آنکھوں پر جو اترتا ہی نہیں۔"

اماں آبدیدہ ہو کر اسے دیکھ رہی تھیں، اس نے اپنے خیالوں سے چونک کر سر اٹھایا اور آنکھوں کی نمی پیچھے دھکیل کر مسکرائی۔

اس مسکراہٹ سے ایک ماں کے دل کو ڈھارس ملی اور دوسری کا دل کٹ کر رہ گیا، وہ لب کچلنے لگیں۔

"اماں میں اچھی بھلی ہوں، آپ خواہ مخواہ وہم نہ کریں اور میری زندگی تو سنور گئی ہے دو مائیں مل گئیں پھر بچے چند سالوں میں اپنے پیروں پہ کھڑے ہو جائیں گے، سب اپنوں کی محبتیں ساتھ ہیں، میرا تو اللہ کا شکر ہے دامن محبتوں سے لبریز ہے (بس وہی نہیں ہے جو سب کچھ تھا جس کی فرقت کے صدمے نے آنکھوں سے نیند اور دل کا چین چھین لیا ہے، اکھیوں میں ٹوٹے مان، بھروسے کی کرچیاں اور اندھیری راتوں کا درد چبھتا ہے، رلاتا ہے اماں نیند اب آنکھ کی دہلیز سے روٹھ گئی ہے)۔"

"اللہ کا کرم ہے بہت سے لوگوں سے اچھی زندگی عطا کی ہے جیسی بھی ہے شکر ہے اس ذات باری کا۔"

"شاباش یہ ہوئی ناں بہادر لوگوں والی بات۔" بھیا، بھابھی کے سنگ بہت سے شاپنگ بیگز اٹھائے لیونگ روم میں داخل ہوئے اور اس کی آخری بات سن کر ٹکڑا لگایا۔

باہر لان میں عاشر، احمر، آفاق، مزمل اپنے تینوں کزنز کے ساتھ فٹ بال کھیلنے میں مگن تھے اور اندر گھر کے لیونگ ایئریا میں بھابھی، بھیا، آنیہ اور اس کے بچوں کے لئے کی گئی شاپنگ دکھا رہے تھے اور ان کی محبتوں پہ ان کی مشکور ہوتی خود کو ان کا مقروض محسوس کرتی وہ جز بز ہوئی جا رہی تھی۔

☆☆☆

بہت سے دن بے کیف سے گزر گئے دور صحرا میں روہی کے ٹیلوں پر اپنی زلفیں پھیلائے اک سوگوار سی شام اتری اور دشت کے ایک گوشے میں آباد شہر بہاولپور میں پھیلنے لگی، گھر کی طرف قدم بڑھاتے عاشر کے چہرے پر دبے دبے جوش کی سی کیفیت تھی، راستے صحرا کی سمت سے آنے والی خنک ہواؤں سے آباد تھے، شام نے تجسس سے اسے تیزی سے قدم بڑھاتے دیکھا اور اس کے ساتھ ہولی۔

"یہ...... یہ اتنے سارے روپے تمہارے پاس کہاں سے آئے؟" وہ کچن میں شام کو کھانا پکانے میں مشغول تھی، جبکہ تینوں بچے اندر کمرے میں نصاف کی کتابیں کھولے پڑھ رہے تھے کہ امتحانات کا موسم تھا اور عالیہ بیگم مصلے پر بیٹھی مغرب کی نماز کے بعد نفلوں کی ادائیگی میں مصروف تھیں۔

جب عاشر نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کر اس کا رخ محبت سے اپنی اور موڑا اور اس کی ہتھیلی پر ہرے اور نیلے بے شمار نوٹ رکھ دیے، لمحہ کے ہزارویں حصہ میں اس کا دل انجانے سے خدشات سے لبریز ہو گیا، کچن کی کھڑکی کے شیشے سے اس پار باہر شام ٹھہر گئی تھی۔

"ماما! ارے دھیرج رکھیئے آپ اتنی جلدی پریشان ہو جاتی ہیں۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔

"مگر یہ پیسے؟"

"سب بتاتا ہوں، دراصل میں جس اکیڈمی میں پڑھنے جاتا ہوں اصل میں، میں وہاں پڑھنے نہیں بلکہ جاب کے سلسلے میں جاتا ہوں، چھوٹی کلاسز کو کچھ مضامین پڑھا کر باقی ٹائم میں کمپیوٹر پر ان کے سکول و اکیڈمی کے کوئچن پیپر ٹائپ کرنے اور ٹیسٹ شیڈول بنانے میں گزارتا ہوں۔" اس نے ماما کو مطمئن کرنے کے لئے کھل کر وضاحت دی۔

"اوہ!" اس نے بے اختیار سکون آمیز سانس خارج کی۔

"ماما! میں جانتا ہوں مہنگائی کے زمانے میں یہ چند ہزار کی معمولی جاب کوئی حیثیت نہیں رکھتی، مگر مجھے فی الحال یہی سمجھ میں آیا، میٹرک کے بعد کیا گیا شارٹ کمپیوٹر کورس کام آ رہا ہے۔"

وہ خواہ مخواہ شرمندہ ہو رہا تھا، اس کو اپنے لخت جگر پر ٹوٹ کر پیار آیا محض سترہ برس کی عمر میں وہ اتنا ذمہ دار بن گیا تھا۔

"میری جان! تمہیں ان جھمیلوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے، تم اپنی پڑھائی پر دھیان دو میں ہوں ناں، پھر کیوں تم فضول میں ہلکان ہو رہے ہو؟" اس کی محبت بھری سرزش پر وہ ہلکا سا متبسم ہوا۔

"ماما پڑھائی الحمدللہ بہترین جا رہی ہے، مجھے اپنے ساتھ بوجھ اٹھانے سے منع مت کیجئے اور ایک دن آئے گا آپ سب کا بوجھ میں خود اپنے کندھوں پر اٹھاؤں گا انشاءاللہ۔"

"ہاں مگر پہلے پڑھ لکھ کر قابل انسان بن جاؤ پھر ساری ذمہ داریاں نبھانا سب ارمان پورے کرنا، اگر تمہاری خوشی اسی پارٹ ٹائم جاب میں ہے تو ٹھیک ہے بچے مگر اپنی صحت کا بھی خیال کرو، پڑھائی کے ساتھ کام نے کیسے کمزور کر

دیا ہے میرے بیٹے کو۔'' اس نے فرط انبساط و فخر سے اس کا ماتھا چوم لیا۔

شام ہولے سے ذرا مسکرائی اور کھڑکی سے پرے ہٹ گئی۔

☆☆☆

''پھپھو جانی! ماما آپ کو بلا رہی ہیں۔'' شرمائی شرمائی سی ملیحہ نے انیکسی میں آ کر اسے پکارا۔

''بس دو منٹ۔'' وہ تیزی سے بالوں میں برش چلانے لگی۔

''اوہو!۔ بے تابی تو دیکھو موصوفہ کی۔'' عاشر نے کپڑے کھنگالتے ہوئے اسے چھیڑا۔

''کیوں نہ ہو آخر کو ''ساسو ماں'' آئی ہیں! آہم۔'' واشنگ مشین سے کپڑے نچوڑ کر عاشر کے آگے ڈھیر کرتا احمر شوخی سے ملیحہ کو دیکھ کر مخاطب ہوا اور آخر میں مصنوعی گلا کھنکھارنے لگا، وہ بری طرح جھینپ گئی آتشی گلابی اور سیاہ امتزاج کے شیفون کے جدید اسٹائلش سے سوٹ میں اس کی رنگت گلاب کی مانند دہک اٹھی تھی۔

بچوں کے امتحانات کا موسم گزر چکا تھا، لہٰذا فراغت کے اوقات ماں کے ساتھ ہاتھ بٹانے میں اسے سکون دینے کی جستجو میں گزارے جا رہے تھے، ملیحہ کو گزشتہ دنوں کسی خاتون نے کالونی میں میلاد کی تقریب کے دوران اپنے بیٹے کے لئے پسند کیا تھا اور آج اسی سلسلے میں تشریف لائی تھیں۔

''ناں تنگ کرو میری بیٹی کو۔'' آنیہ نے ان کی چھیڑ خانیوں پر پزل ہوتی ملیحہ کو آگے بڑھ کر گلے لگا لیا۔

''اللہ نصیب اچھے کرے۔'' اس کا میک اپ سے مبرا سادہ سا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں تھام کر دعاؤں کے پھول اس پر نچھاور کیے، جس پر عاشر، احمر نے لفظ آمین دل کی گہرائیوں سے ادا کیا تھا، سادگی میں بھی وہ غضب ڈھا رہی تھی، اس نے دل ہی دل میں بلائیں لے ڈالیں۔

''اپیا! پھپھو کو بلانے کے بجائے یہاں چپک کر رہ گئی ہیں آپ! ٹرالی سیٹ کر دی ہے ہونے والی ساسو جی کو پیش کر دیجئے عین نوازش ہوگی۔'' عبیرہ تیز تیز بولتی پھولی سانسوں کے بیچ ملیحہ کو شوخی سے لتاڑنے لگی، اس کی بات پر سبھی ہنس دیئے وہ شاید بھاگ کر آئی تھی۔

''اف تم نان اسٹاپ بولتی ہو، میں بس آ ہی رہی تھی۔'' ملیحہ نے پھپھو کا ہاتھ تھاما اور جھٹ سے چل دی۔

''مجھے اپنے انجینئر بیٹے کے لئے ایسی ہی سادہ سی لڑکی کی تلاش تھی، میرے بیٹے میں کوئی کمی نہیں ہے لاکھوں میں ایک ہے، بس آپ جلدی سے ہمارے ہاں چکر لگا کر بیٹے سے مل لیجئے اور ہاں ہی چاہیے ہمیں آپ لوگوں سے چاند سورج کی جوڑی ہوگی دونوں کی۔''

ملیحہ ٹرالی دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئی اور ہولے سے سلام کر کے انہیں چائے اور دیگر لوازمات سرو کرنے لگی، لڑکے کی ماں اپنی عمر رسیدہ جیٹھانی کے ہمراہ صوفے پر تشریف فرما تھیں، جبکہ اماں اور بھابھی متانت سے مسکرا کر انہیں سن رہی تھیں۔

اپنی طویل گفتگو کے دوران وہ آنیہ کے سلام کا سرسری سا جواب دے کر مکمل ملیحہ پر فریفتہ ہوتی رہی تھیں، اب جو ذرا ہوش آیا تو اس کا تفصیلی تعارف سے بھرپور انٹرویو ہی لینے بیٹھ گئیں۔

''اچھا تو آپ لڑکی کی پھپھو ہیں۔'' انہوں نے جارجٹ کے سادہ سے گرے سوٹ میں ملبوس سانولی سلونی، اسمارٹ اور سوبر سی آنیہ پر نگاہ ڈالی۔

''آپ یہیں قریب میں رہائش پذیر ہیں یا کہیں دور کے شہر سے آئی ہیں؟''

''کیا کہا انیکسی میں رہتی ہیں؟''

''آپ کے خاوند حیات نہیں؟''

''یہ کیا بات ہوئی آپ یہاں اور وہ دوسرے شہر میں، کیوں بھلا؟'' رشتے والی دونوں خواتین مکمل طور پر اس کی سمت متوجہ ہو چکی تھیں۔

بھابھی اور اماں اس کا پریشان چہرہ دیکھ کر فکر مند ہو گئیں اور جب مریم بھابھی نے مختصر لفظوں میں آنیہ اور ارحم کے حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا تو وہ ایکدم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''میں نہیں مان سکتی کسی کا دماغ تھوڑی ناں خراب ہے جو بلاوجہ دوسری شادی کرے۔'' ایک نے بیان دیا۔

''زبان چلاتی ہوگی، پھوہڑ ہوگی، جھگڑوں سے تنگ آ کر زندگی میں سکون کی خواہش پر شوہر نے دوسری شادی کر لی ہوگی۔'' لڑکے کی والدہ نے از خود ہی تمام اندازے قائم کر کے نتیجہ اخذ کر لیا اور انہیں اپنے مفروضوں کی سچائی پر کوئی شبہ نہ تھا ناں زبان کی کاٹ پر ندامت۔

ان کے پے در پے الزامات پر وہ بے حد ہراساں سی ہو کر نگاہ جھکا گئی، آنکھوں میں امنڈتے آنسوؤں پر بند باندھنے کی سعی میں جسم میں ہلکی کپکپاہٹ اتر آئی۔

حادثوں کی دنیا میں کون کس کو روتا ہے
یاد کر کے دکھ اپنے خون دل کا ہوتا ہے
آپ کی نگاہوں میں وہ بھی ہو گئے مجرم
جن کی بے گناہی پر آسماں بھی روتا ہے

''ایسا کچھ نہیں ہے، آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔'' بھابھی غصہ ضبط کرتی انتہائی تحمل سے انہیں حقیقت حال سے باخبر کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ان کی اور بے شمار الٹی سیدھی باتوں پر انہیں بے تحاشا اشتعال آ رہا تھا، وہ اپنی نند کے دفاع میں جانے اور کیا کچھ کہہ رہی تھیں، آنیہ کو کچھ سنائی نہ دے رہا تھا، اس کا دماغ بالکل ماؤف ہونے لگا وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔

''چلیں دادو اندر کمرے میں چل کر لیٹیں آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے لوگوں کی فضول باتوں پر دھیان دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس ساری صورتحال سے سخت مضطرب ملیحہ ایک دم سے اٹھی تھی اور زرد پڑتی رنگت والی اماں کا چہرہ دیکھ کر اسے فکر مندی کے ساتھ بے تحاشا طیش آیا وہ ان کے ضعیف وجود کو سہارا دے کر اندر کی اور بڑھ گئی۔

''آئے ہائے، کیسی بدتمیزی کر کے گئی ہے یہ لڑکی، مہمانوں سے بات تک کرنے کی تمیز نہیں ہے۔''

''اچھا ہوا پہلے ہی پتا چل گیا کیسے لوگ ہیں توبہ توبہ۔'' اس کے لہجے کی تپش نے ان خواتین کو اور بھڑکا دیا۔

''بس ایک لفظ اور مت کہیے گا، آپ لوگ جا سکتے ہیں ہمیں کوئی شوق نہیں آپ کے ہاں رشتہ کرنے کا۔'' مریم بھابھی کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا، انہوں نے سخت لہجے میں انہیں ٹوک دیا، وہ دونوں منہ میں بڑبڑاتی، منہ بناتی نخوت سے سر جھٹک کر چلی گئیں، بھابھی تھکے ہارے انداز میں صوفے پر ہی ڈھے گئیں۔

☆☆☆

لان میں بے چینی سے ٹہلتی عبیرہ نے تحیر سے دھواں دھواں چہرے کے ساتھ تیزی سے انیکسی کی طرف قدم بڑھاتی پھپھو کو دیکھا، پھر مہمان خواتین کے چہرے کا تناؤ، اسے کچھ غلط

ہونے کا احساس ہوا تھا وہ بے اختیار ملیحہ کے پاس آئی، ماما رو رہی تھیں، ملیحہ ان کو دلاسہ دے رہی تھی، وہ نا سمجھی سے سب کچھ سمجھنے کی سعی میں اپیا کو ٹکر ٹکر دیکھے گئی اور جب اسے تمام واقعہ کا علم ہوا تو سرتاپا سلگ اٹھی۔

''انہوں نے پھپھو جانی کے متعلق ایسا کہا، ایک عورت ہو کر دوسری عورت کے درد کی گہرائی کو جاننے کے بجائے اتنی تضحیک اور الزام لگا ڈالے۔''

''میں اگر جن ہوتی تو ان عورتوں کو کھا جاتی، مر جاتیں دونوں میرے ہاتھ سے۔'' برہمی سے لب بھینچے اس نے تصور ہی تصور میں جیسے ان کو کچا چبا ڈالا تھا۔

''کوئی بات نہیں سونو، جن نہیں ہو تو اچھا ہے، اللہ کا کرم ہے کہ اس نے تمہیں ''چڑیل'' تو بنایا ہی ہے ناں، ایسے اس کی ناشکری نہیں کرتے، تم اب بھی بہت کچھ کر سکتی ہو۔'' ملیحہ نے اپنی پندرہ برس کی چھوٹی سی بہن کی معصوم سی بات پر سنجیدگی سے اسے پچکارا اور مسکراہٹ دبا گئی۔

''ماما دیکھا آپ نے، سنا کچھ اپیا نے کیا کہا ہے۔'' اس نے ٹھنک کر اشک بہاتی ماں سے اپیا کی شکایت کی، جن کے لبوں پر ان دونوں کی بے سروپا باتوں سے مسکراہٹ کی جھلک نظر آئی تھی، ماحول کا تناؤ کم ہونے پر ملیحہ نے بے اختیار سکون کا سانس لیا۔

☆☆☆

خلیل جبران کہتا ہے کہ حقیقت میں جو کچھ ہم میں پایا جاتا ہے وہ خاموشی ہے اور جو کچھ ہم نے اپنا رکھا ہے وہ باتونی پن ہے اور اب اس کے لب بولنے سے قاصر تھے، لفظوں کا لبادہ اوڑھنے سے انکاری اور اس کے اندر پائی جانے والی خاموشی نے اس کی ذات کو باہر سے بھی جکڑ لیا تھا۔

عالیہ بیگم نے اس کی غیر معمولی سنجیدگی اور کھویا کھویا انداز ملاحظہ کیا۔

''بیٹا پریشان نہ ہو معمولی بخار ہے اتر جائے گا۔'' انہوں نے اس کی کیفیت کو اپنی طبیعت کی خرابی پر محمول کرتے ہوئے تسلی و تشفی سے نوازا، وہ دواؤں کے زیر اثر سو رہی تھیں، اس لئے اس پر بیتنے والی قیامت سے بے خبر رہیں اور یہ اچھا ہی تھا کہ ابھی وہ کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھی اس نے چپ چاپ سر ہلا دیا اور بھیگی پلکیں جھپک کر نمی اپنے اندر جذب کر لی۔

مریم بھابھی اور ان کے بچوں کی محبتوں میں بظاہر کوئی کمی یا بدلاؤ نظر نہیں آیا تھا، بلکہ بھابھی نے اس کے نادم ہو کر معافی مانگنے پر الٹا اسے گلے لگا کر دلاسہ دیا تھا اپنی محبتوں کا مان بخشا تھا، اسے ہمیشہ اپنے ساتھ کا یقین دلایا تھا، ان کی اعلیٰ ظرفی کی وہ قائل تھی، لیکن اب ان کا سامنا ہونے پر وہ چور سی بن جاتی، اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگتی، یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی کولیگز سے کرایہ کے مکان کے لئے کہہ رکھا تھا، مناسب کرایہ پر کہیں کوئی مکان ہی بھابھی کو آئندہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل سے بچا سکتا تھا اور آنیہ کو ندامت سے لاہور سے کوئی اجنبی عالیہ بیگم کو ڈھونڈتا ہوا ان کے در پر آ پہنچا تھا اور انہیں ان کے بڑے بھیا کی شدید علالت کی خبر اور ملاقات کی خواہش سے آگاہ کیا، اس نے اپنے آپ کو ان کا پرانا شاگرد بتایا تھا اور بڑے بھیا جو کہ یونیورسٹی کے ریٹائرڈ پروفیسر تھے ان سے موبائل پر بات بھی کروائی۔

اتنے برسوں بعد بھائی کی آواز نے انہیں تڑپا ہی تو دیا وہ فوراً احمر کے ہمراہ اس نوجوان کی معیت میں لاہور کے لئے روانہ ہو گئیں۔

☆☆☆

جاتی سردیوں کے خوشگوار دن کی فرحت بخش ہوائیں صحرا کی سمت سے چل رہی تھیں، کبھی ہوا اپنے ساتھ صحرائی مٹی کے سرخ ذرات راستوں پر اڑاتی بہار کی آمد پر جھومتی، گنگناتی راہتوں پر گردش کر رہی تھی۔

صحرا میں کبھی پھول نہیں کھلتے، پھر اس کی خوش فہم ہواؤں کا اس شہر میں آ کر سندیسہ بہار سنانا چہ معنی ندارد؟ شاید پیا سے دشت میں کچھ جگنو ابھی تک زندہ ہیں اور یہ طے ہے کہ جگنوؤں کی لاشیں بہت جلد ریت کی گود میں مدفون ہو جائیں گی۔

مزمل کے ساتھ سکول سے واپسی پر گھر کی اور قدم بڑھاتی آنیہ کے وجود پر یاسیت طاری ہونے لگی، اتنے دن کی کوششوں کے باوجود کوئی مناسب کرائے کا مکان نظر میں نہیں آ سکا تھا، مکان کے کرائے ہوش اڑانے کو کافی تھے، اس نے ڈیلر سے رابطہ کر کے کسی گروی مکان کو جلد تلاشنے کی درخواست کی تھی۔

کیونکہ وہ رویوں کے بدلنے سے خائف تھی، کہ بدلتے لہجے ہمارے اپنوں کو بھی سرتاپا بدل دیتے ہیں ارحم کے دیئے زخموں نے اس سکھایا تھا کہ رشتے موسموں کی مانند ہوتے ہیں ان کی ملائمت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا فقط ایک پل لگتا ہے موسم اور لہجوں کے بدلنے میں۔

یونہی لاتمناہی سوچوں میں گرفتار وہ تھکے تھکے انداز میں گھر لوٹ آئی، جہاں عالیہ بیگم بے تابی سے اس کی منتظر تھیں وہ کچھ دیر قبل ہی احمر کے ساتھ لاہور سے واپس لوٹی تھیں، ان کی دی گئی خبر سے وہ جہاں تہاں رہ گئی۔

''مجھے معاف کر دو میری چھوٹی بہن، میں نے اماں ابا کی مخالفت مول لے کر اپنی یونیورسٹی فیلو سے شادی کر لی اور تم سب سے ہمیشہ کے لئے ناطہ توڑ لیا، اپنی زندگی میں مگن کبھی مڑ کر تم لوگوں کی خبر نہیں لی، اماں، ابا مجھ سے خفا بنا بتائے چلے گئے، بہت برا ہوں اوپر جا کر کس منہ سے ان کا سامنا کروں گا۔'' بھرائی ہوئی آواز میں بولتے ہوئے ان کی سانس اٹکنے لگی۔

''بھیا! آپ کو کچھ نہیں ہو گا، آپ ٹھیک ہو جائیں گے اور ہم میں سے کوئی آپ سے خفا نہیں تھا، بس وہ وقتی غصہ تھا ابا، اماں بعد میں آپ کو یاد کر کے روتے تھے مگر آپ کا کوئی پتا ٹھکانہ نہیں ملا۔'' عالیہ بیگم برسوں کی پیاسی نگاہوں سے بڑے بھیا کا نورانی چہرہ دیکھتی رہیں، وہ بے حد نحیف و بیمار تھے ہسپتال میں سفید بستر پر دراز انہیں تڑپتا دیکھ کر وہ بلک اٹھی تھیں، ہر شکوہ دور ہو گیا تھا انہیں یوں بے بسی کے عالم میں اشکبار دیکھ کر۔

''آپ زیادہ مت بولئے، جب ٹھیک ہو جائیں گے پھر ڈھیروں باتیں کریں گے۔''

''نہیں میری بہن مجھے بولنے دو برسوں سے سینے پر بوجھ لئے پھرتا ہوں، کہہ لینے دو، تمہیں معلوم ہے ہم میاں بیوی تمام عمر اولاد کو ترستے رہے مگر شاید اماں ابا کے دل کو دکھانے کی سزا ملی، میری شریک حیات شادی کے چند سال بعد ہی چل بسی اور میں اپنی تنہائی کے ساتھ جیتا رہا، پرانے گھر گیا تو علم ہوا اماں ابا تو کوچ کر گئے اور تمہارا بیاہ ہو گیا اور آج میری تلاش ختم ہوئی ہے، میری بہن مجھے مل گئی۔'' طویل بات کے دوران ان کی سانس کئی بار سینے میں اٹکی ان کے لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھیں برس رہی تھیں، عالیہ بیگم کا حال بھی کچھ الگ تو نہ تھا۔

اور پھر وہ برسوں کی ندامت کے بوجھ سے ہلکے ہوئے تو مسکرا کر اگلے جہاں چلے گئے،

جانے سے پہلے اور بہت سی باتوں کے دوران اپنی وصیت ان کے حوالے کی تھی جس کے مطابق ان کا ذاتی مکان عالیہ بیگم کے نام کر دیا گیا تھا، ساری روداد سنانے کے بعد۔

عالیہ بیگم خاموش ہو گئیں، سب بچے اور آنیہ دم بخود سے ان کی بیان کردہ کہانی سن رہے تھے، اللہ نے کیسے غیب سے ان کی مدد کی تھی آنیہ کی نگاہیں اللہ کے حضور تشکر ندامت سے جھک گئیں، رشتوں کا بھرم قائم رہا اور رہنے کے لئے اپنی چھت میسر آ گئی، کون کہتا ہے کہ رب اپنے بندوں سے غافل ہو سکتا ہے، وہ رحیم و کریم ہے اور بندے کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔

وہ سب جلد ہی لاہور شفٹ ہو گئے تھے، بچوں کی تعلیم کا سلسلہ اور اپنی جاب لائف کا آغاز اس نے از سر نو کر لیا تھا۔

☆☆☆

نیلا آسماں سو گیا
آنسوؤں میں چاند ڈوبا، رات مرجھائی
زندگی میں دور تک پھیلی ہے تنہائی
جو گزرے ہم پہ وہ کم ہے
تمہارے غم کا موسم ہے
یاد کی وادی میں گونجے بیتے افسانے
ہمسفر جو کل تھے اب ٹھہرے وہ بیگانے
محبت آج پیاسی ہے
بڑی گہری اداسی ہے
نیلا آسماں سو گیا

رات کی آغوش میں سر دیئے نیل گگن سو رہا تھا جون کے گرم مہینے کی آخری تاریخوں کا زرد چاند اس کے اشکوں میں کچھ اور دھندلا گیا تھا، آج اسے ارحم سے جدا ہوئے دو سال کا عرصہ گزر گیا تھا، رات کی تنہائی میں اداسی کا ہاتھ تھامے وہ ماضی کے شہر میں ہر گام پر بکھری یادوں کی مسافت طے کرنے میں ہلکان ہو گئی تھی مزمل کے نیند میں اچانک رونے سے اس کی سوچوں میں خلل پڑا تھا، وہ اسے تھپکنے لگی، ماضی کے سفر کی تھکان اس کے رگ و پے میں اتر آئی تھی۔

نجانے کب کے پڑھے ہوئے اقوال اور شعر اسے یاد آئے ساتھ ہی ان سے جڑے اختلاف کے ہزار پہلو۔

''ارحم! آپ تو میرے تھے، آپ نے کیسے راہ بدل لی، کیوں کیا ارحم، کیوں کیا ایسا۔'' اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی گرنے لگے۔

موذن کی آواز نے اس کے ڈوبتے دل کو ذرا تقویت دی، معمول کے انداز میں وہ اپنے وجود کی بکھری کرچیوں کے سنگ وضو کر کے مصلے پر ذات باری تعالیٰ سے ہمت حوصلہ مانگتی رہی۔

خلیل جبران کہتا ہے کہ جب تم رو رہے ہوتے ہو تو تمہاری روح تمہیں عبادت پر اکساتی ہے اور بار بار اکساتی ہے حتیٰ کہ تمہارا رونا ہنسی میں بدل جاتا ہے، اس کی روح پر بھی سکون کے چھینٹے پڑنے لگے تھے اور بکھرا وجود سمٹ کر نئے دل کی مسافت کے لئے نئے سرے سے تیار تھا۔

زندگی مخصوص ڈگر پر رواں دواں ہو گئی تھی، وقت کا پہیہ دھیرے دھیرے چلتا رہا، وہ بہاروں کی ایک اداسی سی دوپہر تھی، آنیہ لان میں کھلی دھوپ سے کچھ پرے ادھر چھاؤں میں سنگھار کے پھولوں سے لدے درخت کے نیچے کرسی ڈالے براجمان تھیں اور ٹیوشن کے لئے آئے بچوں کو پڑھانے میں منہمک تھیں۔

گزرے مہ و سال نے ان کے چہرے پر تھکان کی صورت گہرے نقوش ثبت کیے تھے، آنکھوں پر پڑے حلقوں کے اوپر سفید شیشوں والے نفیس اور سنہری فریم کا چشمہ دھرا تھا، آم، آلو بخارا، فالسہ، لیموں کے پیڑ بور سے لدے ہوئے تھے جبکہ اردگرد کی کیاریوں میں قطار در قطار کھلے گلاب، موتیا، گیندے، چمپا، کاسنی اور چنبیلی کے پھول ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے، فضا میں چڑیاں، کوے، طوطے، مینا کی چہکاریں گونج رہی تھیں۔

آفاق گھاس کاٹنے والی مشین سے لان کی گھاس کاٹنے میں مشغول تھا، جبکہ احمر، مزمل کو میتھ کا ایک سوال سمجھانے میں لگا ہوا تھا۔

''آئے ہائے آنکھ اتنی دکھ رہی ہے، ارے دیکھو تو دھوپ کی طرف نظر اٹھا کے دیکھا نہیں جا رہا۔'' عالیہ بیگم قریب بچھی چارپائی پر اونگھ رہی تھیں جب ذرا نیند ٹوٹتی تو درد کی دہائی دینے لگتیں۔

''مامی! آپ سے کتنی بار درخواست کی ہے آپ کی آنکھ میں روشنی چبھتی ہے آپ اندر کمرے میں آرام کریں، مگر آپ اپنی من مانی کرتی ہیں، سورج کی روشنی میں لیٹنا ہے اور دھوپ کی طرف بھی دیکھنا ہے۔'' آنیہ کے انداز میں ان کے لئے فکرمندی اور ہلکی سی جھنجھلاہٹ تھی۔

''تم جانتی تو ہو میرا دل تنہا بیٹھنے سے گھبراتا ہے، تم سب کے بنا اندر نہیں لگتا جی، جہاں تم سب وہاں میں۔'' انہوں نے بے بسی سے عذر بیان کیا، ان کی بات سچ تھی وہ خاموشی سے بچوں کی کاپیوں کی جانب متوجہ ہو گئیں اسی پل گیٹ کی اطلاعی گھنٹی بجی تھی، مزمل نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔

''السلام علیکم!'' وہ دور سے ہی سلام جھاڑتی ہنستی مسکراتی دوڑ کر آنیہ سے لپٹ گئی، چلتی ہوا کے جھونکے نے ان دونوں پر ہار سنگھار کی شاخیں ہلا کر پھول نچھاور کیے تھے جبکہ اماں گیٹ پر ہانپتی کانپتی اپنے نحیف وجود اور اتھل پتھل ہوتی سانسوں کی سنبھالنے میں ہلکان ہو رہی تھیں۔

وہ سب مسکرا کر ان کے استقبال کو بڑھے جبکہ جبیرہ عالیہ بیگم سے ملنے میں مصروف ہو گئی۔

''توبہ توبہ اس عمر میں اتنا سفر، ہائے یہ لڑکی میری جان لے کر چھوڑے گی۔'' اماں کے واویلے جاری تھے، جبیرہ کھلکھلا اٹھی۔

''دادو فکر نہ کریں آپ ابھی مزمل کی شادی تک زندہ سلامت رہیں گی۔'' اس نے 9th کے طالب علم مزمل کے شرارت سے بال بکھیر ڈالے۔

''اماں آپ پہلے سانس درست کریں یہاں بیٹھ جائیں۔'' آنیہ نے انہیں چارپائی پر بٹھا دیا، احمر بھاگ کر پانی لے آیا۔

''ارے بھابھی آپ کی دائیں آنکھ میں کیا ہوا ہے؟'' ان کی سرخ متورم آنکھ دیکھ کر حواس بحال ہوتے ہی انہوں نے استفسار کیا۔

''بس آپا! کافی دن سے دکھ رہی ہے، ٹھیک سے نظر نہیں آتا، پانی نکلتا ہے، آنکھ کے ڈاکٹر کو دکھایا ہے اس نے دوا اور ڈراپس دیئے ہیں، ابھی تو فرق نہیں پڑا۔'' عالیہ بیگم نے تفصیل فراہم کی اور ان کا حال احوال سننے میں لگ گئیں۔

''پھپھو جانی میں اتنے دن سے آپ سب کو یاد کر رہی تھی، پاپا کو ٹائم نہیں ہے، ماما انہیں اکیلے چھوڑ کر نکلتی نہیں بہت محبت والی بیوی ہیں نہ، باسل بھائی ایم بی اے کر ڈگری لئے بنا امریکہ سے نہیں آنے والے، تو دادو کو ہی زحمت دینی پڑتی ہے اور آپ کی ملاقات بھی ہو جاتی ہے اپنی ماں سے، دیکھیں ذرا اللہ جی مجھے کتنا ثواب دیتے ہوں گے۔'' وہ نان اسٹاپ اپنے مخصوص چلبلے انداز میں بول رہی تھی۔

''بہت اچھا کیا تم یہاں آ گئیں، پیپر کیسے ہوئے تمہارے؟'' وہ اس سے بی اے کے امتحانات کی تفصیل کریدنے لگیں۔

''احمر بھائی آپ کے بی کام کے پرچے کیسے رہے؟'' اس کے ہاتھ سے کولڈ ڈرنک کا گلاس لے کر استفسار کیا۔

''الحمدللہ اور میں نے پہلے بھی تمہیں کتنی بار منع کیا ہے میں تم سے سات دن بڑا ہوں، سات سال نہیں جو بھائی کا لاحقہ استعمال کرتی ہو۔'' اس کی بات کا جواب دے کر اس نے کڑے تیور دکھائے پھپھو اور وہ ہنس دیں۔

''بھئی جو کہہ لیں، مگر آپ بڑے ہیں تو بھائی ہی کہوں گی ناں میں بہت باادب تمیز دار قسم کی بچی ہوں۔'' اس کے لہجے میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، آنیہ ان کی نوک جھونک سے واقف تھی اسی لئے پھر سے بچوں کی سمت متوجہ ہو چکی تھی۔

''ہاں سب سمجھتا ہوں تمہاری چالاکیاں۔'' احمر نے اس کی پونی ٹیل کھینچی۔

''احمر بدتمیز! تمہیں عزت راس نہیں آتی، تم کبھی نہیں سدھرو گے۔'' اس کی حرکت پر وہ فوراً اپنے اصل انداز میں اس سے مخاطب ہوئی، آفاق اور مزمل ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

''ہاں لگتا ہے آج بہت دن کے بعد تم دونوں نے ٹوتھ برش سے دانت چمکائے ہیں جو باہر نکل رہے ہیں، دانت اندر کر لو ورنہ گر جائیں گے۔'' ان تینوں کو ہنستا دیکھ کر اس نے مصنوعی دانت پیسے۔

''کیا ہوا بھائی، بھائی والا ادب احترام سب ختم، تم تو گرگٹ سے زیادہ جلدی رنگ بدلتی ہو۔'' احمر مسلسل اسے چھیڑ رہا تھا، بہاروں کی دوپہر ڈھلتے ڈھلتے ٹھہر کر انہیں دیکھنے لگی تھی پھول مسکرا کر لہرانے لگے تھے، پرندے خوشی سے گیت گانے لگے تھے۔

''زیادہ بنو مت، تم دیکھنے میں اپنی عمر سے زیادہ بڑے لگتے ہو بھائی نہیں کہوں گی تو یہ سب ٹیوشن کے بچے مجھے پتا نہیں کتنا بڑا سمجھیں گے۔'' اس نے منہ بسورا اس کی بات پر سب حاضرین ہنس پڑے۔

''تمہارے یہ گھسے پٹے ڈائیلاگ ناں، اب بچوں کو زبانی ازبر ہو گئے ہیں ان کے سامنے ہر بار ایسے ہی ڈرامہ کرتی ہو پھر اس کا ڈراپ سین، سب بچے جانتے ہیں تم مجھ سے سات دن چھوٹی ہو اور میں اب تیس سال کا ہو جاؤں گا۔'' اس بات پر سب بچے ہنس پڑے اور وہ اس کے کھلے عام جھوٹ پر دل تھام کے بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی۔

''جاؤ میں نہیں بولتی اور آفاق میاں مالی بن کے گدھے کی طرح گھاس کھاتے رہتے ہو یا کالج کی پڑھائی بھی ہو رہی ہے؟'' اس نے احمر کو مکمل نظر انداز کر کے روئے سخن آفاق کی جانب موڑا۔

''گدھا گھاس نہیں کھاتا۔'' مزمل نے تصحیح کی۔

''میں بھی گھاس نہیں کھاتا۔'' آفاق کی سادگی سے دی گئی وضاحت پر وہ سب ہنس پڑے آنیہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

''اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ میں گدھا ہوں۔'' اس کے گڑبڑانے پر وہ دیر تک ہنستی رہی، وہ ایف ایس سی پری میڈیکل کے فرسٹ ائیر کا طالب علم تھا۔

''اچھا گائز میری کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے شاگرد انتظار کر رہے ہوں گے۔'' احمر معذرت کرتا اٹھ گیا وہ قریبی اکیڈمی میں جاب کرتا تھا۔

''تم پہلے میتھ کے وہ سوال حل کرو جو میں نے سمجھائے ہیں پھر بہن کے ساتھ کھیل میں مگن ہونا او کے۔'' جانے سے پہلے اس نے مزمل کو

تنبیہ کی تھی جس پر وہ برے برے منہ بناتا ماما کے پاس کتابیں لے کر بیٹھ گیا، وہ جانتا تھا پڑھائی کے آگے کوئی سمجھوتہ نہیں ہوتا اس گھر کے اصولوں میں پڑھائی سب سے پہلے ہے۔

''پھپھو! ماما، ملیحہ آپی آپ کو سلام کہہ رہی تھیں۔'' شام کو کچن میں باتوں کے دوران اچانک یاد آنے پر اس نے انہیں مخاطب کیا۔

''جی اللہ کا شکر ہے وہ اپنے سسرال میں شوہر کے ساتھ خوش وخرم ہیں، ان کا بیٹا اثمر ماشاء اللہ دو سال کا ہو گیا ہے، اس کی سالگرہ کی تصاویر میرے موبائل میں ہیں، میں دکھاؤں گی۔'' پھپھو کے خیریت دریافت کرنے پر اس نے تفصیلاً جواب دیا۔

''اللہ ملیحہ کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے آمین۔'' آنیہ نے دل سے دعا دی اور چاول نل کے نیچے رکھ کر بھگو دیئے، جبکہ عبیرہ بریانی کے لئے مصالحہ بھون رہی تھی، یخنی تقریباً تیار ہی تھی، ہاتھوں کے ساتھ زبان بھی تیزی سے چل رہی تھی، جب عاشر نے کچن میں قدم رکھا۔

''اخاہ مس عبیرہ کی سواری باد بہاری ہمارے ہاں اتری ہوئی ہے۔'' اس کے سلام کا جواب دے کر اس کی شان میں قصیدہ گوئی کی، ماما نے محبت سے اسے دیکھا، اونچا لمبا، ہینڈسم بے حد وجیہہ صورت کا حامل ان کا بیٹا ہو بہو ارحم کی جوانی کی منہ بولتی تصویر تھا۔

''اللہ میرے بچے کو زندگی میں ہر رشتے سے وفا کرنے کی توفیق دینا آمین۔'' انہوں نے کسی بیتے لمحے کے سائے کے زیر اثر صدق دل سے دعا کی اور بغور اسے دیکھا، ان کا یہ بے حد سنجیدہ فرمانبردار اور سب کا خیال رکھنے والا بیٹا جب اس بہاروں جیسی لڑکی کو دیکھتا تھا اس کے لب خود بخود مسکرا اٹھتے تھے اور اپنے خول سے باہر نکل آتا تھا۔

''جی کیونکہ آپ کی سواری کا رخ ہمارے شہر کی جانب ہونے سے رہا لہٰذا ہم نے سوچا ہم ہی پھپھو کے آنگن میں اتر کر ان کے ہونہار، لائق لیکچر شپ میں تندہی سے مصروف فرزند کا دیدار کر آئیں۔'' یخنی میں سے چکن کی بوٹیاں نکال کر مصالحہ میں شامل کر کے بھنائی کرتی عبیرہ نے شان بے نیازی سے اپنی تقریر کا اختتام کیا، عاشر کے ساتھ ماما بھی مسکرانے لگیں ان دونوں کو دیکھ کر ان کے اندر ایک دیرینہ آرزو مچل اٹھتی تھی، عاشر کو حال ہی میں ایم ایس سی کیمسٹری کے بعد مقامی کالج میں لیکچر شپ ملی تھی اور دوپہر میں ایک اکیڈمی میں پڑھاتا تھا۔

''ہاں بہت اچھا کیا جو آپ کے مبارک قدم ہمارے گھر تشریف لائے کچن کی قسمت پھوٹے بہت عرصہ ہو چلا تھا۔'' اس کی زبان میں کھجلی ہوئی۔

عبیرہ نے لڑاکا عورتوں کے اسٹائل میں ایک ہاتھ کمر پر ٹکا کر اپنی ستارا سی آنکھیں سکیڑ کر اسے خشمگیں انداز میں گھوری سے نوازا اور پھر سے کام میں مصروف ہو گئی۔

''پھپھو جانی ان سے کہہ دیجئے کہ میری اتنی اچھی کوکنگ کا مذاق اڑا کر ''ہائے'' نہ سمیٹیں ایسا نہ ہو برے برے بدذائقہ کھانے بنانے والی بیگم مل جائے، پھر پوچھوں گی۔'' اس کی دھمکی پر عاشر کا قہقہہ بے ساختہ تھا، ایک عرصہ بعد گھر کے در و دیوار نے اس کی ہنسی سنی تھی، ہواؤں نے لان میں کھلے پھولوں تک یہ خبر پہنچائی تو وہ فرط مسرت سے جھومنے لگے، شام بھی ہولے سے مسکرا دی۔

☆☆☆

آپریشن تھیٹر کے باہر ہوسپٹل کے کوریڈور میں وہ مضطرب سی مسلسل قرآنی آیات اور مختلف

دعاؤں کو زیر لب دہراتی چہرے پر تفکر آمیز تاثر لئے ٹہل رہی تھی، ممانی کی آنکھ کی بینائی دن بدن دھندلاتی جا رہی تھی، ان کی آنکھ کی جھلی پر زخم تھے علاج معالجہ سے افاقہ کے بجائے صورتحال اور بگڑتی چلی گئی اب یہ حال تا کہ جھلی سکڑ کر آنکھ کی بصارت کے مقام پر چپک گئی تھی اور بینائی بچانے کے لئے آپریشن کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، سو وہ عاشر کے ساتھ یہاں موجود تھیں احمر کو کچھ دیر قبل ہی انہوں نے گھر بھیجا تھا کہ وہاں امی اور عبیرہ اکیلی تھیں، آفاق اور مزمل سکول کالج سدھارے ہوتے تھے، رہی وہ خود تو انہیں ویسے بھی عاشر کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر سکول کی نوکری چھوڑے ایک ماہ ہو چلا تھا ہاں ٹیوشن پڑھانا انہوں نے جاری رکھا تھا کہ زندگی میں اس مصروفیت سے کچھ رونق کا احساس رہتا تھا، ورنہ موسموں، ہواؤں کے رخ اور تبدیلیوں پر دھیان دیئے مدت گزر گئی تھی۔

''اوہ! احمر کا موبائل تو میرے پاس ہی رہ گیا۔'' اس کے پاس بیلنس نہیں تھا تو اس کے نمبر سے اپنے پی سی او والے دوست کو ایزی لوڈ کروانے کے لئے کال کی اور جلدی میں دادی کی پریشانی میں اسے واپس دینا بھول گیا۔

''وہ ابھی یہیں ہوگا میں اسے دے کر آتا ہوں۔'' بوکھلا کر وہ سرعت سے پلٹا تھا۔

''تم یہاں رکو، صبح سے یہاں سے وہاں بھاگتے اپنی دادی کے آپریشن کے لئے انتظامات میں ہلکان ہوتے رہے ہو، میں اسے موبائل دے آتی ہوں۔'' اس کی ناں، ناں کو نظر انداز کر کے سیل فون ہاتھ میں لئے وہ قدم بڑھا گئیں۔

کوریڈور مڑتے ہی اک اور کوریڈور کی حدود شروع ہوتی تھیں، دائیں بائیں پڑے بینچوں پر مرد، خواتین، بچے، بوڑھے پرچی ہاتھ میں لئے ڈاکٹر کے روم کے باہر آؤٹ ڈور مریضوں کے طور پر اپنی باری کے انتظار میں تھے، فضا میں مختلف آوازوں کا ہلکا سا شور تھا، ایک قطار میں رکھے دائیں طرف کے بینچوں کی قطار کے پیچھے جالی دار کھڑکیوں سے پیچھے ہوسپٹل کے لان میں مریضوں کے لواحقین اور دھوپ کا بسیرا تھا، ایک بری طرح سے کھانستا ہوا شخص ان سے چند قدم کے فاصلے پر موجود ڈاکٹر کے کمرے سے باہر نکلا تھا اور مسلسل کھانسی سے دہرا ہوتے ہوتے اوندھے منہ گر پڑا، دو چار لوگ اسے اٹھانے لپکے تھے، انسانیت کے ناطے انہوں نے اک ترحم بھری نگاہ کی۔

''نجانے کون ہے بیچارا۔'' سرسری نگاہ ڈال کر گزرنا ہی چاہتی تھیں کہ اک نامعلوم سے احساس نے ان کا دل مٹھی میں بھینچ لیا پاؤں آگے بڑھنے سے انکاری ہو گئے وہ تڑپ کر پلٹی تھیں۔

''ارحم!'' ان کے لبوں نے بے آواز جنبش کی۔

ملگجا سا شلوار سوٹ، بڑھی ہوئی شیو سر اور داڑھی کے سیاہ بالوں میں سے جا بجا سفید بال جھانک رہے تھے۔

سفید رنگ سنولا کر زرد پڑ چکا تھا، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، صحت مند بھرے بھرے گالوں کی بجائے پچکے ہوئے گال بے حد نمایاں تھے، لاغر وجود، ایک پل کے لئے انہیں اپنی بصارت پر شک کا گمان ہوا، یہ وہ ارحم تو نہیں تھا، یہ ارحم ہو ہی نہیں سکتا تھا کہاں وہ اپنے لباس اور شخصیت کو لے کر ہمیشہ بن ٹھن کر نفیس حلیے میں رہنے والا شخص، کہاں یہ اپنی ذات سے لاپرواہ ستے سے شکن زدہ شلوار سوٹ میں ملبوس لاغر وجود۔

انہوں نے سر جھٹک کر اپنے دل میں زخم خوردہ، سسکتی، بلکتی درد کی صورت جلوہ گر اس کی محبت کے ہر برے خیال کو جھٹکنا چاہا لیکن پتھرائی ہوئی اس کے وجود پر جمی آنکھوں میں آتی نمی نے اس خیال پر یقین کی مہر ثبت کر دی۔

وارڈ بوائے کی مدد سے اس کے بے ہوش جسم کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمرجنسی وارڈ میں پہنچا دیا گیا تھا۔

''میں نے ابھی اس پیشنٹ کو سمجھایا تھا کہ اسے مکمل علاج کی ضرورت ہے اس کا یہاں ایڈمٹ ہونا بہتر ہے مگر اس نے میری بات نہیں مانی۔'' وارڈ بوائے کی اطلاع پر ڈاکٹر صاحب کوفت زدہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے باہر آئے اور ایمرجنسی وارڈ کی جانب بڑھ گئے۔

وہ پتھر کے بت کی مانند سن ہوتے وجود کے ساتھ دیوار سے لگی بے آواز آنسو بہاتی رہیں، ان کے دماغ میں ان گنت سوالات مچل رہے تھے اسے اس شہر میں ایسی حالت میں دیکھ کر وہ بے یقینی کے سمندر میں ڈوبتی ابھرتی ساکن کھڑی تھیں، اس کی بے اعتنائی و ناروا رویے کے باوجود نجانے کیوں وہ اس سے نفرت نہیں کر پائی تھیں، مگر اس کا سامنا بھی تو نہیں کرنا چاہتی تھیں، انہیں اپنا پندار بہرحال عزیز تھا، لیکن اس ایسے عالم میں چھوڑ کر جانا بھی گوارا نہ تھا۔

وہ اپنے چٹختے وجود کو گھسیٹ کر ایمرجنسی روم کے باہر آ کر بینچ پر بیٹھ گئیں، ان کے ذہن سے یکسر محو ہو چکا تھا کہ وہ کس کام سے یہاں سے گزر رہی تھیں یا امی کی آنکھ کا آپریشن جاری ہے، دھیان میں بس ایک ہی شخص، ایک ہی نام تھا، ارحم اس کے سوا ساری دنیا کو فراموش کر چکی تھیں، ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی سلامتی و تندرستی کی دعائیں ان کے لبوں کو چھونے لگیں۔

''ڈاکٹر صاحب! اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟'' اسے آکسیجن اور سکون آور انجکشن لگا کر وارڈ میں شفٹ کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے جب ڈاکٹر صاحب باہر نکلے تو انہوں نے بے اختیاری میں تیزی سے کھڑے ہو کر سوال کیا۔

''آپ ان کے ساتھ ہیں؟ آئیے میرے ساتھ۔'' انہوں نے لمحہ بھر کو ٹھٹک کر سیاہ عبائے میں ملبوس خاتون کو دیکھا اور ان کی خاموشی سے نتیجہ اخذ کر کے انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر دیا۔

کھڑکی کی جالیوں سے چھن چھن کر آتی گلابی دھوپ ان کے گم صم وجود اور چہرے پر چھائی گہری سوچوں کے جال کا احاطہ کیے ہوئی تھی، وہ سایوں کی مانند اردگرد سے گزرتے مریضوں کو ادھر سے ادھر حرکت کرتے دیکھ رہی تھیں اور سماعتوں میں آتی ملی جلی آوازوں کو نا سمجھی سے معنی دینے کی سعی میں غلطاں و پیچاں تھیں، راہداری مڑتے ہی عاشر کی نگاہ نے انہیں جا لیا، انہیں دیکھ کر گونا گوں اس نے بے اختیار سکون کی سانس خارج کی۔

''ماما!'' اس کے قریب آ کر مخاطب کرنے پر بھی جب ان کے وجود میں حرکت نہ ہوئی تو اس نے فکرمندی سے ان کا کندھا ہلایا۔

''آں، ہاں۔'' وہ بے حد چونک کر ایکدم سے اسے دیکھنے لگیں جیسے پہچاننے کی جستجو میں ہوں۔

''ماما آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟ کیا ہوا احمر نہیں ملا تھا اور آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں، آپ رستہ بھول گئی تھیں؟'' اس نے بے قرار لہجے میں کتنے سوال ایک ساتھ کر ڈالے ان کے گئے آدھا گھنٹہ ہو چلا تھا مجبوراً وہ متفکر ہو کر ان کو تلاشنے نکل پڑا۔

''میں...... میں ٹھیک ہوں، شاید کہیں دور گم ہو گئی تھی، تم آ گئے ہو چلو واپس چلتے ہیں۔'' شعور

سے رشتہ بحال ہوا تو تھکن آلود سانسوں کے درمیان انہوں نے جیسے خود کلامی کی اور اٹھ کھڑی ہوئیں، عاشر نے بمشکل ان کی سرگوشی سنی اسے وہ کہیں سے بھی ٹھیک نہیں لگ رہی تھیں، مگر وہ ان کی حالت کو دادی کی پریشانی پر محمول کرتے ہوئے ان کے کندھے کے گرد بازو حمائل کیے اور چل پڑا۔

☆☆☆

پوچھنے والے!
تجھے کیسے بتائیں آخر
دکھ عبارت تو نہیں جو تجھے لکھ بھیجیں
یہ کہانی بھی نہیں ہے کہ سنائیں تجھ کو
نہ کوئی بات ہی ایسی کہ بتائیں تجھ کو
زخم ہو تو تیرے ناخن کے حوالے کر دیں
آئینہ بھی تو نہیں ہے کہ دکھائیں تجھ کو
تو نے پوچھا ہے مگر کیسے بتائیں تجھ کو
یہ کوئی راز نہیں، جس کو چھپائیں تو وہ راز
کبھی چہرے، کبھی آنکھوں سے چھلک جاتا ہے
جیسے آنچل کو سنبھالے کوئی، اور تیز ہوا
جب بھی چلتی ہے تو شانوں سے ڈھلک جاتا ہے
اب تجھے کیسے بتائیں کہ ہمیں دکھ کیا ہے!!

وہ بے حد سنجیدگی سے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے میں مشغول تھی، پچھلے کئی دنوں سے اس کی ذات پر چھائی غیر معمولی خاموشی گھر کے سبھی نفوس کو چونکانے کا باعث بنی تھی، اپنے طور پر ہر کسی نے کریدنے کی سعی کی اور کچھ نا جانتے ہوئے بھی اپنے تئیں دلاسہ دینے، بہلانے کی تگ و دو میں برسر پیکار تھے

امی کی آنکھ کی پٹی کھل چکی تھی، مگر احتیاط کے پیش نظر ابھی کچھ دن کے لئے آنکھ پر سیاہ پردہ روشنی سے محفوظ رہنے کے لئے ڈال رکھا تھا ان کو اس دن آپریشن کے بعد ہی ڈسچارج کر دیا گیا تھا، ہاں معائنہ اور پٹی کے لئے وہ امی کو لے کر جاتی رہی تھیں۔

موسم میں ہلکی سی حدت کا احساس نمایاں ہونے لگا تھا، مگر ساتھ میں چلتی ہوا فرحت سے بھرپور تھی۔

امی اور اماں دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کر رہی تھیں، عبیرہ کچھ دیر ان دونوں کے خراٹے سنتی رہی پھر منہ لٹکائے باہر نکل آئی یوں بھی اسے دوپہر کو نیند نہیں آتی تھی۔

عاشر لان میں چیئر پر براجمان سامنے رکھی ٹیبل پر جھکا کل کے لیکچر کے نوٹس بنانے میں مصروف تھا، قریب ہی چارپائی پر کتابیں بکھیرے احمر رزلٹ سے پیشتر ایم بی اے کے اینٹری ٹیسٹ کی تیاری میں لگا ہوا تھا، جبکہ آفاق حسب معمول پودوں کی تراش خراش میں مگن تھا اور مزمل کتاب کھولے اونگھ رہا تھا۔

حاضرین پر اک نظر ڈال کر وہ دھم سے چارپائی پر آ بیٹھی۔

''اٹھ گئیں تم۔'' پھپھو جانی نے یونہی اسے مخاطب کیا۔

''میں تو آپ سب کے اصرار پر مروت میں سونے کی کوشش میں تھی اب تھک کے باہر نکل آئی، کیا پھپھو آپ اتوار کے دن تو ننھے ننھے بچوں پہ ظلم نہ کیا کریں ان کو بھی عیش کرنے دیں تھوڑی۔'' گو کہ وہ جانتی تھی بچوں کے سکول ٹیسٹ کی بدولت انہیں آج بلوایا گیا ہے مگر ماحول پر چھائے سکوت کو توڑنے اور درد دل چھپا کر رکھنے والی اپنی پھپھو کا دھیان بٹانے سب کو بہلانے کی غرض سے وہ یونہی بے وجہ کچھ نہ کچھ ہانکتی رہتی تھی۔

''وہ دیکھیں بچارے مزمل کا کیسا اتنا سا منہ نکل آیا، ہائے معصوم سی جان پر اتنا ظلم۔'' اس

نے لہجے کو مصنوعی رقت آمیز بنایا۔

ہارسنگھار کے درخت پر کھلے پھولوں کے گچھوں سے لدی شاخوں پر پھدکتی، چہچہاتی چڑیوں نے یکدم بہت سا غل غپاڑہ مچایا اور اڑ گئیں، ہوا کے جھونکے نے بہت سے پھول کرسی پر موجود ان کے وجود پر گرا دیئے۔

وہ عبیرہ کی بات پر ہولے سے مسکرا دیں، جبکہ مزمل چونک کر مظلوم سی شکل بنا کر بیٹھ گیا۔

''حق ہا، بچے دنیا بہت ظالم ہے کوئی تم پہ ترس نہیں کھانے والا پڑھ لے بیٹا، تا کہ جلد گلو خلاصی ہو اور ''بابا بہاولپوری سرکار'' تیرے ساتھ کھیل سکے۔'' اس کے درویشانہ اسٹائل میں ایک ہاتھ اٹھا کر مضحکہ خیز انداز میں مزمل کو پچکارنے پہ سبھی کے لبوں پہ مسکراہٹ آ گئی۔

''بے ایمان بابے تم بس سگوں پہ ترس کھانا، وہ دیکھو کتنی ننھی سی بچی ہے شاید بمشکل تین سال کی ہو گی کیسے پتھر دل والدین ہیں اتنی سی جان پہ تعلیم کا بوجھ لاد دیا، مجھے تو سچ میں ترس آ رہا ہے۔'' احمر نے بات مذاق کے رنگ میں کہی تھی، مگر اس کے زیر اثر سب نے اس کی نگاہ کے تعاقب میں نظر دوڑائی، وہ واقعی ایک بے حد خوبصورت ننھی سی گلابی رنگت اور پھولے پھولے گالوں والی پری تھی، جو آنیہ کو کاپی پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر دکھانے آئی تھی اور کاپی پنسل گھاس پر پھینک کر اس کی گود میں گرتے پھول بے حد اشتیاق سے قلقاریاں مارتے ہوئے اٹھانے اور پھر معصوم سی ادا سے اسے دکھانے میں لگی تھی، عبیرہ کو بے اختیار اس پر پیار آیا، آفاق بھی کانٹ چھانٹ چھوڑ کر چلا آیا، آنیہ مسکرا کر اسے گود میں بھر چکی تھیں۔

''ارے یہ گڑیا پڑھنے تھوڑی آئی ہے یہ تو بس ایسے ہی ہمدانی صاحب کے مالی بابا کی بیٹیوں کے ساتھ چلی آئی۔'' ہمدانی صاحب ان کی لائن میں تیسرے گھر میں رہتے تھے ان کے مالی بابا کی بیٹیوں کو ماما فری ٹیوشن دیتی تھیں۔

وہ اور آفاق اشتیاق آمیز دلچسپی سے اس کے گالوں کو چھو رہے تھے جواباً وہ کھلکھلا اٹھتی، عبیرہ نے اسے اپنی گود میں لینے کی کوشش کی مگر وہ رخ موڑ کر آینہ سے لپٹ گئی۔

''تمہاری شکل اسے پسند نہیں آئی ڈر گئی بیچاری۔'' احمر کو موقع مل گیا اسے تنگ کرنے کا، اس کے کہنے پر سبھی ہنس دیئے۔

''جی نہیں میری اوٹ میں سے تمہارا نظر آتا چہرہ دیکھ کر ڈر رہی ہے۔'' اس نے ادھار چکایا۔

''ہمارا حسن اچھے اچھوں کو یونہی مدہوش کر دیا کرتا ہے۔'' وہ اترانے لگا عبیرہ سمیت سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''اللہ رے خوش فہمی۔'' وہ سر جھٹک کر بچی کی طرف متوجہ ہوئی۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''

''حمنہ۔'' جواب بچی کے بجائے مالی بابا کی بڑی بیٹی نے دیا تھا۔

''یہ تمہاری کیا لگتی ہے؟'' دونوں کے رنگ روپ شکل صورت میں بے حد تضاد تھا تبھی اس نے یہ سوال کیا۔

پھپھو جانی نے اس کے گال پہ بوسہ دے کر نیچے اتار دیا اور بچوں کی کاپیاں چیک کرنے میں لگ گئیں، مگر حمنہ، عبیرہ کے بجائے احمر کی طرف لپکی تھی اور چارپائی سے لگ کر اسے دیکھنے لگی۔

''باجی یہ ہمارے صاحب کے مہمان کی بیٹی ہے، وہ آؤٹ ہاؤس میں رہتے ہیں جی، اب کافی دن سے وہ کہیں چلے گئے ہیں جی تو اس کو سنبھالنے کی ڈیوٹی صاحب جی نے ہمارے ذمہ سونپی ہے۔'' اس نے سبق کی طرح فرفر تفصیل

بتائی۔

''دیکھئے میڈم یہ خوبصورت بچی، صرف خوبصورت لوگوں کے پاس ہی جاتی ہے۔'' احمر نے اپنے پاس کھڑی بچی کو اٹھا کر بانہوں میں لیا اور پیار کر کے چاکلیٹ تھما کر اتار دیا، اس نے اس کی چھیڑ خانی ان سنی کر دی۔

''کیسے ماں باپ ہیں اتنی سی بچی ایسے کسی کے حوالے کر کے گئے ہیں۔'' اس نے پھپھو جانی سے اپنا خیال شیئر کیا۔

''اس کی ماما نہیں ہیں، پاپا ہیں بس چندا ہو گی کوئی مجبوری۔'' وہ شاید پہلے ہی تمام معلومات اکٹھی کر چکی تھیں تبھی اسے آگاہ کیا تھا۔

''اوہ۔'' وہ تائید میں سر ہلا کر رہ گئی۔

اب وہ ننھے ننھے قدم اٹھاتی نرم گلابی ہاتھوں سے عاشر کو اپنی سمت متوجہ کر کے چاکلیٹ ریپر کھولنے کا مطالبہ کر رہی تھی، اس نے اپنے نوٹس سے سر اٹھا کر نرم سی مسکراہٹ سے اسے چاکلیٹ کھول کر تھما دی، عبیرہ بے حد غور سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''ارے! آپ دونوں کے نین نقش میں سے حد مشابہت ہے۔'' اس نے با آواز بلند قیاس کیا، سب ہی نے چونک کر تائید کی تھی۔

''یہ تو آپ کی بہن لگ رہی ہے عاشر بھائی۔'' اس نے رائے دی۔

''ہاہا تھینک یو، تم در پردہ میرے حسن کی تعریف کر رہی ہو۔'' وہ کہاں کسی سے پیچھے رہنے والا تھا۔

''نن...... نہیں میرا وہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ گڑبڑائی سب کی ہنسی سے وہ بے حد جھینپ گئی تھی۔

☆☆☆

دعا میں لب پہ سوال رکھنا
نگاہ میں اپنی کمال رکھنا
دینا چاہتے ہو اگر خوشیاں ہمیں
تو خوش رہنا اور اپنا خیال رکھنا

اس نے شعر کے اختتام پر تمام حاضرین پر اک نظر ڈالی۔

''واہ، واہ۔'' احمر تالیاں پیٹ پیٹ کے سر دھننے لگا۔

کل صبح اس کی روانگی تھی، کھانے سے فراغت پا کر وہ سب لان میں نکل آئے تھے جہاں آفاق اور مزمل نے ڈھیروں ڈھیر ننھے دیئے جلا کر روشن کر رکھے تھے، مقصد آج اس کے ساتھ رتجگا منانے اور ڈھیروں ڈھیر باتیں کرنے کا تھا، وہ لوگ ہمیشہ سے اس شہر میں اس کی آخری رات کو خاص اہتمام کرتے تھے، سردیاں ہوتیں تو لیونگ روم میں کوئلے دہکا کر اس کے گرد بیٹھ کر خشک میوہ جات کے ساتھ بے شمار لطائف اشعار، گانے ایک دوسرے کو سنائے جاتے، گرمیاں ہوتیں تو کبھی ساری رات لان میں مختلف کھیل کھیلے جاتے، یا پھر شاعری کی محفل جمتی جو زیادہ تر ان کی نوک جھونک کر نذر ہو جاتی۔

ہمیشہ کی طرح اس نے پھپھو جانی اور دادو کا خیال رکھنے پڑھائی میں دل لگانے اچھا انسان بنانے کی ڈھیروں نصیحتیں کی تھیں اور سب کے لئے شعر سنایا تھا اور اس کی تقریر کے دوران حاضرین سونے کی ایکٹنگ کرتے رہے تھے اب احمر خواہ مخواہ اوور ایکٹنگ میں لگا تھا۔

''بس میرے بھائی اپنے جذبات پہ قابو رکھو۔'' عاشر نے تالیاں بجاتے احمر کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

''کیا کروں بھائی اتنی خوشی برداشت نہیں ہو رہی ہائے میرا دل، عبیرہ تم واقعی میں صبح جا رہی ہونا۔''

وہ اس کے ڈرامے جانتی تھی تبھی آرام سے آئس کریم کا کپ ختم کرنے میں مگن رہی جو چند لمحے قبل مزمل فریزر سے ان سب کے لئے نکال کر لایا تھا۔

میں نے روکا بھی نہیں، وہ ٹھہرا بھی نہیں
حادثہ کیا تھا جسے دل نے بھلایا بھی نہیں
جان والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی
تم چلے ہو تو کوئی روکنے والا بھی نہیں

اس نے لہک لہک کر شعر سنایا۔

''احمر بھائی ہم سب اتنا تو روک رہے ہیں، ایسے تو نہ کہیں ناں۔'' آفاق برا منا گیا مزمل نے اس کی تائید کی، وہ محض مسکرا کر رہ گئی، یہاں سے روانگی کے وقت اس کا دل بے حد اداس ہو جایا کرتا تھا۔

''آپ کے بھائی مذاق کر رہے ہیں چندا آپ کو معلوم تو ہے۔'' اس نے دونوں کو پچکارا، اس کی نظر چراغوں کی لو پہ تھی اور عاشر کی اس پہ، اب وہ سب لطائف سنا کر ہنسنے ہنسانے میں مشغول تھے۔

آسمان پہ ستاروں بھر رات مسکرا رہی تھی، چودھویں کا مکمل روشن چاند ان کے لان میں جھکا اپنی چاندنی لٹا رہا تھا، سب کی چاندنی میں ہولے سے چلتی ہوا ننھے منے چراغوں کی ضیا سے چھیڑ خانی کرتی تو کبھی آم، آلو بخارا، فالسہ اور لیموں کے پھلوں سے لدے پیڑوں کی بوجھل اونگھتی شاخوں کو نیند سے جگا دیتی، فضا میں موتیا، گلاب، چنبیلی اور لیموں کی ملی جلی مہک بے حد دلفریب لگ رہی تھی۔

تیری نظر پہ میری نظر ہے
دل میں ہے کیا تیرے مجھ کو خبر ہے

احمر کے ایکدم سے کھنکھارنے اور معنی خیز انداز میں گنگنانے سے وہ سٹپٹا کر قریب کی کیاری میں لہراتے سرخ، پیازی زرد، سفید پھولوں کو دیکھنے لگا۔

گھر سے نکلی تو خبر بن جائے گی آپس کی بات
جو بھی قصہ ہے ابھی تک صحن کے اندر تو ہے
آسمان سبز گوں پہ اک تارا اک چاند
دسترس میں کچھ نہ ہو یہ خوشنما منظر تو ہے

عاشر کے شعر پہ عبیرہ نے بے اختیار واہ واہ کہی، جبکہ وہ احمر کو گھورنے میں محو تھا جانتا تھا وہ پیٹ کا ہلکا ہے اور مسلسل اس کو نشانے پہ رکھے ہوئے ہے۔

احمر کے بلند و بانگ قہقہے پہ وہ سب ہونق سے اسے دیکھتے رہے۔

''بھائی یہ تو چیٹنگ ہے آپ ہمیں بھی وہ لطیفہ سنائیں جس پہ آپ اتنا ہنس رہے ہیں۔'' مزمل اور آفاق نے صدائے احتجاج بلند کیا۔

''نہیں وہ بھائی نے شعر بے حد چبا چبا کر سنایا اس لئے۔'' وہ پھر سے لوٹ پھوٹ ہونے لگا۔

''احمر! آج تم سچ میں ماشاء اللہ بے حد خوش لگ رہے ہو، میرے جانے پہ واقعی میں اتنے خوش ہو، میں اب نہیں آؤں گی، ٹھیک ہے۔'' اب کے وہ قدرے برا منا گئی کب سے اسے عاشر بھائی کے ساتھ اشارے، سرگوشیاں کرتے اور ہنستے دیکھ رہی تھی، اس کے اندر بے حد اداسی اتر آئی۔

''حاضرین کرام اور جلی کٹی خاتون۔'' اس کے طرز تخاطب پہ اس نے بے اختیار دانت کچکچائے جبکہ باقی سب ہنس دیئے۔

''میری بات غور سے دل تھام کر سنیئے اگر چہ یہ بات آپ سب کے گوش گزار کرنے پہ مجھے جان سے گزرنے کا خطرہ لاحق ہے مگر آپ

کی خاطر یہ رسک لے رہا ہوں۔'' اس نے بے حد شوخ و شنگ نگاہوں سے عاشر کی گھوریوں کو خاطر میں لاتے ہوئے مصنوعی خوفزدہ انداز میں بیان دیا۔

چلتی ہوائیں ساکن ہو گئیں، رات کے دوسرے پہر کا ماہتاب تجسس سے لان میں اتر آیا تھا، لان میں اونگھتے شجر و پودے چونک کر دم سادھے منتظر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

''عاشر بھائی کا رشتہ ہاہاہا، یہ اوئی ہاہا پکا ہو گیا ہے۔'' بالآخر اس نے بلی تھیلے سے باہر نکال دی، یہ اور بات کہ اس دوران عاشر نے اچک کر اس پہ حملہ کر دیا تھا اور اس کا منہ بند کرنے کی اپنی سی کوشش کی تھیں مگر وہ اپنے نام کا ایک تھا اپنی بات بے تحاشا قہقہوں اور مار کھانے کے دوران کراہتے ہوئے پوری کر کے دم لیا۔

''واہ مزا آ گیا، بہت مبارک ہو عاشر بھائی، آج تو آپ نے دل خوش کر دیا، واہ جی واہ۔'' وہ سب حیرت و خوشی کے ملے جلے تاثرات سے عاشر کو دیکھ رہے تھے، سب سے پہلے عبیرہ نے لب کشائی کی۔

چاند ہولے سے ہنس دیا، ہوائیں، پھول، ستارے سرگوشیوں میں مگن ہو گئے، چاندنی ان کے درمیان ٹھہر کر گیت سنانے لگی، شب کے دوسرے پہر درختوں کے پتے چاندنی کے گیت پر رقص کناں ہو گئے۔

''لو جی اس میں شرمانے والی کون سی بات ہے، آپ نے تو لڑکیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔'' اس نے عاشر کو جھینپتے دیکھ کر ریکارڈ لگایا اور ہنسنے لگی۔

''بھائی ہماری ہونے والی بھابھی کون ہیں بتایئے؟'' آفاق، مزمل، اشتیاق سے اس کے سر ہوئے عبیرہ نے بھی سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

جواباً عاشر ٹمٹماتے چراغوں میں کچھ تلاشنے لگا اور احمر نے قہقہہ لگا کر ان پہ بم پھوڑا۔

''یہ ہمارے درمیان جو عبیرہ صاحبہ تشریف فرما ہیں یہ ہی وہ ہستی ہیں۔''

سب خوشگوار تحیر میں مبتلا جھوم اٹھے، اس دوران عاشر چپل گھسیٹ کر احمر کو مار چکا تھا لیکن وہ ڈاج دے گیا اور وہاں سے فرار ہو گیا جاتے جاتے آفاق و مزمل کو اشارے سے اٹھا کر ساتھ لے گیا تھا۔

ان کے درمیان دلکش سی چاندنی رنگ برنگ پھولوں اور جلتے دیئوں میں ہار سنگھار کے پھولوں سے لدے درخت کے نیچے مسکراتی معنی خیز خاموشی آ کر بیٹھ گئی۔

وہ کتنی دیر بے یقینی سے ساکت بیٹھی رہی اور جب عاشر کی آنکھوں میں لو دیتے جذبوں نے یقین کا سر اٹھایا تو بے ساختہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک اٹھی۔

''عبیرہ کیا ہوا؟'' وہ بوکھلا کر گھٹنوں کے بل آگے کھسک آیا، چاندنی میں اس کی سنائی دیتی سسکیوں میں بے حد چپکے سے خاموشی ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔

''عبیرہ!'' اسے سمجھ میں نہ آیا کیسے چپ کرائے، وہ مضطرب سا ساری صورتحال جاننے کی سعی میں تھا۔

اس نے اپنا ہاتھ اس کے سر کی جانب بڑھایا مگر پھر واپس کھینچ لیا۔

جب محض کزن تھی تو اور بات تھی اب یہ بالکل مناسب نہیں تھا ایک عجیب سی جھجک مانع ہو گئی تھی اور وہ بھی اس صورت میں جب وہ اس کو نئے تعلق کے حوالے سے قبول کرنے کو تیار نہیں تھی۔

اس نے ہنوز سابقہ انداز میں روتی بہاروں

جیسی لڑکی کو بے بسی سے دیکھا اور ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

''دیکھو ابھی صرف ماما نے فون پہ ممانی جان سے زبانی کلامی بات طے کی ہے، میں مانتا ہوں ماموں جان و ممانی کو بنا تم سے رضامندی لئے ہاں نہیں کرنی چاہیے تھی، لیکن اب بھی دیر نہیں ہوئی تم خوش نہیں ہو تو میں ماما کو منع کر دوں گا، بے فکر رہو اس سب معاملے میں تمہارا نام نہیں آئے گا، میں ہمیشہ تمہیں ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اس کی طویل بات کے دوران ہچکیاں لیتا وجود ساکن ہوا تھا اور اسے ہر لحاظ سے پرسکون کرنے کے لئے اس نے لمحوں کے اندر فیصلہ سنا دیا تھا۔

عبیرہ نے ایک جھٹکے سے چہرہ اونچا کیا، آنسوؤں سے تر بتر چاندنی میں بھیگا جاذب نظر چہرہ لمحہ بھر سے زیادہ دیکھا نہیں گیا، وہ اٹھ کھڑا ہوا، وہ اس کی خوشی میں خوش تھا، اس کے آنسوؤں نے طبیعت میں عجیب سی بے چینی و بوجھل پن انڈیل دیا تھا، وہ اس چہرے کو تا زندگی سدا مسکراتا دیکھنے کا متمنی تھا۔

''عاشر بھائی!'' عبیرہ نے عجلت میں اسے پکارا اس کی پکار میں عجب سی کسک تھی جو عاشر کے علاوہ چاندنی، ستاروں اور ہواؤں نے بھی سنی۔

وہ یکدم پلٹا تھا مگر نظر اس پہ ڈالنے کی غلطی نہ کی۔

''بس اتنا ہی جانتے ہیں مجھے، اتنا ہی سمجھا ہے۔'' اس کی رندھی آواز میں شکوے بول رہے تھے، وہ دم بخود رہ گیا۔

مخمل فلک سے کتنے ہی ستارے لان میں جھکے بغور انہیں دیکھنے لگے، چاند ٹھٹک کر رہ گیا۔

''میں ایسی ویسی لڑکی ہرگز نہیں ہوں جس نے کسی کے ساتھ کے سپنے دیکھے ہوں اور ان کے ٹوٹنے پر رونے لگی، میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو بہت سینت سینت کر رکھا ہے، میں نے کبھی کسی کے بارے میں سوچا تک نہیں اور آپ نے مجھے کیا سمجھ لیا عاشر بھائی۔'' وہ بے حد خفا انداز میں بھیگی آواز کے ساتھ اس سے مخاطب تھی آخری جملہ کی ادائیگی کے دوران پھر سے پھپھک کر رو دی۔

''آیم سوری، میرا وہ مطلب......'' عبیرہ کے لہجے اور آنکھوں سے سچائی چھلک رہی تھی، وہ ہرگز جھوٹ نہیں بول رہی تھی اس پہ گھڑوں پانی پڑ گیا، متاسف انداز میں وہ مارے ندامت کے جملہ مکمل نہیں کر پایا۔

''دیکھو تم مجھے کھل کر پوری بات بتاؤ، یہ بن بادل برسات کیوں آخر؟'' چند لمحے وہ بے بسی سے اسے سوں سوں کرتے دیکھتا رہا پھر پینٹ کی جیب سے اپنا رومال اس کی نذر کرتے قدرے سنبھل کر گویا ہوا، وہ بے حد الجھن کا شکار ہو رہا تھا۔

''وہ عاشر بھائی میں نے زندگی میں کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ بہت پہلے کر لیا تھا، عاشر بھائی ارحم پھپھا نے جو زخم پھپھو جانی کو دیئے اس کے بعد مجھے شادی سے سخت نفرت ہو گئی محبت پہ سے بھروسہ اٹھ گیا عاشر بھائی مجھے بہت ڈر لگتا ہے شادی سے مرد بڑے ہرجائی ہوتے ہیں عاشر بھائی اسی لئے اس قدر اچانک سے احمر کی دی گئی خبر نے میرے حواس مختل کر دیئے۔'' اس کے دیئے گئے رومال سے اپنے آنسو اور بہتی ناک بار بار رگڑتی، بھیگے لہجے میں وضاحت دیتی اس پیاری سی لڑکی کی بات پہ عاشر سن ہو گیا، چاند فوراً بادل کی اوٹ میں چھپ گیا تھا، ہوائیں بیقراری سے بہت سے دیئے بجھا کر درختوں کی شاخوں میں پناہ ڈھونڈنے لگیں، چاندنی کے پاؤں

سمیٹ لینے سے یکلخت اندھیرا چھا گیا تھا جسے گھر کے قدرے فاصلے پہ واقع اندرونی رہائشی حصہ سے آتی دودھیا مدھم روشنی اپنے اندر سمونے کی ناکام جستجو میں مگن تھی۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بظاہر شوخ و لاپرواہ یہ نازک سی لڑکی اپنی ذات کی گہرائیوں میں ان کے درد چھپائے زمانے کے رشتوں سے اس حد تک خوفزدہ ہے، اس نہج تک جا سکتی ہے۔

''بے وفائی مرد یا عورت سے مشروط نہیں ہوتی، یہ انسانی فطرت پہ منحصر ہوتی ہے، بارش کا قطرہ سیپ اور سانپ دونوں کے منہ میں گرتا ہے سیپ اسے اپنے من میں چھپا کر موتی کی صورت دیتی ہے جبکہ سانپ کے اندر وہ زہر کا روپ اختیار کرتا ہے، جس کا جیسا ظرف ویسی اس کی تخلیق۔''

لمحہ بھر کے توقف سے اس نے اس کی سوچ مثبت رخ پہ گامزن کرنے کے لئے بے اختیار طویل لیکچر دے ڈالا، یہ پلکیں جھپکائے اسے دیکھے گئی، بادل کی اوٹ سے اسی پل چاند طمانیت سے مسکرایا ان کے وجود ٹھنڈی چاندنی میں نہا گئے۔

''میں تمہیں اس رشتہ کے لئے فورس نہیں کر رہا، میں تو یوں بھی اک ہرجائی شخص کی اولاد ہوں، میں قطعاً تمہارے بھروسہ کے قابل نہیں، دعا ہے تمہیں جیون میں اتنا چاہنے والا ہمسفر ملے جو تمہارے دل سے ہر خوف و وہم دور کر دے، اللہ کریم تمہارے نصیب بہت اچھے کرے۔'' اس نے خلوص دل سے اسے دعاؤں سے نوازا اور اس پہ اک آخری نگاہ ڈال کر قدم موڑ لئے، دل میں چپکے سے درد کے پنچھی اتر آئے تھے، یہ طے تھا کہ ان پنچھیوں کو اک دن اڑ جانا ہے کیونکہ وہ نصیب پہ شاکر تھا اس کے لئے بھی اللہ نے کسی نہ کسی کو منتخب کیا ہو گا جو مقررہ وقت پہ اسے نعمت کی صورت آن ملتی۔

''عاشر بھائی آپ میری نیک و صابر پھپھو جانی کی اولاد ہیں ماما، پاپا اولاد کے لئے کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کرتے، اس گمان میں مت رہیے کہ آپ میرے بھروسہ کے قابل نہیں، بلکہ شاید آپ کے سوا میں دنیا میں کسی مرد پہ اعتبار نہ کر سکوں۔''

اس کی بات پہ اس کے قدم ٹھہر گئے تھے اور وہ تحیر سے یکلخت مڑا تھا یہ لڑکی اسے جھٹکے پہ جھٹکا دینے پہ تلی ہوئی تھی۔

''وہ کیوں؟'' بے اختیار اس کی زبان پھسلی تھی۔

''کیونکہ عاشر بھائی جو خود چوٹ کھائے ہوئے ہوتے ہیں وہ دوسروں کو کبھی زخم نہیں دیتے عاشر بھائی۔'' اس کے روانی و صاف گوئی سے اپنی رضامندی کا عندیہ سنانے پہ عاشر نے سر تھام لیا اور وہیں گھاس پہ دھم سے گر پڑا۔

''کک...... کیا ہوا؟'' وہ بوکھلا کر قدرے جھکی اور بھیگی پلکیں اس کے منہ سے بگڑے زاویوں پہ ٹکا دیں۔

''یار اب تو بھائی مت کہو، یہاں لگتا ہے جا کر۔'' اس نے دل کے مقام پہ ہاتھ رکھ کر وضاحت دی جبکہ لہجہ و آنکھوں میں شریر سی شوخی بھری ہوئی تھی وہ فوراً جھینپ کر پیچھے ہٹی۔

''ہاں ہاں اب بھائی مت کہنا کبھی۔''

تینوں شیطان ڈرائنگ روم کی لان میں سمت کھلنے والی کھڑکی سے اوپر نیچے چہرے کیے کورس میں چلائے تھے۔

''اُف اللہ۔'' اسے ایکدم سے ڈھیروں ڈھیر شرم آ گئی، عاشر چونک کر چپل لئے کھڑکی کی جانب لپکا مگر وہ سیکنڈ کے ہزارویں حصہ میں بند ہو گئی، وہ خجل سا سر کھجاتا مڑا اور اسے دیکھ کر

اچانک سے بے تحاشا ہنسنے لگا، جبکہ وہ بجلی کی سی پھرتی سے شرم سے دہکتے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپائے اندر بھاگ گئی۔

☆☆☆

بعد مدت اسے دیکھا لوگو
وہ ذرا بھی نہیں بدلا لوگو
خوش نہ تھا مجھ سے بچھڑ کر وہ بھی
اس کے چہرے پہ لکھا تھا لوگو
دوست تو خیر کوئی کس کا ہے
اس نے دشمن بھی نہ سمجھا لوگو
پیاس صحراؤں کی پھر تیز ہوئی
ابر پھر ٹوٹ کے برسا لوگو
اس کی آنکھیں بھی کہے دیتی تھیں
رات بھر وہ بھی نہ سویا لوگو

ارحم کی پیاسی نگاہیں بے تابی سے ان کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں، سنہری فریم کے سفید شیشوں والے چشمے کی اوٹ سے دکھائی دیتی یہ صورت انہیں بصارت کا دھوکہ محسوس ہوئی وہ بھلا ان تک رسائی کیوں حاصل کرنا چاہے گا اس کی زندگی میں ان لوگوں کی کیا وقعت۔

اتوار کا دن معمول کے مطابق تھا، سورج مقررہ وقت پہ مشرق کی اوٹ سے ابھرا تھا روز کی طرح صبح مصلّے پہ رتجگوں کے عذاب سے نجات اور نئے دن کی مسافت کے لئے ہمت طلب کی، وہی گھریلو، مصروفیات اور بچوں و دادی کی نوک جھونک ماحول کو خوشگوار بنانے کی سعی، وہی معمول کے انداز میں گرما کی پرحدت دوپہر ڈھل رہی تھی، وہ عصر کی نماز پڑھ کر ابھی فارغ ہوئی تھیں۔

جبکہ چاروں بچے قریبی مسجد میں نماز کی ادائیگی کے لئے گئے ہوئے تھے، چلتی لو کی کارستانیاں بھی وہی تھیں، کملائے ہوئے اشجار خاموش و جامد تھے، نہ کوئی آندھی اٹھی تھی نہ طوفان کے آثار تھے نہ ہواؤں کا رخ بدلا تھا پھر وہ کیونکر مان لیتیں کہ سامنے دکھائی دیتا عکس اک حقیقت ہے۔

ڈور بیل کی آواز محض سماعتوں کا وہم اور یہ وجود التباس نظر، نگاہوں کے دھوکہ کے سوا کچھ نہ تھا، انہوں نے کتنی دیر سے دم سادھے اس سراب کو پلکیں جھپک کر مٹانے کی سعی کی پھر کھٹ سے دروازہ بند کرنے ہی کو تھیں کہ مقابل نے پاؤں دروازے کے بیچوں بیچ پھنسا کر ان کے ارادے کو ناکام بنا دیا، وہ جیسے کسی خواب سے جاگی تھیں۔

''پلیز ایک بار میری بات سن لو۔'' التجائیہ انداز و شکست خوردہ آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تھی، اسے ان کا ٹھکانہ کیونکر معلوم ہوا یہ سب سوال بحث تھے، وہ جانتی تھیں دنیا گول ہے۔

''کس ناطے کس رشتے کے تحت آپ کی بات سنوں اب راکھ میں کوئی چنگاری باقی نہیں رہی جسے کریدنے آپ چلے آئے، خدارا یہاں سے چلے جائیے ہم لوگوں کی پرسکون جھیل جیسی زندگی میں کنکر پھینک کر ارتعاش پیدا مت کیجئے۔'' سرد مہری سے بے تاثر انداز میں وہ گویا ہوئیں ہوا کے پرحدت تھپیڑوں نے یکایک درختوں کی شاخوں سے ڈھیروں پتے گھاس کے اوپر گرائے تھے۔

''اس جذبے کے تحت میری بات سن لو، جس کے ساتھ تم نے ہاسپٹل میں میری مدد کی، خواہ وہ انسانیت کا ہی کیوں نہ ہو۔'' اس کی کہی بات نے ان کو بے بس کر دیا، جو بات اپنے تئیں وہ سب سے اور خود سے چھپائے پھرتی تھیں وہی اس کو معلوم ہو گئی۔

انہوں نے خاموشی سے ایک جانب ہو کر اس کے لئے راستہ بنایا۔

''امی ہیں نہ تمہارے پاس؟'' اندر آ کر یہ سوال کرتے ہوئے اس کی آواز میں واضح طور پہ لرزش اتر آئی اور ان کے اثبات میں سر ہلانے پہ گویا اس کے مردہ تن میں جان آ گئی۔

وہ اکیلا نہیں آیا تھا یہاں اس کے ساتھ کوئی اور وجود بھی تھا جو اتنی دیر سے اس کی اوٹ میں ہونے کے باعث نگاہوں سے اوجھل تھا، وہ شاک کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھیں، اوراک کے بہت سے در خود بخود ان کی نگاہوں کے سامنے روشن ہوتے چلے گئے۔

☆☆☆

سارا نے ارحم کی زندگی اجیرن بنا رکھی تھی، وہ انتہا درجے کی پھوہڑ، بدزبان، کاہل و خود پسند تھی، جس کا کام دن بھر آئینے کے آگے اپنے آپ کو سجانا، سنوارنا اور اپنا حسن نکھارنا تھا، کھانا ہوٹل سے تیار شدہ آتا تھا، کپڑے دھونے استری کرنے دھوبی کے ذمہ تھے، صفائی کام والی کر جایا کرتی، ارحم کو اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے لئے پکارنا پڑتا اس پہ وہ بلند آواز میں بکتی جھکتی اور گالی گلوچ اور توڑ پھوڑ پر اتر آتی یہاں تک کہ محلہ اکٹھا ہو جاتا، اسے پل پل اپنی غلطی کا احساس ہوتا اپنی جنت جیسی زندگی کا سکون یاد آتا مگر وہ اب واپس پلٹنا نہیں چاہتا تھا اس کی مردانگی کو یہ گوارا نہ تھا۔

سارا بچے کے حق میں نہیں تھی وہ اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر نے جب اس کی جان کو اس کام میں رسکی بتایا تو وہ جیسے تیسے چپ ہو گئی، اس کی نت نئی فرمائشوں نے ارحم کے ناک میں دم کر دیا تھا، وہ اس کو خوش رکھنے کی کوشش میں ہلکان ہو جاتا مگر وہ ناشکری اور مادیت پرست عورت ہمیشہ چڑ چڑی و ناراض رہتی، اس کی سونے و ہیرے کے زیورات کی آرزو میں اپنی عمر بھر کی پونجی اور جائیداد سے ہاتھ دھو کر ارحم نے اسے سر تا پا زیورات سے لاد دیا مگر اس کی ہوس کا کنواں پھر بھی نہیں بھرتا تھا۔

بچی کی پیدائش کے بعد وہ ننھی سی جان کو لاپروائی سے بھوکا پیاسا چھوڑ کر اپنے نت نئے دوستوں کے ساتھ پارٹیز میں چلی جاتی، محلے کے لوگوں سے اس کے مشکوک چال چلن کی باتیں ارحم ان سنی کر دیتا تھا وہ سارا کے کردار پر اندھا یقین رکھتا تھا آفس سے آ کر بچی کو سنبھالنا بھی اس کے ذمہ تھا، ایک دن جب وہ گھر لوٹا تو بچی بستر سے نیچے گری ہوئی تھی اس کا سانس بے حد مدہم چل رہا تھا، چھ ماہ کی بچی کو کئی دن سے بخار و زکام تھا مگر بے حس ماں کی لاپراوئی نے اسے موت کے منہ تک پہنچا دیا۔

ایمر جنسی میں بروقت لے جانے سے اسے بچا لیا گیا تھا ڈاکٹر نے نمونیہ کی تشخیص کی تھی اور انتہائی نگہداشت میں رکھا تھا، سارا کا کچھ اتا پتا نہ تھا اور ایک شخص کی نشاندہی پر جب ارحم اسے ڈھونڈتا مقررہ فلیٹ پر پہنچا تو اشتعال و خفگی کے باعث بنا دستک دیئے اندر داخل ہو گیا دروازہ لاک نہیں تھا اور اندر بیڈ روم کے کھلے دروازے سے نظر آتے منظر نے ارحم کو شعلوں کی لپیٹ میں لے لیا، سارا جس حالت میں تھی، ارحم نے اسی وقت اس کو طلاق دے دی، بعد میں بچی کے عوض اسے اپنے کاوبار سے ہاتھ دھونا پڑے، وہ اپنی بچی ہرگز اس بدکردار عورت کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔

بچی کے ساتھ چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے دربدر پھرتا ٹھوکریں کھاتا رہا، بہاولپور بھیا کے

پاس گیا مگر افسوس انہوں نے اسے بری طرح دھتکار دیا، آنیہ، بچوں اور ماں کی تلاش میں وہ شہر شہر بھٹکتا رہا، پھر پتا چلنے پر کہ وہ سب لاہور میں ہے لاہور آ گیا، بچپن کا اک دوست اتفاقاً سر راہ مل گیا وہ اس شہر میں اپنے گھر لے آیا اور یہاں بہت پہلے ہی وہ بچوں کو آتے جاتے راہ میں دیکھ کر روتا رہتا تھا، ان لوگوں کا سامنا کرنے معافی مانگنے کا حوصلہ خود میں نہیں پاتا تھا، لیکن بنا ضمیر کی خلش کو کم کیے اور بچی کو محفوظ ہاتھوں میں سونپے وہ مرنا نہیں چاہتا تھا تبھی ہوسپٹل میں دوا لینے گیا مگر ڈاکٹر نے طبیعت خراب ہونے پر زبردستی ایڈمٹ کر لیا۔

جب اس کے دوست کو اطلاع ہوئی تو وہ ہسپتال آتے جاتے رہے اور شکوہ کیا کہ اپنی بیماری ''ٹی بی'' کے متعلق آگاہ کیوں نہیں کیا، ارحم کے مالی حالات بے حد برے تھے، وہ اپنے دوست کے ہسپتال کے اخراجات اٹھانے پر مشکور تھا اور اس رقم کو قرض کے طور پر لوٹانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

لیکن جب انہوں نے اس بابت لاعلمی کا اظہار کیا اور ڈاکٹر صاحب سے استفسار کرنے پر تمام واقعہ کا علم ہوا اور آنیہ کے دستخط دیکھ کر کسی شبے کی گنجائش نہیں رہی تو وہ ہسپتال سے زبردستی ڈسچارج ہو کر ندامت کے سمندر میں غرق اس کے روبرو چلے آئے، ان سب سے اپنی غلطیوں کی معافی طلب کرنے کا حوصلہ ان کے اندر آنیہ کے انسانیت پرور سلوک کی بدولت آیا۔

اپنی روداد انہوں نے روتے کھانستے سسکیوں کے دوران امی کے قدموں پر سر رکھے بیان کی، امی صوفے پر براجمان تھیں وہ کارپٹ پر ان کے قدموں میں ڈھے گئے تھے، ارحم پر نگاہ پڑتے ہی انہوں نے نفرت سے رخ موڑا تھا مگر انہوں نے زبردستی ان کے پاؤں روتے ہوئے جکڑ لئے، اپنے لخت جگر سے لاکھ نفرت سہی لیکن اس کو اس حالت میں دیکھ کر ان پر جو قیامت گزری وہ صرف ایک ماں کا دل ہی جان سکتا ہے، یہ وہ صحت مند زندگی سے بھرپور ارحم نہیں تھا یہ تو نحیف و کمزور ملگجے حلیے میں ہڈیوں کا کوئی ڈھانچہ سا تھا کھچڑی کلر کی داڑھی و سر کے بال، وہ اپنی عمر سے کئی گنا آگے کھڑا تھا۔

لیکن جو کچھ وہ کر چکا تھا اس کے بعد وہ کسی رحم، کسی ہمدردی یا معافی کا ہرگز مستحق نہیں تھا، انہوں نے محبت کو نفرت کے لبادے میں لپیٹ کر پاؤں کھینچ لئے۔

''کم بخت، ناخلف اولاد، دفع ہو جا، کیا لینے آیا ہے یہاں، اپنی غرض کو آ گیا بڑھاپے میں اولاد اور بیوں کا سہارا لینے، منحوس ہم تیری شکل تک نہیں دیکھنا چاہتے۔''

''میں نے کہا تھا ناں اچھی بیوی نعمت ہوتی ہے تو نے اللہ کی نعمت کی ناشکری کی، اللہ نے تجھے خاک میں ملا دیا، اس بچی آنیہ کا صبر پڑا ہے تجھ پر کم بخت مارے، اپنی بچی پکڑ اور نو دو گیارہ ہو جا چل۔'' عالیہ بیگم کے منہ میں جو آیا وہ بکے گئیں، جبکہ وہ گم صم بیٹھی سوچوں میں گم رہیں۔

''میں تمہارا مجرم ہوں، آنیہ تم جو چاہے سزا دے لو، لیکن مجھے معافی دے دو ضمیر کی چبھن مجھے چین سے جینے نہیں دیتی اور اس معصوم کو اپنا لو میں اس نیک پرورش دینا چاہتا ہوں اسے اپنے ماں باپ جیسا مت بننے دینا، اسے اپنی طرح بنانا آنیہ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔'' وہ بکھرے ہوئے ندامت سے چور لہجے میں مخاطب تھے، جبکہ خالی خالی نگاہوں سے ساکن بیٹھی انہیں بکھرتے ملاخطہ کرتی رہیں۔

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

ہائے اس زودو پشیماں کا پشیماں ہونا

وہ بہت سارا رونا چاہتی تھیں لیکن آنسو آنکھ میں آنے سے انکاری ہو گئے، کھلی کھڑکی سے جھانکتے ہوا کے جھونکے پتوں کی گود میں سر رکھے بین کرنے لگے، فضا بے حد بوجھل ہو گئی تھی۔

ان کی نگاہوں میں ماضی کے تمام منظر تیزی سے گزرنے لگے اور سماعتوں میں ارحم کے کہے مختلف جملوں کی بازگشت گونجنے لگی۔

''یہ میری وائف ہے۔''

''آنیہ پہلے جیسی خوبصورت نہیں رہی۔''

''مجھے یہ گھر ابھی خالی چاہیے، ڈھیٹ عورت پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔'' آنیہ اور بچوں کے ہراساں چہرے آہیں، منتیں، دسمبر کی بھیگی شام، برفانی رات کی اذیت، برسوں کے رتجگوں کے عذاب، ارحم کے بیگانے انداز کے کچوکے۔

''نہیں۔'' سماعتوں میں بڑھتے بتدریج شور آہ و بکا سے گھبرا کر یکلخت وہ چلا اٹھیں اور گہرے گہرے سانس بھرنے لگیں۔

''نہیں۔'' اب کی بار مدہم آواز میں خود کلامی کی، سارے منظر سب آوازیں نظروں سے اوجھل ہو گئیں، آنکھ سے بے اختیار پانی کے چشمے پھوٹ پڑے۔

بھول جائیں تو آج بہتر ہے
سلسلے قرب کے جدائی کے
بجھ چکیں خواہشوں کی قندیلیں
لٹ چکے شہر شناسائی کے
رائیگاں ساعتوں سے کیا لینا
زخم ہوں، پھول ہوں ستارے ہوں
جس نے جیسے بھی دن گزارے ہوں
اب نہیں ہیں اگر گلے تھے کبھی
بھول جائیں ہم ملے تھے کبھی
بھول جائیں جو ہوا، سو ہوا

اکثر اوقات بہت چاہنے پر بھی
فاصلوں میں کمی نہیں ہوتی
بعض اوقات بہت چاہنے والوں کی
واپسی سے خوشی نہیں ہوتی

ارحم پشیمان سا سر جھکائے آنسو بہانے لگا، ننھی حمنہ آنیہ کا دامن تھامے انہیں متوجہ کرنے کی خواہش میں ناسمجھی سے انہیں دیکھتی رہی، اس دن سب کا اس کی جانب متوجہ ہونا، اس کا سب بچوں کی جانب کشش محسوس کرنا بے معنی نہیں تھا، بس وہ سمجھ نہیں پائیں دیکھا جائے تو وہ ہو بہو ارحم اور عاشر کے نقوش چرا لائی تھی، عالیہ بیگم وقفہ وقفہ سے اس کے لتے لے رہی تھیں۔

''بے غیرت، بے شرم تیری بدولت اتنے دکھ، اتنی رسوائی جھیلنی پڑی۔''

''آپ کس رحم کے مستحق نہیں، جب میری ماں بیمار تھی تب کیا تھا رحم آپ نے، بہت روکھے انداز میں اپنی ہر ذمہ داری سے بری الذمہ ہو گئے تھے اور اس رات جیسے میری ماما کو بخار میں پھنکتی حالت میں گھر بدر کیا، آپ بھول سکتے ہیں ہم سب نہیں۔'' وہ چاروں نجانے کب سے سکتے کے عالم میں ارحم کی روداد اور تمام کاروائی ملاحظہ کر چکے تھے، مزمل اور آفاق بس ٹکر ٹکر باپ کو دیکھے جا رہے تھے، جبکہ عاشر، احمر نفرت واشتعال سے بپتے زخم کریدنے پر کسی رعایت برتنے کے موڈ میں نہیں تھے۔

''عاشر چپ ہو جاؤ۔'' ماما نے تنبیہ کی۔

''ماما یہ کسی سے مخلص نہیں ہو سکتے، اپنی ماں، بیوی اولاد انہیں کسی سے پیار نہیں تھا۔'' احمر کے تلخ لہجہ پر آنیہ نے اسے ٹوکا، اس کے بچوں نے کبھی کسی سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی اور آج ہر لحاظ بالائے طاق رکھے ماں اور دادی کے سامنے باپ کو آنکھیں دکھا رہے تھے، دونوں

چھوٹے اپنے بھائیوں سے بالکل متفق تھے۔

''ان کی عیاشیوں کی بدولت ہم نے لوگوں کی کیسی کیسی باتیں......'' عاشر اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا ماما کا لگایا گیا تھپڑ اس کی زبان گنگ کرنے کو کافی تھا۔

''یہ سکھایا ہے میں نے تم لوگوں کو۔'' وہ نجانے کیا کچھ کہتی انہیں ڈپٹنے لگی، جبکہ ارحم کھانسنے میں محو رہے۔

''ارحم جو تو کر چکا ہے تجھے اللہ بھی معاف نہیں کرے گا، رب حقوق اللہ تو معاف کر سکتا ہے لیکن حقوق العباد تب تک معاف نہیں کرتا جب تک بندہ خود معاف نہ کر دے۔'' دادی کا لیکچر جاری تھا، ان کا سر کچھ اور جھک گیا۔

''آنیہ اسے گھر سے نکال دو، جیسے برسوں پہلے اس نے تمہیں ہر تعلق توڑ کر نکالا تھا۔''

''امی! انہیں اپنی غلطیوں پر پچھتاوا ہے رب اپنے بندوں کو توبہ کرنے پر بخش دیتا ہے اور معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے آپ لوگ انہیں معاف کر دیجئے۔'' ان کی بات پر امی بمشکل رضامند ہو گئیں، بچے سر جھکائے ماں کے فیصلے کے ادب میں خاموش رہے، آنیہ کو اپنی تربیت پر بھروسہ تھا اور یقین تھا کہ اللہ اس کا بھروسہ نہیں توڑے گا۔

''تم بے حد عظیم ہو آنیہ۔'' ارحم کھانسی کے دوران پھولی سانسوں سمیت گویا ہوئے۔

آنیہ نے آگے بڑھ کر حمنہ کو دل کی سچائیوں سے بانہوں میں لے کر سینے سے لگا لیا، یہ معصوم تو بے قصور تھی اس کا کیا جرم تھا جو رویوں کی تلخیاں سہے۔

''میری بیٹی کی آرزو اللہ نے پوری کر دی۔'' وہ سب سے مسکرا کر مخاطب ہوئی۔

''مطلب تم نے صدق دل سے مجھے معاف کر دیا۔'' ارحم کے استفسار پر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہو گئیں۔

''معاف کرنے کا مطلب ہے کسی بات کو یوں بھلا دینا جیسے وہ کبھی رونما نہ ہوئی ہو، ارحم میں وہ سب بھول نہیں سکتی مگر اللہ کی خاطر میں آپ کو معاف کرتی ہوں۔'' شب کے اندھیرے ہر شے کو اپنے حصار میں لئے ان دیکھی حکایتیں بیان کرنے میں مگن تھے، معمول کے کام نمٹا کر وہ کمرے میں چلی آئیں، ہواؤں نے دور تک ان کے قدم چومے تھے۔

''آنیہ! مجھے نیند نہیں آتی مجھے بالوں میں انگلیاں پھیر کے سلاؤ ناں جیسے تم پہلے کیا کرتی تھیں۔'' وہ ننھی حمنہ کو سلا کر انہیں دوا دے کر پلٹنے لگیں تو ارحم کی آواز نے ان کے قدم جکڑ لئے۔

وہ بتدریج صحت یاب ہو رہے تھے ڈاکٹرز نے بہت امید دلائی تھی، وہ خاموشی سے ان کے حکم کی تعمیل میں لگ گئیں۔

''برسوں سے رتجگوں نے سونے نہیں دیا، اب سکون محسوس ہو رہا ہے۔'' انہیں آج بھی صرف اپنے رتجگوں کی پرواہ تھی ان کی شبوں کے دکھ کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات اچھی ہے میرے ہرجائی کی

ان کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی، وہ گہری نیند سو چکے تھے، رات دھیرے سے بھیگنے لگی، انہوں نے کھلی کھڑکی سے نظر آتے سیاہ آسمان تلے شور مچاتی ہوا کو اک نظر دیکھا اور دھیرے سے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

رمشا احمد

''اُف نہ جانے ابھی کتنا سفر باقی ہے۔''
خوشان نے رات کی تاریکی اوڑھے خاموش تیزی سے گزرتے مناظر پر سے نظر ہٹا کر کوچ کے اندر کے ماحول پر اپنی توجہ کی، ملگجی سی روشنی میں سیٹوں کی پشت سے ٹیک لگائے، گھٹنوں میں سر رکھے یا پھر سیٹ پر سمٹ کر لیٹی لڑکیاں، سب کی سب خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھیں اور لائبہ شاہ بھی خوشان صدیقی کے کاندھے پر سر رکھے آرام کر رہی تھی، خوشان پہلی مرتبہ اتنے لمبے سفر میں اپنی فیملی کے بغیر اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کر رہی تھی۔

خوشان اور لائبہ کی دوستی گو بہت گہری تھی اور چونکہ دونوں کے گھر بھی قریب قریب تھے اس لئے ان کی دوستی کا الگ ہی رنگ تھا، پڑوسی ہونے کی وجہ سے دونوں گھرانوں کے تعلقات بہت خوشگوار اور دوستانہ تھے، اسی لئے تو لائبہ شاہ کی امی نے اظہر بھائی کی منگنی ہوتے ہی خوشان کی ممی کو باور کروا دیا تھا کہ اظہر بھائی کی بارات کے ساتھ وہ لوگ بھی ضرور جائیں گے، جو کہ ملتان جانی تھی، مگر ادھر اظہر بھائی کی شادی کے

ناولٹ

فنکشن شروع ہوئے ادھر مما کی طبیعت خراب رہنے لگی، مگر مما نے خوشان کو جانے کی اجازت دے دی کہ آنٹی ناراض نہ ہوں، پھر خوشان بھی لائبہ کے خاندان والوں سے بہت حد تک واقف تھی اور لائبہ تو بے پناہ خوش تھی کہ خوشان ان کے ساتھ تھی۔

لائبہ شاہ خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی تھی اس لئے اسے خاندان بھر میں منفرد حیثیت حاصل تھی اور خوشان چونکہ لائبہ کی اکلوتی چہیتی سہیلی تھی اس لئے خوشان کو بھی بہت پذیرائی نصیب ہوئی تھی اور دوران گفتگو بھی صامیہ، رامیہ، شیریں، عامرہ، زنیرہ، خوشان کو

بھی شریک گفتگو کرتی رہی تھیں، مگر لائبہ شاہ کو عزیم احمد کا نام لے کر چھیڑنے کے علاوہ وہ زیادہ نہ کر سکی، حالانکہ وہ ان سب سے خاصی فری ہو گئی تھی اور اس وقت کوچ میں موجود سب کی سب یا تو باقاعدہ انگیج تھیں یا پھر در پردہ ان کی بات کسی نہ کسی کزن سے پکی تھی اور یہ بات خوشان کے لئے ایکسائٹمنٹ سے بھرپور تھی اور سب سے زیادہ بے چینی تو اسے عزیم احمد کو دیکھنے کی تھی، تصویروں کی حد تو خوشان اس سے واقف تھی اور بہت حد تک متاثر تھی کہ عزیم احمد ایم ایس سی کر رہا تھا اور خوشان حیران تھی کہ اس فیملی میں لڑکے سب کے سب ہائی کوالیفائیڈ تھے مگر لڑکیوں کی تعلیم واجبی ہی تھی، بلکہ کئی ایک تو بالکل ہی ان پڑھ ہی تھیں، مگر پھر بھی کامیاب زندگی گزار رہے تھے۔

''ارے تم جاگ رہی ہو؟'' لائبہ نے خوشان کو مندی مندی آنکھوں سے دیکھا۔

''ابھی تو کافی دیر ہے تم کچھ دیر آرام کر لو، وہاں پہنچ کر تو بالکل بھی وقت نہیں ملے گا، ویسے مزہ بھی بہت آئے گا، خاص طور پر خالہ جانی کے ہاں ویسے ہی بہت ہلا گلا ہو گا۔''

''ویسے وہ لوگ بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے۔'' لائبہ نے گویا کھلی آنکھوں سے وہ منظر بھی دیکھ ڈالا اور خوشان مسکرا کر رہ گئی۔

''چلو بھئی آ گئی منزل قریب۔'' لائبہ نے کھڑکی سے باہر کے منظر پر نگاہ دوڑاتے ہوئے خوشان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

صبح کا ہلکا ہلکا اجالا چاروں طرف پھیل رہا تھا، کوچ میں بھی بیداری کے آثار نمایاں ہو رہے تھے، مرد حضرات بھی باتوں میں مصروف تھے، لائبہ کے بابا جان سادات شاہ اور بڑے چچا شہادت شاہ دروازے سے لڑکوں کی گاڑیوں کو کھوج رہے تھے اور ڈرائیور کو راستہ بھی بتا رہے تھے، جبکہ زرمین آنٹی اور چچی صفورا اور باقی خواتین بھی لڑکیوں کو سامان سمیٹنے اور حلیے درست کرنے کی ہدایات کر رہی تھیں۔

گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور بڑے سے سفید گیٹ سے مرد و حضرات کا اژدھام نکل آیا اور وہ سب خواتین کی دعاؤں میں گیٹ پر موجود لڑکیوں سے ہاتھ ملاتی گلے ملتی گھر کے اندر آ گئیں، خالہ جانی سفر کا احوال پوچھ رہی تھیں۔

خوشان کو یہاں اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی تھی، وہ سب باتوں کے دوران کپڑے وغیرہ نکال کر ناشتے کے لئے تیار ہونے لگیں، جبکہ باقی خواتین جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر خالہ جانی کے ہمراہ کام میں مصروف ہو گئی تھیں، شاید وہ طویل سفر کرنے کی عادی تھیں اسی لئے خوشان کو اس قدر تندہی سے کام کرتی وہ حیران کر گئیں اور خوشان کو لگ رہا تھا کہ وہ ان آٹھ گھنٹوں کا سفر با پیادہ کر کے آئی ہے، مگر فریش چہروں خوشگوار باتوں اور اپنائیت و محبت سے بھرپور انداز لئے وہ سب اس کی تھکان کو کہیں غائب ہی کر گئے تھے۔

☆☆☆

''آیئے ثمرہ! یہ اسمارہ لوگ کہاں ہیں؟'' ناشتے کی طویل و عریض میز پر سجے نان، پائے گرم گرم حلوہ پوری، چنے، رس، بسکٹ باقر خانیاں، لائبہ نے گرم پوری اور چنوں سے انصاف کرتے ہوئے اپنی تایا زاد سے پوچھا۔

''اسمارہ وغیرہ رات تک تو یہیں تھیں تم لوگوں کے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی گئی ہیں، کہہ رہی تھیں دو گھنٹے تک واپسی ہو گی۔'' ثمرہ نے بھی پوری تفصیل بتا دی۔

''اور باقی لوگ تو گیٹ پر ہی آپ کی راہوں میں پلکیں بچھائے کھڑے تھے وہ بھی
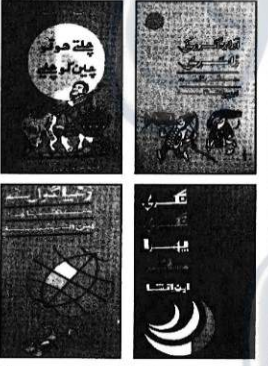
رات سے، شاید تم نے گھبراہٹ میں نوٹس نہیں لیا، آپ کا سامان جس قلی نے کمرے تک پہنچایا تھا وہ بھی لوگ ہی تھے۔'' ثمرہ نے شرارت سے کہا تو لائبہ نے صرف گھورنے پر ہی اکتفا کیا اور بات ٹالنے کے لئے بولی۔

''اور یہ سید تراب علی شاہ کہاں غائب ہیں؟ کب شرف باریابی عطا فرمائیں گے؟'' لائبہ نے مسکرا کر پوچھا اور ساتھ ہی خوشان کے ہاتھ میں گرما گرم پوری پکڑا دی۔

''وہ ان کی طرف سے آپ بے فکر رہیں، موصوف نہ صرف رشتے دار ہونے کا احساس بخوبی سرانجام دے رہے ہیں بلکہ حق دوستی بھی خوب نبھا رہے ہیں، قسم سے تراب بھائی خوب ہیں، کل سے اب تک ایک پاؤں پر کھڑے ہیں۔'' ثمرہ نے تراب کے قصیدے ہی پڑھ ڈالے، مگر لائبہ نے ہنس کر کہا۔

''کیوں اس کی دوسری ٹانگ کو کیا ہوا؟'' اور جواباً ثمرہ نے اس سے کہا۔

''ہائے لائبہ کتنی خراب ہو تم، اسمارہ کے سامنے ایسا کہا تو وہ بہت مائنڈ کرے گی۔'' لائبہ نے خوشان کو سبز چائے کا کپ پکڑایا اور کرسی پر ٹک گئی، تو صامیہ، رامیہ، شیریں بھی ان کے قریب آ گئیں اور تب پتہ چلا کہ تراب، اظہر بھائی اور سب کزنز اور دوستوں کو لے کر ہوٹل چلا گیا ہے اور وہیں سے وہ اظہر بھائی کو اور گاڑی کو تیار کر کے لائے گا، سو لڑکیوں کو بھی ناشتے سے فارغ ہوتے ہی تیار ہونے کا حکم مل گیا۔

وہ سب ایک کمرے میں دروازہ بند کیے تیاری میں مصروف تھیں، ساتھ ہی باتیں بھی ہو رہی تھیں اور چھیڑ چھاڑ بھی، کہ السلام علیکم کی زور دار آواز کے ساتھ ہی مسکراتی ہوئی اسمارہ لائبہ کے گلے میں جھول گئی۔

''ارے بدتمیز اب آ رہی ہو؟'' لائبہ نے خفگی سے اسمارہ کی کمر پر دھموکا جڑا اور ساتھ ہی اشنا کو گلے لگا کر پیار کیا اور خوشان اور باقی سب بھی ان سے ملنے لگیں۔

☆☆☆

وہ سب تیار ہو کر خالہ جانی کے خوبصورت ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے تھے، مگر ابھی تک دولہا اور ہمنواؤں کا کچھ پتہ نہ تھا، ارے بابا جان، چچا جان اور دیگر حضرات بے چینی سے کئی چکر روڈ کے لگا چکے تھے، آدھ گھنٹے پہلے صارم کا فون آیا تھا کہ بس وہ چلنے ہی والے ہیں، بابا جان کا خیال تھا کہ واپسی کا پروگرام جلد ہی ہو جائے مگر یہاں برات کی روانگی میں ہی اتنی دیر ہو رہی تھی، ایک تو بزرگ حضرات نے جلدی جلدی کا اتنا شور مچایا کہ لڑکیاں تیار ہو کر کب کی بیٹھی انتظار میں سوکھ رہی تھیں، سبھی کے موڈ خراب ہو رہے تھے، لائبہ تو سیخ پا ہو رہی تھی، اس کا کسی پر بس نہ چلا تو اسمارہ کے سر ہی ہو گئی۔

''یہ سارا کیا دھرا تمہارے اس بانگڑو بھائی کا ہے، ہمیں یہاں تیار کروا کے بٹھا دیا اور خود دولہا سمیت نہ جانے کہاں روپوش ہو گیا، ریکارڈ ہے جو کبھی ڈھنگ کا کام کیا ہو، یہ کوئی تک ہے گھنٹہ پہلے ارشاد فرمایا بس پہنچ رہے ہیں، آپ ریڈی رہیں، جب تک ہم دلہن والوں کے ہاں پہنچیں گے نان باسی پیڑیوں جیسا حال ہو جائے گا اور.....'' اس سے پہلے کہ لائبہ مزید کچھ کہتی اسمارہ بول پڑی۔

''یہ تم کیا ہر وقت بھائی جی کے خلاف ہی بولتی رہتی ہو، دولہا کو وہ ہی نہیں لے کر گئے بلکہ ساتھ وہ تمہارا عزیم بھی ہے، صارم، آفاق، شہریار، صالح سرفہرست عزیز اور مریم، مگر تمہیں تو بس نہ جانے کیا ہے؟'' اسمارہ نے خاموش ہونے میں ہی عافیت جانی، کیونکہ انکل فاروق نے سب کو گاڑیوں میں بیٹھنے کو کہہ دیا تھا۔

''لو اب کیا برات دولہا کے بغیر ہی جائے گی؟'' لائبہ نے خوشان کا ہاتھ پکڑ کر کوسٹر میں چڑھتے ہوئے کہا۔

''نہیں تراب کا فون آیا تھا، کہ وہ لوگ مین روڈ سے ہمارے ساتھ مل جائیں گے اور واقعی جونہی کوچ نے مین روڈ پر ٹرن لیا گلاب کی کلیوں اور موتیے کے پھولوں سے سجی گرے کار آگے آگے لیڈ کرنے لگی جبکہ چار یا پانچ کاریں پیچھے تھیں وہ بھی قدرے سجی ہوئی تھیں۔''

برات کے لئے قریبی پارک میں انتظام کیا گیا تھا، اس لئے فاصلے پر دولہا اور دوسرے لوگوں کو اتار لیا گیا، اب عجیب سماں تھا، آتش بازی ہو رہی تھی، ڈھول کی تھاپ پر لڑکے دھمال اور بھنگڑا ڈال رہے تھے اور گلاب کے پھول گلے میں ڈالے گولڈن کرتے پاجامے میں سر پر نہایت خوبصورت کلا سجائے اظہر بھائی بہت اچھے لگ رہے تھے جبکہ باقی سب لڑکوں نے سوٹ پہن رکھے تھے اور گلاب کی نازک کلیاں اس کی تیاری کی شان بڑھا رہی تھیں۔

برات کا استقبال بھی بہت زبردست کیا گیا تھا۔

''لو ایک تو تمہارا نکما بھائی جانے کس کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا ہے۔'' اسمارہ سے مخاطب لائبہ کی آنکھوں میں شرارت کی واضح چمک تھی، جو اسمارہ کی نظر سے پوشیدہ نہ تھی، اسی لئے وہ چڑانے والے انداز میں بولی۔

''ویسے سچ بتاؤ ناں لائبہ چکر کیا ہے؟ آخر تم ہر وقت بھائی جی کو ہی کیوں یاد کرتی ہو؟ حالانکہ وہ خاصے نکمے ہیں، کام چور ہیں اور بقول تمہارے کوئی حور پرے نہیں۔'' اسمارہ لائبہ کاری

ایکشن دیکھنے کے لئے رکی، تو لائبہ بولی۔

''دراصل بات یہ ہے کہ وہ ہے تو کام چور، نالائق بھی مگر پھر بھی کبھی کبھی کوئی کام صحیح بھی کر ہی لیتا ہے، اب جیسے اس کیمرے کو چارج کرنا ہے مگر...... ویسے تم مانو نہ مانو جب بھی اس سے کوئی کام ہوتا ہے وہ گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔'' لائبہ نے بات بدلی تو اسمارہ ایکدم ہی بھائی جی کہتی ہوئی ہجوم میں غائب ہو گئی اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کیمرہ موجود تھا۔

''آؤ بھئی دولہا کی بہن تمہاری تصویر بناؤں، ویسے بھائی جی اس طرف ہیں۔'' اسمارہ نے کہا تو لائبہ خوشان کو ابھی آئی کہہ کر اسی طرف چل دی جس طرف اسمارہ نے اشارہ کیا تھا، جبکہ اسمارہ کھٹا کھٹ سب کی تصویریں بنانے لگی، پھر وہ کیمرہ واپس بھائی جی کو ہی دے آئی کہ باقی تصویریں وہ دلہن کے آنے پر بنائیں گی۔

''ارے وہ سمرینہ وغیرہ ابھی تک نہیں آئے؟'' لائبہ نے کرسی پر آرام سے بیٹھتے ہوئے اشنا اور اسمارہ سے سوال کیا۔

''ہاں وہ ذرا لیٹ ہی آئیں گے۔'' اشناء نے مختصر سا جواب دیا۔

''چچی کا موڈ اور طبیعت کل سے ہی خراب ہے۔'' اسمارہ نے وضاحت کی۔

''خیر موڈ تو پرانی بات ہے ہاں طبیعت میں خرابی ذرا زیادہ تازہ خبر ہے۔'' یہ رامیہ تھی جو اپنی صاف گوئی کی بدولت خاصی مشہور تھی۔

نکاح ہوا تو دلہن کو سٹیج پر لا کر بٹھا دیا گیا، چونکہ مردوں اور عورتوں کے لئے الگ انتظام تھا، اس لئے فی الحال خواتین تصویریں بنا رہی تھیں۔

دلہن واقعی بہت حسین تھی، لائبہ نے خوشان کی اور باقی کزنز اور رشتہ داروں کی ڈھیروں تصویروں اور دلہن کے کئی زاویوں سے کلوز اپ لئے، چونکہ سٹیج پر بہت رش ہو گیا تھا اس لئے خوشان ایک طرف کھڑی ہو گئی کہ سامنے کی طرف موجود مسٹرڈ سوٹ میں ملبوس شخص پر اس کی نظر پڑی جو بے چینی و اضطراب کی سی کیفیت سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ میں تھامے کیمرے کو الٹ پلٹ رہا تھا۔

''اسمارہ...... اسمارہ۔'' خوشان نے لڑکیوں کے جھمگٹے میں اسمارہ کو آواز دی، وہ بمشکل باہر آئی۔

''جی کیا ہوا؟'' نہایت مودب لہجے میں اسمارہ نے پوچھا تو وہ جلدی سے بولی۔

''وہ شاید تمہارے بھائی تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔'' خوشان نے اسی طرف اشارہ کیا تو اسمارہ ''شکریہ'' کہتی چل پڑی۔

پھر اظہر بھائی کو بھی دلہن کے ساتھ ہی بٹھا دیا گیا، لائبہ کافی دیر بعد ہجوم میں سے برآمد ہوئی تھی اس لئے ایکدم ہی کرسی پر گر گئی۔

''لو بھئی آ گئے لوگ۔'' لائبہ نے اپنا دوپٹہ درست کرتے ہوئے مسکرا کر خوشان سے کہا تو وہ ناسمجھ آنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی، کہ وہ سامنے سے آنے والی سے خوشدلی سے ہاتھ ملا رہی تھی جس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا، بلکہ اخلاق بھی ندارد تھی۔

''ارے خوشان ادھر آؤ ناں ان سے ملو یہ ہیں اسمارہ کی چچا زاد سمرینہ اور سمرینہ یہ ہے میری بہت ہی پیاری دوست خوشان، خوشان صدیقی۔'' اور خوشان نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ سمرینہ کے ہاتھوں میں دیا تو تب بھی وہی سرد مہری جسے خوشان محسوس کیے بنا نہ رہ سکی، جبکہ اسمارہ کی چچی اور ان کی چھوٹی بیٹی سفینہ قدرے بہتر طریقے سے ملی تھیں۔

''لائبہ یہ سمرینہ کا بی ہیو کچھ عجیب سا نہیں ہے؟'' خوشان تو اس کے سپاٹ انداز پر اٹک ہی گئی تھی، لائبہ سے کہنے لگی۔

''نہیں تو ٹھیک ہی ہے۔'' لائبہ کا انداز ٹالنے والا تھا جبکہ خوشان کی نظر بالکل ہی سامنے بیٹھی سمرینہ پر تھیں، جو اشناء سے باتوں میں محو تھی اور مسکرا بھی رہی تھی، مگر اس کی مسکراہٹ میں نرمی نہیں تھی۔

اچانک ہی موسم ابر آلود ہوا تھا اور بارش ہونے لگی، اس لئے سب مہمانوں کو گھر میں بلا لیا گیا اور وہ لوگ مختلف کمروں میں ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے تھے، چونکہ ابھی رسمیں وغیرہ ہونا باقی تھیں اس لئے رخصتی میں ابھی دیر تھی، جبکہ بابا جان اور باقی حضرات کا خیال تھا کہ شام سے پہلے ہی روانگی ہو جائے، مگر فی الحال تو سب مگن تھے۔

''اف ابھی تو دودھ پلائی کی رسم میں مزہ آئے گا، دیکھنا ذرا کیا ہوتا ہے۔'' لائبہ نے خوشان کو انفارم کیا جو دلہن اور دولہا کے گرد جمع لڑکوں کو دیکھ کر ہی گھبرا رہی تھی اور کمرے سے باہر ہونے کے باوجود بھی اسے گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

سمرینہ وغیرہ جتنی دیر سے آئے تھے اتنی ہی جلدی واپس بھی چلے گئے اور جاتے جاتے بھی خوشان کے ذہن میں کئی سوال سمرینہ کی صورت میں محفوظ ہو گئے، یہ ایسی کیوں ہے؟ خوشان کو الجھن ہی ہو گئی، ظاہر ہے خوشان کی سلام دعا تو لائبہ کی دور پار کی سب کزنز سے تھی اور سب کی سب خوش اخلاق اور ملنسار تھیں پھر سمرینہ۔

''بھئی وہ جو ہے ناں سمرینہ وہ تراب کی منگیتر ہے اور اسمارہ کی نند بھی ہے اور ان کی چچا زاد بھی ہے۔'' لائبہ کی وضاحت پر خوشان کی نظروں میں تراب اور سمرینہ دونوں ہی گھوم گئے۔

''ہائے وہ سمرینہ منگیتر ہے تراب کی؟ اف کتنی خوش قسمت ہے۔'' اور خوشان کی بات پر لائبہ مسکرانے لگی کہ صامیہ، رامیہ اور دیگر کزنز کی طرح اس نے یہ خبر سن کر بے چارہ تراب کا نعرہ نہیں لگایا تھا بلکہ سمرینہ کی خوش قسمتی کو تراب کی بدقسمتی نہیں کہا تھا۔

''مگر......'' خوشان کے اس مگر کے آگے جو سوال تھا وہ لائبہ سمجھ چکی تھی اس لئے فوراً بولی۔

''بھئی بات اتنی ہے کہ سمرینہ سے پہلے تراب کے لئے بڑی خالہ نے میرے لئے بات کی تھی اور بھائی کے لئے اسمارہ کی، مگر تمہیں تو معلوم ہے کہ اظہر بھائی کو شروع سے عروج میں دلچسپی تھی اور اس نے بھی ماموں جان سے کہہ دیا تھا اس لئے بات نہ بن سکی، تو اسمارہ کی بات اس کے چچا زاد صارم سے اور تراب کی سمرینہ سے ہو گئی، اس لئے سمرینہ سمجھتی ہے کہ تراب شاہ اور میرے میں کچھ ہے مگر ایسا نہیں ہے، دوسری بات یہ کہ میں اور تراب بچپن ہی سے ایک دوسرے کے بہت قریب رہے اس لئے زیادہ فرینک ہیں، پھر تعلیمی اعتبار سے دونوں خاندان میں آگے ہیں، ایجوکیشن معاملے جب بھی ذکر ہوتا ہے لڑکیوں میں میرا اور لڑکوں میں تراب کا ذکر ہوتا ہے کیونکہ بہت لائق، ذہین، محنتی ہے، اپنا بزنس بھی کر رہا ہے جبکہ سمرینہ صرف آٹھویں پاس ہے۔''

خوشان نے ایک بار پھر دل ہی دل میں تراب کی زبردست پرسنالٹی کو سراہا اور سمرینہ کی خوش قسمتی پر رشک کیے بنا نہ رہ سکی کہ ایکدم سے بلند ہوتے شور نے اسے اندر کی سمت متوجہ کر لیا جہاں دودھ پلائی کی رسم ہو رہی تھی، دولہا کی طرف سے لڑکے موجود تھے جبکہ باقی لڑکیاں دلہن والیاں بنی ہوئی تھیں، بحث زور و شور سے جاری تھی، لائبہ اور خوشان کرسیوں پر کھڑی ہو گئیں تاکہ اندر کا منظر واضح دیکھ سکیں۔

''لائبہ ایسا کرو تم اندر چلی جاؤ۔'' خوشان نے لائبہ کا ہاتھ پکڑ کر کرسی سے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

''ہیں...... کیوں؟'' لائبہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''وہ دیکھو۔'' خوشان نے آنکھوں کے اشارے سے بتایا، تو ان کی طرف پورا کا پورا متوجہ تراب نہ جانے کن خیالوں میں گم تھا۔

''ہاہ...... اسے دیکھو ذرا۔'' لائبہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں میں تو کافی دیر سے دیکھ رہی ہوں۔'' خوشان نے آہ بھر کر کہا۔

''بکواس مت کرو، تمہیں پتہ نہیں عزیم کا وہ بڑا پوزیسو ہے اور یہ لگتا ہے ایسے ہی اتفاق سے پلکیں جھپکنا بھول گیا ہو گا اور تمہیں خبر ہے مائی ڈیئر کہ مجھے اپنا اکلوتا منگیتر ہی بہت پیارا ہے۔'' لائبہ نے کہا۔

''ہاں مگر ضروری تو نہیں کہ اسے سمرینہ پسند بھی ہو۔'' خوشان تو تراب اور سمرینہ کے معاملے میں اٹک ہی گئی تھی۔

''اچھا بھئی جب بھی اسلام آباد آتا ہے اظہر بھائی کی بائیک پر موصوفہ کو بٹھا کر سارے جہاں کی سیر کرتا ہے، ذرا سا محترمہ کے بارے میں کچھ کہہ دو تو ایسی کھری کھری سناتا ہے کہ بس۔'' لائبہ نے تنگ آ کر کہا۔

''پھر بھی ہو سکتا ہے کہ......'' خوشان نے سوچتے ہوئے کہنا چاہا مگر لائبہ نے درمیان میں ٹوک دیا۔

''کچھ نہیں ہو سکتا، یہ منگنی اس سے پوچھ کر ہوئی تھی اور اس نے صاف کہہ دیا اس کی کوئی پسند وسند نہیں ہے، والدین جہاں چاہے مرضی بات کر لیں اور خبردار جو تم نے اب کچھ کہا، ویسے چلو ہم کپڑے تبدیل کر لیں اندر تو جانے کا فائدہ نہیں وہ عزیم بھی اندر ہے، سب دولہا دلہن کو بھول کر میرا مذاق بنانے میں اپنی صلاحیتیں آزمائیں گے خاص طور پر یہ خبیث تراب۔''

☆☆☆

کوچ میں بیٹھتے ہوئے خوشان نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی مگر صامیہ، اسمارہ، اشناء کوئی بھی موجود نہ تھیں، صارم نے بتایا کہ وہ دوسری کوچ میں سوار ہو گئی ہیں، چونکہ اب واپسی میں ملتان والے رشتے داروں نے بھی جانا تھا ویسے کے لئے اس لئے جگہ کم پڑ رہی تھی، زرمین آنٹی، بڑی خالہ وغیرہ کار میں دلہن کے ساتھ تھیں، لائبہ نے کوچ میں بیٹھنے کو فوقیت دی تھی کہ کار میں بیٹھے بیٹھے مشکل ہو جاتی، دو کوچیں بھری ہوئی تھیں اور اب یہاں لڑکوں کی بڑی تعداد بھی موجود تھی۔

''اُف یہ لوگ سارا راستہ یونہی کھڑے رہیں گے کیا؟'' خوشان کو دروازے کے قریب باتوں میں مشغول کھڑے تراب، صارم، عزیر کو پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے اسی طرح دیکھ کر وحشت ہونے لگی تھی، جواباً لائبہ نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''لو ابھی تو تھوڑا سا سفر مکمل ہوا ہے اور ان کو کھڑے ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ، پاگل ان کو تو عادت ہے اسلام آباد سے ملتان، لاہور تک اس طرح سفر کرنے کی اور ویسے بھی ٹک کر بیٹھ جانا ان کی سرشت نہیں، تم آرام سے بیٹھو بلکہ کچھ آرام کر لو تاکہ ولیمے میں یہ بارہ بجاتی شکل نہ ہو۔'' اس کی بات سن کر خوشان نے مسکرا کر سیٹ سے ٹیک لگا

کر آنکھیں بند کر لیں۔

''اللہ خیر کیا ہوا؟'' نہ جانے اس کتنی دیر ہوئی تھی سوتے ہوئے کہ زوردار آواز کے ساتھ وہ پوری اچھل گئی۔

''کچھ نہیں جمپ لگا تھا۔'' نہایت نرم آواز میں اس کی تسلی کرائی گئی تو وہ نیند سے بے حال پلکوں سمیت اِدھر اُدھر دیکھنے لگی، تقریباً سبھی سو رہے تھے یا پھر یونہی بے سدھ اور باہر اندر کی آوازیں اور اس قسم کی جمپ ان کے آرام میں مخل نہیں تھے مگر خوشان کی نیند ٹوٹ چکی تھی، لائبہ تو سکون سے خوشان کے کندھے پر سر رکھے سو رہی تھی۔

''لائبہ میری تو ٹانگیں ہی سن ہو گئی ہیں، پلیز کچھ دیر کھڑے ہو کر ٹہل لیں؟'' خوشان نے منت بھرے لہجے میں لائبہ سے کہا، تو وہ جو خوشان کے کہنے پر کھڑے نڈھال حضرات کی طرف متوجہ تھی، ان سنی کر گئی کہ عزیر اپنے چٹ پٹے لطیفوں سے تراب، صارم وغیرہ کی تھکن اور بے قراری دور کرنے کی کوشش خود بھی خاصا ہلکان ہو رہا تھا۔

''چلو یار ذرا ان پر بھی احسان کر ہی دیں، ویسے بھی بیچاروں نے بہت صبر کیا ہے۔'' پھر لائبہ نے ان لوگوں سے جا کر کہا تو وہ خوشان، لائبہ اور اسمارہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور وہ چاروں ان کی جگہ پر بیٹھ گئے، آگے والی سیٹ کی بیک ہاتھ جمائے باہر تیزی سے گزرتے نظارے دیکھتے ہوئے لائبہ سے باتوں کے دوران خوشان پزل سی ہو گئی کہ وہ جب بھی اپنے مقابل کھڑی لائبہ کی طرف دیکھتی نظر ڈائریکٹ سیٹ کی بیک سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے تراب کے چہرے پر پڑتی اور تب ہی اسے ایسا لگا تھا کہ وہ شخص بند آنکھوں سے بھی دیکھ رہا ہے۔

''شکر ہے پہنچ گئے۔'' خوشان نے کوچ سے باہر قدم رکھتے ہی کہا، باقی سب بھی اپنا سامان اتارنے لگے اور وہ لائبہ کے ہمراہ اندر آئی جہاں دیگر رسموں کے لئے چیخ و پکار مچی ہوئی تھی، مگر لائبہ نے خوشان کو گھر بھیج دیا تاکہ آرام کے بعد وہ کل ولیمے میں فریش شامل ہو۔

گھر کے گیٹ پر لائبہ اسے خدا حافظ کہہ رہی تھی اور تراب لان میں بچھی کرسی پر شلوار سوٹ میں ملبوس کندھے پر کالی شال ڈالے نیم دراز تھا، مگر اس کی بند آنکھیں شاید ہر منظر دیکھ رہی تھیں کیونکہ کھلے گیٹ سے باہر نکلنے تک لائبہ واپس جا چکی تھی مگر خوشان کو اپنی پشت پر تیز نظروں کا واضح احساس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

لائبہ نے خوشان کو پیغام بھجوا دیا کہ وہ سب تیار ہیں وہ بھی آ جائے اور وہ جب گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو بالکل سامنے کھڑے تراب علی شاہ کی مسکراتی آنکھوں نے اس کا استقبال کیا، ان مسکراتی آنکھوں کی روشنی سے وہ صرف ایک لمحہ کو ٹھٹکی تھی اور پھر اگلے ہی پل وہ لائبہ کی تلاش میں آگے ہی بڑھ گئی۔

اظہر بھائی اور عروج تو ولیمے کی شام ہی کو ہنی مون ٹرپ پر روانہ ہو گئے تھے، اظہر بھائی کے دوست نے شادی پر گفٹ کی صورت میں پاکستان میں موجود تمام خوبصورت مقامات کی سیر کا انتظام کروا دیا تھا۔

اگلے دن باقی مہمانوں نے بھی رخت سفر باندھا، اسمارہ وغیرہ نے خاص طور پر خوشان سے گھر آ کر الوداعی ملاقات کی تھی، ساتھ ہی وہ شادی کی تصویریں بھی لائی تھیں۔

''ہائے لائبہ یہ تصویر میں لے لوں؟'' خوشان نے برات والے دن لی گئی اپنی کلوز اپ

والی تصویر دیکھی جو حیرت انگیز طور پر بہت ہی زیادہ اچھی آئی تھی، حیران حیران آنکھوں اور دھیمی مسکراہٹ میں وہ خود کو بھی پہچان نہیں پائی اس لئے کہہ بیٹھی۔

''بھئی مجھ سے کیا کہتی ہو جن کی تصویریں ہیں ان سے مانگو، ہماری جب آئیں گی تو میری جان بے شک سب کی سب رکھ لینا۔'' لائبہ نے مسکرا کر کہا تو وہ اسمارہ کی شکل دیکھنے لگی۔

''وہ پتہ ہے میں دے تو دیتی مگر بھائی جی نے کہا تھا کہ البم میں تصویروں کی ترتیب بھی اِدھر اُدھر نہیں ہونی چاہیے، میں بھائی جی سے پوچھ کر دے دوں گی۔'' اسمارہ نے شرمندہ سے لہجے میں کہا، خوشان نے ''چلو رہنے دو'' کہہ کر بات ختم کر دی۔

وہ سب جانے کے لئے تیار تھے، بڑے سے لان میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے خیال رکھنے کی ہدایات کرتے وہ خوش بھی تھے اور اداس بھی، گاڑیوں میں سامان رکھا جا چکا تھا، اسی لئے خواتین گلے مل کر اجازت لے رہی تھیں۔

''اچھا دوستوں خدا حافظ۔''

''پھر جلدی چکر لگائیے گا۔'' لائبہ نے کھڑکی سے اندر منہ کر کے گویا صامیہ کے کان میں صور پھونکا تھا۔

''آرام سے خاتون۔'' فرنٹ ڈور کھولتے تراب نے لائبہ سے کہا تو وہ اسی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''تم بھی جلدی آنا، بھول مت جانا یوں بھی تمہاری یادداشت پر جھاڑو بہت جلد پھر جاتی ہے۔'' لائبہ نے شاید قسم کھا رکھی تھی کہ تراب سے کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرے گی۔

''اگر کہو تو یہیں رہ جاؤں موموجی میری یادداشت پر جھاڑو پھر جاتی ہے تمہاری تو عقل ہی

چوپٹ ہے، سب صفایا ہو چکا ہے، باقی جو کسر رہ گئی تھی وہ اس گھسیارے نے پوری کر دی۔'' صاف تپانے والا انداز تھا۔

''اچھا اب بکواس بند کرو اور چلو مرو۔'' لائبہ نے اسے نہ جانے کیونکر معاف کر دیا تھا۔

''اچھا...... اچھا خدا حافظ، ویسے جلدی آؤں گا۔'' اس نے ایک نظر خوشان پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہیں۔'' گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی لائبہ نے حیرت سے لمبا ہیں کہا تھا، مگر گیٹ سے نکلتی گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا تراب اپنی آنکھیں ان حیران آنکھوں کے اردگرد کہیں چھوڑ آیا تھا، مگر ہونٹوں پر مستقل چپکی مسکراہٹ اس کے چہرے کو بہت روشن کر رہی تھی۔

''تم مانو نہ مانو میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں اس نے صاف تمہارے اس حسین چہرے پر نظریں جما کر ہی کہا تھا کہ جلد آؤں گا، ہائے کاش وہ بے وقوف اپنی منگنی سے پہلے ہی...... مگر ناممکن خاندان سے باہر شادی، ایک تو ہمارے بزرگ نہ جانے کیا چاہتے ہیں؟ جب مذہب نے اجازت دے دی ہے تو......'' لائبہ اپنے ہی قیافے اور اندازے لگا رہی تھی کہ خوشان جو خاموش بیٹھی تھی بول پڑی۔

''تم خواہ مخواہ کانشس ہو رہی ہو، ایسا کچھ نہیں ہے۔'' حالانکہ اس کا دل سارے پچھلے منظروں میں الجھا ''ہے...... ہے'' کی رٹ لگا رہا تھا۔

☆☆☆

''کیا کہا ایک مہینے کے لئے جا رہی ہو؟ تمہارا دماغ درست ہے؟'' لائبہ نے حیرت اور غصے سے خوشان کو دیکھا اور چلائی۔

''بھئی کیا ہے ایک ماہ میں قیامت تو نہیں آ

...ہوئے چائے کی پیشکش کرتے ہوئے کچن کی طرف پیش قدمی کر دی، جبکہ کہ ابھی تک حیرانگی سے بیٹھی تصویریں دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

''اُف اتنے دنوں بعد شکل دکھائی ہے، میں تو سمجھی آپ شہر بدر ہو چکی ہیں۔'' خوشان نے لائبہ کو دیکھ کر کہا۔

''ہاں بس کچھ مصروفیت تھی، بڑی خالہ بیمار تھیں اس لئے ملتان گئی ہوئی ہیں امی۔'' لائبہ کا انداز کافی ست سا تھا۔

''خوبان اور آنٹی کہاں ہیں؟'' ڈرائنگ روم کے صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے لائبہ نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔

''مارکیٹ گئی ہیں، کالج کھلنے والے ہیں ناں خوبان نے ضروری شاپنگ کرنی تھی۔'' خوشان نے جواب دیا۔

''چلو اچھا ہے تم سے دل بھر کر باتیں کروں گی، ویسے بھی آج طبیعت میں بے قراری بہت ہے، ایک تو بڑی خالہ کی وجہ سے بہت پریشانی ہے۔''

''انہیں کیا ہوا ہے؟''

''ہارٹ اٹیک۔'' لائبہ نے افسردگی سے کہا۔

''تمہیں تو پتہ ہی ہے دل اور گردوں کی بیماریاں تو ہمارے خاندان کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی ہیں، اب اعصابی کمزوری اور نفسیاتی مسائل بھی تیزی سے بڑھ رہے ہیں، ڈاکٹرز واضح طور پر کہہ چکے ہیں کہ یہ سب خاندان میں نسل در نسل آپس کی شادیوں کا نتیجہ ہے، مگر ہمارے بزرگ اس بات کو نہیں مانتے، جوڑ ہو یا نہ ہو بے شک دونوں فریق تمام زندگی ایک دوسرے سے بے زار، محبت سے خالی بس اپنی روایت کے عظیم علمبردار بنے رہیں اور مارے باندھے کے اس بندھن کو گلے میں پڑے پھندے کی طرح محسوس کرنے کے باوجود رواج کی سلامتی کے ضامن بنے رہیں، بھاڑ میں گیا دل اور چولہے میں گئی محبت، بس رسم و رواج کے طوق کے لئے گردنیں اور جھوٹی شان کی سلامتی کے لئے قربانیاں دیئے جا رہے ہیں اپنی نسلوں کی یہ لوگ۔'' لائبہ نہ جانے کیوں اس قدر بھری بیٹھی تھی۔

''کیا ہوا؟'' خوشان نے نرمی سے سوال کیا۔

''ہونا کیا ہے وہی رامیہ کا مسئلہ سب کو خبر ہے کہ وہ صالح کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہے گی پھر ان کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، صالح اپنی بات منوا کر دم لیتا ہے چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو، رامیہ تو غلط بات نہ کرتی ہے اور نہ ہی لگی لپٹی رکھتی ہے، پھر وہ بی اے کر رہی ہے جبکہ صالح کو پڑھنے لکھنے سے کیا پڑھنے والوں سے سخت چڑ ہے اور سب سے زیادہ اہم بات تو یہ ہے کہ وہ رافع کو پسند کرتی ہے اور اس بات کا علم صالح کو بھی بخوبی ہے، مگر دادا جان کے حکم کے آگے بھلا اب کوئی کیا کہے۔'' لائبہ نے بات ختم کر کے اپنا سر تھام لیا، جبکہ خوشان افسوس سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''تو......؟'' خوشان نے آگے کی کاروائی میں دلچسپی لی۔

''تو...... ارے ہاں...... اتنی اہم بات تو میں بتانا ہی بھول گئی ویسے ابھی تک پکی خبر تو نہیں مگر لگتا ہے۔'' لائبہ نے آنکھیں میچتے ہوئے دماغ پر زور ڈالا۔

''اف اب بتا بھی چکو اتنا سسپنس کیوں پھیلا رہی ہو؟'' خوشان نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے وہ سلیم بالکل بلا تمہیں پسند کرنے لگا ہے یا شاید اس سے کچھ زیادہ۔'' لائبہ نے شرارت سے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟ کون......؟'' خوشان نے نا سمجھی کے انداز میں سوال کیا۔

''بھئی وہی سید ترات علی شاہ جو کچھ عرصے سے میرے ساتھ بہت نرمی اور شائستگی سے پیش آنے لگے ہیں، فون پر بہت عزت و احترام سے بات کرتے ہیں اور میری چھیڑ چھاڑ بلکہ بدتمیزی کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے لگے ہیں اور...... اور۔'' لائبہ نے شاید کچھ زیادہ ہی باتوں کے موڈ میں تھی۔

''اور ہاں موصوف کو مجھ سے میری خیریت سے زیادہ میری دوست کی فکر رہنے لگی ہے، بہانے بہانے سے ذکر نکالتا ہے ایڈیٹ، جیسے میں بے وقوف اس کو جانتی ہی نہیں۔''

''اف لائبہ تم ہوش میں ہو ناں تم میرا ذکر کر رہی ہو وہ بھی اس طرح؟'' خوشان نے حیران ہو کر کہا۔

''ایک یہ بڑی مصیبت ہے تم ہر بات کو دل پر لے لیتی ہو، میری پیاری دوست مجھے وہ فضول شخص اپنے خاندان میں سب سے زیادہ عزیز ہے اور تم اس پوری دنیا میں اور اگر کوئی کسی کو پسند کرے یہ اس کا ذاتی فعل ہے اور پلیز تم میری دوست ہو جو بات میں خود سے بھی نہیں کہتی ناں وہ تم سے کہہ دیتی ہوں اس لئے پلیز خدا کے لئے مجھ پر شک مت کیا کرو، چلو شاباش مجھے اچھی سی چائے پلاؤ، اس نواب کی برین واشنگ کے لئے تو سمرینہ ہر دم اس کی نظروں کے سامنے ہے، بھلا محترمہ کی کڑی نظروں سے بچ کر موصوف اِدھر اُدھر ہو سکتے ہیں؟ اب گھورنا بند کرو چائے پلاؤ پھر میں جاؤں۔'' وہ بات بدلتے ہوئے بولی، جبکہ وہ اندر سے اس وقت بہت الجھی ہوئی تھی۔

☆☆☆

''تراب تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اور تم میرا دماغ بھی خراب کر دو گے، ایک ہزار بار سمجھا چکی ہوں مگر وہی مرغے کی ایک ٹانگ، اللہ کے واسطے کیوں اس معصوم کے پیچھے پڑ گئے ہو، فضول مت بولو تمہیں خوب خبر ہے میں کچھ نہیں کر سکتی اور نہ ہی کروں گی، مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے اسے خوار کرنے کی، آج کل کوئی نہیں مرتا کسی کے لئے نہ کسی کی خاطر، کیا خود آ رہے ہو؟ خبردار جو یہاں آئے وہ بھی دیوانگی میں...... نہیں...... مرو دفع ہو۔'' لائبہ نے غصے سے ریسیور پٹخا تو دروازے میں کھڑی خوشان پر نظر ڈال کر سٹپٹا سی گئی۔

''ارے تم کب آئی ہو؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے...... یہ کیا قصہ ہے؟'' خوشان نے فون کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''یار بس کچھ مت پوچھو، میں تو ابھی تک مذاق ہی سمجھتی رہی اور یہاں پانی سر سے اونچا ہو گیا، میں تو سمجھ رہی تھی وقتی جذباتیت ہے مگر موصوف نے شہنشاہ محبت بننے کی مکمل تیاری کیے ہیں، اب تم ہی سنبھالنا۔'' لائبہ نے ایکدم ہی خوشان سے کہا تو وہ سن سی ہو گئی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ میرا اس میں کیا رول ہے؟'' خوشان نے حیرت سے سوال کیا۔

''ملکہ جذبات کا۔'' لائبہ کا موڈ اب کچھ بہتر ہو گیا تھا۔

''میرا مطلب ہے بھئی تم تو اسے پسند نہیں کرتی ناں؟'' لائبہ نے خوشان کی آنکھوں میں جھانکا۔

''نہیں ناں۔'' ساتھ ہی پر زور اصرار کیا گیا، دوسری طرف بے نیازی کے ریکارڈ ہی توڑ

دیئے گئے۔

''خوشان ڈیئر میں تم سے پوچھ رہی ہوں، مس خوشان صدیقی مسٹر تراب علی شاہ کو پسند کرتی ہیں؟''

''نہیں بالکل نہیں۔'' خوشان نے بہت آہستگی سے کہا مگر لائبہ شاہ کی ڈارک براؤن آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں کہ خوشان کے چہرے پر بکھرے رنگ اس کے الفاظ کی ہنسی اڑا رہے تھے۔

''اوہ نو یہ سب کیسے ہوگیا؟'' وہ ان دونوں کے ہی کتنے قریب تھی مگر محبت کا یہ کھیل کتنی خاموشی سے مگر کتنی تیزی سے کتنا آگے تک بڑھ گیا تھا اور اسے ہی خبر نہ ہو سکی۔

''خوشان یہ سب کیسے ہوا؟'' اپنے لبوں پر آیا سوال اس سے پوچھ لیا۔

''کیسے؟ پتہ نہیں۔'' خوشان نے آہ بھر کر کہا۔

''تم نے کبھی بھی نہیں بتایا؟'' لائبہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''کیا بتاتی کہ تمہارا وہ کزن بقول تمہارے فضول بانگڑو لکڑ بھگا جس کی ایک عدد منگیتر بھی ہے مجھے اچھا لگنے لگا ہے، مجھے اس شخص سے محبت ہو گئی ہے جو رسم و رواج کے علاوہ ڈھیروں رشتوں کی زنجیروں میں قید ہے، نہیں میں اتنی بے وقوف اور کم ظرف نہیں ہوں کہ اپنی غرض کے لئے کسی کی آنکھوں کے ست رنگ سپنے نوچ لوں، میری محبت میرے لئے کافی ہے۔'' خوشان نے لائبہ کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا۔

''مگر تمہیں خبر نہیں ہے وہ بھی......'' لائبہ نے خوشان کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

''ہاں یہ میری خوش نصیبی ہے اور بد نصیبی بھی۔'' خوشان کے نہ صرف ہونٹ بلکہ آنکھیں بھی مسکرانے لگیں۔

''ہاں مگر کوشش تو کی جا سکتی ہے ناں، کیا خبر ذات برداری، اونچ نیچ، رسم و روایت کی ان دیواروں میں دراڑ ڈال کر راستے بنانے کا سہرا اس بانگڑو کے سر ہی سجنا ہو، قسم سے اسے خبر ہو جائے نہ کہ تم بھی تو وہ تو پورا پاگل ہو جائے، خیر پاگل تو اب بھی اسے کر ہی دوں گی پہنچ رہا ہے کل صبح کی فلائیٹ سے۔'' لائبہ نے شاید تصور کی آنکھ سے ہی اس کی درگت بنتی دیکھ کر لطف لیا تھا۔

''مگر میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے اسے یا کسی کو بھی کوئی پریشان ہو۔'' خوشان نے لائبہ سے کہا تو لائبہ نے اسے بے وقوف کا لقب دے کر گلے لگا لیا۔

☆☆☆

بہت یقین دلاتا تھا جو وفاؤں کا
بدل گیا ہے وہ رخ دیکھ کر ہواؤں کا

''کیا میں نے کب تم سے کسی مدد کا کہا ہے، اپنے آپ سے ہی لگے ہوئے ہو، اتنی دیر سے میرا مغز چاٹ رہے ہو، بہتر ہوگا کچھ دیر اپنی اس زبان کو اور اس لمبے چوڑے وجود کو آرام دے لے تاکہ تمہارا یہ خناس بھی کم ہو اور یہ کیا میرے پیچھے سائے کی طرح لگ گئے ہو۔'' لائبہ نے سلاد سجا کر فریج میں رکھ کر پلٹی تو سر پر کھڑے تراب کو دیکھ کر ٹپٹا گئی، جو مسلسل کچن میں موجود اس کے صبر اور برداشت کا امتحان لے رہا تھا، جبکہ لائبہ اس کی بے چینی اور بے تابی پر محظوظ ہو رہی تھی۔

''اچھا میں ایک شرط پر تمہاری جان چھوڑوں گا کہ تم میری مدد کرو گی ڈیئر کزن۔'' تراب نے کہا تو لائبہ نے ''سوچوں گی'' کہہ کر جان بخشی کروائی۔

''اچھا میں صرف آدھ گھنٹے بعد پھر سے تمہارے سامنے ہوں گا۔'' تراب نے احسان

کرنے والے انداز میں کہا اور لاؤنج میں ہی صوفے پر کمبل لے کر ڈھیر ہو گیا۔

خوشان نے لاؤنج میں قدم رکھا تو ٹھٹک گئی، صوفے پر کمبل تانے یقیناً وہی تھا، کچن میں سالن بناتی لائبہ اپنے کام میں منہمک تھی اس لئے خوشان دبے پاؤں بالکل سائیڈ پر سے نکلی، ابھی کچن میں قدم رکھا ہی تھا کہ تراب کی آواز پر ٹھٹک گئی۔

جو ساری عمر مجھ سے دور دور چلتا رہا
وہ آس پاس یوں بکھرا ہے جیسے خوشبو ہو
بس اس امید پہ خوابوں میں عمر کاٹی ہے
میں آنکھ کھول کر دیکھوں تو سامنے تو ہو

''تراب یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' اس کے شعر گنگنانے نے بلکہ بلند آواز میں سنانے پر لائبہ نے مڑ کر دیکھا تو سامنے سرخ چہرے سمیت خوشان اور چوکھٹ پر کھڑے مسکراتے تراب پر نظر جما دی۔

''ارے تم کب آئیں؟'' لائبہ نے خوشان سے پوچھا جو خفت زدہ سی کھڑی تھی۔

''ابھی...... وہ میں پھر آؤں گی۔'' خوشان نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

رخصت ہوا تو آنکھ ملا کر نہیں گیا
وہ کیوں گیا ہے یہ بھی بتا کر نہیں گیا
رہنے دیا نہ اس نے کسی کام کا مجھے
اور خاک میں بھی مجھ کو ملا کر نہیں گیا

''تراب کے بچے۔'' شعر ختم ہوتے ہی لائبہ کی دھاڑ سنائی دی تھی اور خوشان گیٹ سے نکلتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ واقعی یہ بندہ بند آنکھوں سے بھی دیکھ سکتا ہے۔

☆☆☆

''ایسا لگ رہا ہے میدان جنگ میں فتح کا جھنڈا لہرا کر واپس جا رہے ہو۔'' لائبہ نے تراب کے ہونٹوں پر چپکی مستقل مسکراہٹ اور کالی سیاہ آنکھوں میں چمکتے جگنو دیکھ کر کہا۔

''ہاں محبت کی بازی میں جیت کا اپنا ہی نشہ ہے، کسی کو چاہنا اور پھر اس چاہ کو پا لینا بھی تو خوش بختی ہے، بس دعا کرو آگے بھی تمام مراحل اسی قدر آسانی طے ہو جائیں، ایسا لگ رہا ہے دو ہفتوں میں دو سو سال کا سفر دو پل میں طے کیا، زندگی اتنی حسین اتنی خوبصورت......'' تراب نے سرخ گلاب کے پھولوں سے بھرے پودے پر نظریں جماتے ہوئے کہا تو چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے لائبہ نے اس کی محویت توڑتے ہوئے کہا۔

''کون......؟ کس کی بات کر رہے ہو؟''

''اس کی جس کا نام لوں گا تو تم خونخوار بلی میرے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جاؤ گی کہ ایسے دھڑلے سے نام کیوں لیا؟ لائبہ تم میرا اعتبار کیوں نہیں کر لیتی چاہے دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے، آسمان زمین ایک ہو جائیں میں سید تراب علی شاہ قول سے کبھی نہیں پھیروں گا اور یہی لائبہ شاہ کی عزیز از جان و اکلوتی سہیلی محترمہ خوشان علی صدیقی کو بھی دھوکہ نہیں دوں گا، اب چلیں؟'' اس نے چائے کا خالی کپ لائبہ کو تھما کر کہا تو وہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''بھئی اسے الہام تو نہیں ہوگا کہ میں شام کو چلا جاؤں گا، خدا حافظ ہی کہہ ہی آؤں۔'' تراب نے مسکرا کر شرارت سے اس کی طرف دیکھا، مگر شاید خوشان صدیقی کو الہام ہونے لگے تھے، تبھی ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ بھی لان میں گلاب کے ہرے بھرے سرخ سرخ پھولوں کے بوجھ سے لٹکے پودوں کے پاس بہت بزل سی بیٹھی تھی، چہرہ پر ملال اور آنکھیں بہت اداس لگ رہی تھیں اور

مگر ایک وہی تھا جو مسلسل مسکرا رہا تھا، اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو ہنسنے کی تلقین اور مسکرانے کی نصیحت کر رہا تھا اور وہ بے چاری مسلسل مسکرانے کی کوشش میں آنکھوں میں آئی نمی کو چھپانے میں ناکام ہو رہی تھی۔

☆☆☆

سارے راستے تراب لائحہ عمل ترتیب دیتا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے، ائیر پورٹ سے ٹیکسی لے کر وہ مسرور سا، سادات ہاؤس کی طرف رواں تھا، مین روڈ پر ٹرن لیتے ہوئے خوشان صدیقی کی نم آنکھوں مگر مسکراتے لبوں کے تصور میں کھوئے تراب نے سامنے سے آتے ٹرالے اور ہارن کی تیز آواز سنی تھی کہ ایک دھماکے سے وہ اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا، ایک لائحہ عمل اللہ تعالیٰ کا بھی ہے جس کے آگے سب بے بس ہیں۔

☆☆☆

''لائبہ دیر نہیں ہو گئی؟'' خوشان نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''یار تم تو اس گھونچو سے بھی دو ہاتھ آگے ہو، وہ ملتان پہنچ کر سب سے پہلے فون کھڑکائے گا، مجھے دو سو فیصد یقین ہے اور ائیر پورٹ سے بھی تو فون کیا ہی تھا، ذرا صبر کرو۔'' لائبہ نے بے چاری سی شکل لئے خوشان کی طرف دیکھا اور خواہ مخواہ مسکرانے لگی، یقیناً وہ شرارت کے موڈ میں تھی، مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، فون کی تیز بیل نے اس کے قدموں اور خوشان کے دل کی دھڑکن کو بہت تیز کر دیا اور اگلے ہی پل میں لائبہ شاہ کی دلدوز چیخوں سے سارا گھر گونج رہا تھا۔

امی اپنے کمرے سے دوڑتی ہوئی آتی تھیں، ابا جان جو ناسازی طبع کی وجہ سے گھر پر ہی آرام کر رہے تھے گھبرائے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئے تھے، جہاں حق دق پھٹی پھٹی آنکھوں اور پیلی رنگت سمیت کھڑی خوشان پتھر کی ہو گئی تھی اور ریسیور ہاتھ میں لئے ابا جان نے جو خبر سنی تھی وہ ان کے حواس بھی گم کر گئی تھی، تراب علی شاہ ایکسیڈنٹ میں خالق حقیقی سے جا ملا تھا۔

لائبہ شاہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی، امی جان اکلوتے بھانجے کی اچانک موت پر سسکیاں بھر رہی تھیں اور خوشان صدیقی خاموشی سے اپنے گھر آ گئی تھی، اپنے کمرے میں بند وہ سسک رہی تھی کہ سب کے سامنے وہ کیونکر آنسو بہاتی، کس حوالے سے، کس تعلق کی بنا پر، وہ تراب علی شاہ کی جدائی پر بین کرتی۔

''تراب علی شاہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی، تم نے مجھے خوابوں کی شاہراہ پر اکیلا اور ادھورا چھوڑا ہے۔'' وہ تڑپ تڑپ کر روتی اور پھر کانچ جیسے نازک سپنوں کی نوکیلی کرچیوں کے زخم دل پر اور روح پر سہتی وہ دم ہو گئی تھی اور بند ہوتی آنکھوں میں روشن روشن مسکراتی، جگمگ کرتی، محبت سے بھری دو آنکھوں نے اپنا عکس چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

چند گھنٹوں میں ہی سب رشتہ دار خواتین سادات ہاؤس اور مرد حضرات ہسپتال میں تھے، مگر شعبہ حادثات میں روڈ ایکسیڈنٹ کے تین کیس تھے، اس لئے خاصا انتظار کرنا پڑا تھا اور ان اذیت ناک لمحوں کا پل پل عجیب کیفیت سے بھرپور تھا، جائے وقوعہ پر سامان اور سفری بیگ سے ملنے والے شناختی کارڈ وغیرہ سے پولیس نے تراب کا نام و پتہ معلوم کیا تھا، مگر اب ہسپتال میں گویا کسی کو بھی ان قیامت خیز لمحوں کی اذیت کا اندازہ نہ تھا، پولیس گویا اپنا فرض ادا کر کے بری

الذمہ ہو گئی تھی، بس وہ سب اِدھر سے اُدھر بھاگ دوڑ کر رہے تھے، مگر ٹھیک صورتحال سے بے خبر تھے، پھر اٹھارہ گھنٹے بعد نعش ان کے حوالے کر دی گئی تھی مگر اس حالت میں کہ نا قابل شناخت حالت میں، ٹرالے نے جس بے دردی سے ٹیکسی کا غذ کا گولا بنا دی تھی اس سے زیادہ برا حشر تو پوسٹ مارٹم کے نام پر اس انسان کا کیا تا جو ذرا سی خراش آنے پر واویلا کر دیا کرتا تھا، مگر اب اتنی چیر پھاڑ پر وہ تو خاموش تا مگر سارا درد، تکلیف، غم اس کے پیاروں کے دل پر زخم لگا گیا تھا، محض چند گھنٹوں بعد ہی شہر خاموشاں میں ایک اور کتبے کا اضافہ ہو گیا تھا، جس پر لکھا نام دور سے نظر آ رہا تھا سید تراب شاہ۔

☆☆☆

سات سال کے اس عرصے میں بہت سی تبدیلیاں آئی تھیں، لائبہ شادی کے بعد ملتان چلی گئی تھی، اظہر بھائی کمپنی کی طرف سے سعودی عرب سدھارے اور خوشان صدیقی اپنی بے قراری بے چینی لئے اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ چلی گئی تھی، جبکہ خوبان کی شادی ہو گئی تھی اور وہ کراچی میں رہائش پذیر تھی۔

خوشان جن اذیت ناک سوچوں اور تکلیف دہ یادوں سے جان چھڑا کر سات سمندر پار آئی تھی وہ تو اب بھی ہر دم اس کے ساتھ ہی رہتی تھیں اور وہ سوچ کر رہ جاتی بھلا لوگ کس طرح بھلا دیا کرتے ہیں یا بھول جایا کرتے ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن و دل پر لگے زخم گہرے ہوتے جا رہے تھے اور یادوں کے رنگ بھی تراب شاہ کو بھلانے میں اس نے خود کو بھلا دیا تھا مگر نہ بھولا تھا وہی ایک شخص باقی سب کچھ یادداشت سے مٹ گیا تھا۔

☆☆☆

وقت کے ساتھ لوگ کہتے تھے
زخم دل بھی تمہارے ہوں گے دور
آج ان کو کوئی خبر کر دو
میرا ہر زخم بن گیا ناسور

خوشان نے واپس آنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اسی لئے لائبہ کو بھی خط لکھ دیا تھا، جسے پا کر لائبہ خوش بھی تھی مگر ساتھ ہی بے طرح اداس بھی۔

خوشان صدیقی نے اسلام آباد ائیر پورٹ پر قدم رکھا تو گویا ہوائیں بھی اسے خوش آمدید کہنے لگیں اور جانے پہچانے راستوں سے گزرتے ہوئے خوشان صدیقی اکیلی نہیں تھی، تراب شاہ کی یاد کی صورت اس کے ساتھ تھا۔

مما اپنی لاڈلی کی گم صم حالت پر ازحد پریشان تھیں، ڈیڈی بھی اس کی اس حالت پر متحمل تھے انہوں نے اس کی بڑھتی ہوئی خاموشی، بے زاری اور اکتاہٹ کے پیش نظر ہی تو اسے امریکہ بھیجا تھا تا کہ ماحول کی تبدیلی ہی اس میں کوئی پوزیٹو چینج لے آئے، مگر جب سے وہ آئی تھی مما کی پریشانی دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی، حد درجے کی خاموشی، آنکھوں کی ویرانی اور تو اور آدھی آدھی رات کو اٹھ کر لان میں ٹہلنے کا شغف مما کو سراسیمہ کر گیا تھا، حالانکہ امریکہ سے انہیں اپنی فرسٹ کزن جن کے ہاں خوشان رہی تھی نے ہر بار ہی فرسٹ کلاس کی خبر دی تھی اور خود خوشان سے بھی جب بات ہوئی وہ انہیں خوش ہی لگتی، مگر اب مما پچھتا رہی تھیں کہ انہوں نے اسے خود سے دور کر کے غلطی کی تھی، وہ وجہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی جس کی بدولت ان کی پیاری بیٹی ذہنی و اعصابی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی تھی۔

☆☆☆

سمرینہ شاہ کو خاندان بھر میں امتیازی حیثیت دی جانے لگی تھی، سادات ہاؤس میں

سمرینہ کی حیثیت و اہمیت وہی تھی جو ایک من چاہی اکلوتی بہو کی ہوا کرتی ہے، اس کا حکم سر آنکھوں پر ہوتا اور کیوں نہ ہوتا آخر کو وہ شاہ فیملی کے لاڈلے سپوت کی منگیتر تھی، وہ خود تو اس دنیا میں نہیں رہا تھا مگر اس کی بدولت سمرینہ شاہ کا مقام متعین ہو گیا تھا اور اس تعلق کی بنیاد پر ہی سمرینہ شاہ کو سارے خاندان کی طرف سے عزت، احترام، محبت اور پیار ملا تھا۔

تلخ لہجے اور کڑوی زبان والی سمرینہ شاہ جسے تراب علی شاہ نے اپنے ماں باپ کی خواہش پر بغیر کسی تردد کے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے فیصلے پر سر جھکا دیا تھا اس وقت جب خاندان اور لمبی چوڑی برادری میں موجود لڑکوں نے دبے دبے انداز میں یا پھر بانگ دہل اس سے شادی سے انکار کر دیا تا اور وہ یہی سمجھتی رہی کہ اس کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر اس کی کالی گھنیری زلفوں کے پیچ وخم میں الجھ کر تراب علی شاہ اس کی محبت میں گرفتار ہے، تبھی تو وہ کس قدر مغرور ہو جاتی تھی، سرد مہر اور سب کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھنے والی سمرینہ شاہ اس وقت ہاتھ میں پکڑی تصویروں کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی بھلا خوشان صدیقی میں ایسی کیا بات ہے؟ کہ اس کی پہنچ تراب کی پرسنل ڈائری تک ہے۔

تصویروں کی پشت پر لکھے تراب کے خوبصورت تحریر میں اشعار اور کمنٹس اس لڑکی کے لئے اس کے دلی جذبات کے آئینہ دار تھے، محبت میں ناکامی تو اس کا مقدر رہی تھی، چاہے وہ تراب کو پا لیتی تب بھی، شکست تو اسی کا نصیب تھی، محبت ہمیں جینے کا ہنر دیتی ہے تبھی اس نے اپنے اردگرد بکھری سسکتی محبتوں کو ان کی منزل تک پہنچانے کا فیصلہ کیا تھا۔

سفید چادر میں لپٹی سمرینہ ایک بزرگ کی طرح خاندان بھر کے فیصلے کرنے کی مجاز تھی، لائبہ کی بیٹی معذور پیدا ہوئی، اظہر بھائی کے دوسرے بیٹے کے دل میں بھی سوراخ تھا، اسمارہ کے تلے اوپر چار بچے ہوئے مگر زیادہ عرصہ نہ جی سکے اور یہ سب نتائج کزن میرج کے شاخسانہ بتائے جا رہے تھے، مگر بڑوں کے آگے بولنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی اور سمرینہ شاہ سوچ رہی تھی کہ اب وقت آ گیا ہے کہ خواہ مخواہ کے رسم و رواج کا خاتمہ ہو، دین و مذہب کی روشنی میں زندگی کی راہیں استوار کی جائیں اور اپنی سوچ عملی شکل اس نے صالح کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے دی تھی، جو اپنے آفس کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا اور خود رامیہ بھی کئی برس پرانی منگنی کے باوجود اس سے شادی پر تیار نہ ہو سکی تھی، اس فیصلے پر جہاں مختلف قسم کے اعتراضات نے سر اٹھایا تھا، وہیں کچھ چہروں پر شادابی اور دلوں میں اطمینان اتر گیا تھا،

☆☆☆

مما خوبان کی ساس کے ساتھ کسی بزرگ کے مزار پر حاضری دینے جا رہی تھیں، انہوں نے خوشان کو بھی بمشکل راضی کیا تھا کہ وہ بھی چلے تاکہ ماحول اور آب و ہوا کی تبدیلی ہی اس پر اپنا خوشگوار اثر ڈال دے، پھر انہوں نے لائبہ سے ملنے کا پروگرام بھی بنا لیا تھا، کیونکہ ملتان وہاں سے تھوڑا ہی آگے تھا، لائبہ کے بچوں سے ملنے کا بھی اسے بہت اشتیاق تھا، یوں وہ بھی ان کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گئی۔

''حضرت شاہ'' کے مزار پر چادریں چڑھانے اور عرس میں شامل ہونے والوں کا تانا بندھا ہوا تھا اور آج تو شاہ صاحب کے دربار کے خاص مجاور نے سارے احاطے میں چراغ روشن کیے تھے اور یہ بہت حیران کن بات تھی، یہاں آنے والے جانتے تھے کہ سائیں تو ہمہ وقت مراقبے میں ہی رہتا ہے، کسی نے بھی اسے کبھی کسی سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا، آنے والے سائیں جی سے دعا کروانے آتے مگر بہت کم ایسا ہوا تھا کہ سائیں جی نے نظر اٹھا کر دیکھا ہو۔

سائیں جی تو چراغ روشن کرنے کے بعد اپنی جگہ بیٹھ کر پھر سے اپنے محبوب کی طرف متوجہ ہو گئے تھے، آنکھیں بند کیے گردن جھکائے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے سائیں جی کے ہونٹ تیزی سے حرکت کرنے لگے تھے۔

خوشان نے مما اور آنٹی رخسانہ کے ہمراہی میں درگاہ کے احاطے میں قدم رکھا تو گلاب، موتیے اور پھر اگربتیوں کی مہک ہوا میں رچی ہوئی تھی، لوگوں کی خاصی تعداد موجود تھی، جس نے خوشان کو الجھن ہونے لگی تھی، کجا کہ وہ اتنی بھیڑ میں گھس کر دونوں خواتین کے ساتھ آگے تک جاتی اس لئے دور سے ہی دعا وغیرہ پڑھ کر اس نے مما سے کہا تو آنٹی نے اسے برگد کے درخت کے پاس بنے بینچ پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے کو کہا۔

وہ بینچ پر بیٹھی بڑی سی چادر میں لپٹی سمٹ کر بیٹھی سوچوں کے جنگل میں بھٹک رہی تھی، لوگ اپنے اپنے من کی مراد پوری ہونے کی دعا کر رہے تھے مگر وہ سوچ رہی تھی۔

کیا
کوئی ایسی دعا بھی ہے
جو اس کے من کو شانت کر دے
اس کے دل سے تراب شاہ کی یاد کو نکال دے

کاش کوئی دعا کوئی ورد ایسا ہو
تراب شاہ جس کے کرنے سے میں تمہیں بھول جاؤں
کاش اے کاش

آنسو اس کی آنکھوں سے موتیوں کی لڑیوں کی صورت میں گر رہے تھے، وہ اردگرد سے بے نیاز شاید کسی معجزے کی منتظر تھی کہ اسے اپنے وجود پر گہری نظروں کا احساس ہوا تھا شاید وہ خود سے بھی بے خبر بیٹھی تھی گھبرا کر نظریں ادر گرد دوڑائیں مگر کون اتنا فارغ تھا کہ اس پر نظریں جما کر بیٹھ جاتا، مگر وہاں کوئی ہے تو ضرور، خوشان کی چھٹی حس پوری طرح کام کر رہی تھی، بینچ سے اٹھ کر چادر اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کر وہ آگے بڑھی تھی کہ ڈھیر سارے گلاب کے پھولوں نے اس کے قدموں کی سمت بدل دی۔

سفید براق لباس میں کاندھوں پر صاف ستھری شال ڈالے مودب انداز میں بیٹھے سائیں جی نے درخت سے ٹیک لگا رکھی تھی، ہونٹ ورد سے خالی تھے، آنکھیں ہنوز بند تھیں، بڑھی ہوئی داڑھی اور کاندھوں تک آئے کالے بال، کمزور جسم مگر حد درجے معصومیت و پاکیزگی لئے جو چہرہ خوشان صدیقی کے سامنے موجود تھا اسے تو وہ ایک پل میں ہی پہچان گئی تھی۔

''تراب شاہ۔'' خوشان کے ہونٹوں سے نکلنے والا نام فضا میں مرتعش ہوا تو چراغوں کی لو اور تیز ہو گئی، گلاب اور موتیے کی مہک کچھ اور بڑھ گئی، سرخ گلاب اور موتیے کی پاکیزگی میں نورانیت جھلکنے لگی، اس کے پاؤں تو زمین پر جم گئے اور دل کی دھڑکن سرپٹ دوڑنے لگی، شاید زمین کی گردش رک گئی تھی۔

''تراب......!'' اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سرگوشی کی تھی۔

''تراب! یہ دیکھو میں ہوں خوشان۔'' اس کا لہجہ خود بخود بھیگ گیا، آنسو اس کی آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔

اگلے ہی پل بند آنکھیں کھلیں، روشن جگمگ

کرتی آنکھوں نے آنسوؤں سے تر چہرے کا احاطہ کیا پھر اپنا گیلا ہاتھ دیکھا اور اپنے سینے پر رکھ لیا تھا، روشن آنکھیں ایک بار روشنی کی تلاش میں اندھیروں کے سفر پر روانہ ہو گئی تھیں اور ادھر خوشان کے ہونٹوں سے ایک ہی نام نکل رہا تھا، تراب شاہ......تراب شاہ۔

''بیٹا کیوں تنگ کرتے ہو سائیں کو؟ جنہیں روحانی روشنی مل جائے ناں انہیں مادی دنیا کے اندھیروں میں نہیں گھسیٹتے، عشق الٰہی اور عشق حقیقی تک رسائی آسان نہیں اور جنہیں قرب خدا نصیب ہو جائے ان کے لئے اس فانی دنیا میں کوئی کشش نہیں رہتی۔'' دربار کے گدی نشین نے نرمی سے اسے سمجھایا اور سسکتی ہوئی خوشان کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''مگر یہ یہاں؟'' سوال خود بخود لبوں سے نکلا تھا۔

''چند سال پہلے ہائی وے کے نزدیک زخمی حالت میں ملا تھا، شاید حادثے کے وقت اپنی جان بچانے کے لئے گاڑی سے چھلانگ لگانے سے سر پر شدید چوٹ کی بدولت یا پھر موروثی اعصابی کمزوری کی وجہ سے یہ اپنی سمجھ بوجھ اور یادداشت سے ہاتھ دھو بیٹھا، اپنے طور پر تو ہم نے اس کے وارثوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی، اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اس کے بارے میں جاننے میں مدد ملتی، پھر ظاہر سی بات ہے ہم اسے یہاں لے آئے اور چند دنوں میں ہی ہمیں ادراک ہو گیا کہ بندہ اپنے اصل تک پہنچ گیا، اٹھو بیٹا اور اپنی منزل کی طرف جاؤ یہ تو اب اور راستے کا مسافر ہے۔'' وہ خوشان پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولے، شاید وہ ادراک کی سیڑھیاں ایک ہی جست میں پھلانگ گئے تھے کہ یوں بیٹھی اس بے حال سی لڑکی کا کیا تعلق ہے اس سائیں کے ساتھ۔

واپسی کے لئے پلٹتے ہوئے خوشان صدیقی اپنی روح وہیں کہیں چھوڑ آئی تھی۔

☆☆☆

رات کو خوشان صدیقی کی آنکھیں بند ہوتے ہی گویا روشنی روح تک در آئی تھی، برگد کے درخت تلے وہ تراب علی شاہ سے ڈھیروں باتیں کیا کرتی تھی، چراغ جلاتی، موتیے کی کلیاں پروتی، کبھی ہنستی، کبھی روتی، کبھی تتلیوں اور کبھی جگنوؤں کے پیچھے بھاگتی۔

پھر وہ تھک گئی اور ایک رات تتلیوں کے تعاقب میں نکلی تو وہ واپسی کا راستہ ہی بھول گئی، ایسی پرسکون نیند سوئی کی آنکھوں پر کسی خواب کا بوجھ نہ تھا، اس رات کی صبح، صدیقی ولا میں بہت عرصے بعد سب جمع تھے، نم آنکھوں اور دکھے دل سمیت سب خوشان صدیقی کی جوان موت پر اشکبار تھے، اس کی تعریفیں کر رہے تھے، اسے یاد کر رہے تھے اور ان سب سے بے نیاز خوشان صدیقی کے لبوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ لئے آنکھیں بند کیے آخری منزل پر جانے کے لئے تیار تھی۔

اور کسی کو بھی خبر نہ ہو سکی کہ شام کے لوکل اخبار کے ایک کالم میں ایک چھوٹی سی خبر بھی تھی۔

''حضرت شاہ کے مزار پر ہی رہنے والے سائیں کی حرکت قلب بند ہو جانے سے موت واقع ہو گئی، کہا جاتا ہے کہ......'' اس کے آگے وہی لکھا تھا جو ایسے موقع پر اخبار والے لکھتے ہیں، مگر کوئی نہیں جانتا تھا دو الگ الگ راہوں کے مسافر آخر کو اپنی ایک منزل کی طرف رواں ہو گئے تھے، ایک عشق حقیقی کے ذریعے اور دوسرا عشق مجازی کے لیکن جاتے ہوئے دونوں ہی سرخرو تھے۔

☆☆☆

''چلو نیچے کب سے آوازیں دے رہی ہوں مگر تم تینوں سنتے ہی نہیں۔'' زرش نے چھت کی ریلنگ سے نیچے دیکھتے ہوئے اپنے تینوں بچوں سے کہا، جو بہت مگن اور خوش نظر آ رہے تھے، اسی لئے انہیں خبر ہی نہیں ہوئی تھی کہ کب زرش سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی تھی۔

''بس مما آنے ہی لگے تھے مگر......'' آٹھ سالہ میناہل نے کچھ کہتے کہتے رک کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا تھا، جو اس کی ادھوری بات کو سمجھ چکی تھی اور اس کی دلچسپی کا مقصد بھی جانتی تھی۔

''میناہل! آپ کے پاپا آنے والے ہیں، کومل اور آدم کو لے کر نیچے چلو، میں آ رہی ہوں۔'' زرش نے سنجیدگی سے کہا، تینوں بچے سر ہلا کر خاموشی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے تھے، زرش نے نیچے سے آتی آوازوں اور شور پر ریلنگ کے نیچے جھانکا تھا، ٹرک سے سامان اتر رہا تھا، مزدور سامان اتار اتار کر اندر رکھ رہے تھے، سامان اٹھانے اور گھسیٹنے کی آوازیں مل کر عجیب سا شور پیدا کر رہی تھیں۔

''ہوں، نئے کرائے دار آ گئے ہیں۔'' زرش نے گہری سانس لی اور کسی سوچ میں ڈوبی نیچے اتر آئی، کومل اور آدم ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے مگر ان کی توجہ ٹی وی سے زیادہ باہم کھیلنے میں تھی، جبکہ میناہل اپنی ڈرائنگ بک پر جھکی ہوئی تھی، زرش تینوں کو مصروف دیکھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''مما نئے کرائے دار آ گئے ہیں، کیا ہمیں نیچے لان میں جانے کی اجازت ملے گی۔'' میناہل نے وہ سوال پوچھ ہی لیا جو کافی دیر سے اس کے ذہن میں کلبلا رہا تھا، کیونکہ ہر بار ایسا ہی ہوتا تھا، کرائے داروں کے آتے ہی ان تینوں کا نیچے بڑے سے لان میں جانا منع ہو جاتا تھا۔

''میناہل اپنے پاپا سے پوچھ لینا مجھے کیوں تنگ کر رہی ہو۔'' اپنی ہی سوچوں میں پھنسی زرش نے چڑ کر جواب دیا تھا اور کچن میں جاتے ہوئے اس کی نظر اس کھڑکی پر پڑی جس سے نیچے والے پورشن کا ٹی وی لاؤنج صاف نظر آتا تھا، زرش نے پاس جا کر اچھی طرح جائزہ لیا، کھڑکی مضبوطی سے بند تھی، مداخلت کا امکان نہیں تھا، زرش اطمینان بھری سانس لیتی کچن میں چلی گئی۔

☆☆☆

''کیوں رخشندہ بیگم مانتی ہیں ہمیں اتنے کم کرائے میں اتنا بڑا اور عالیشان گھر ڈھونڈنا ہمارا ہی کام تھا۔''

قیوم صاحب نے اپنی باریک سی آواز میں کہتے ہوئے فخریہ گردن اکڑائی تھی، درمیانے قد وقامت کے قیوم صاحب کی شخصیت دیکھنے میں ہی کافی مظلوم اور مسکین ٹائپ لگتی تھی اوپر سے باریک آواز اور جی حضوری والا انداز، ان کی شخصیت کو مزید کمزور بنا کر پیش کرتا تھا۔

رخشندہ بیگم پچاس سے پچپن کے لگ بھگ، سرخ وسفید رنگت کی مالک، اونچا لمبا قد و قامت اور فربہی مائل جسم کے ساتھ ساتھ بہت بارعب خاتون بھی تھیں، کچھ جوانی میں ان کے حسن کا رعب اور کچھ ان کی دبنگ شخصیت کے سامنے قیوم صاحب بالکل ہی اپنا آپ چھوڑ بیٹھے تھے، اسی لئے ان کا گزارہ بہت اچھے طریقے سے ہوا تھا، دونوں کے پانچ بچے تھے، بڑے دو بیٹے شادی شدہ اور دیار غیر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش وخرم آباد تھے، خوش وخرم بھی اسی لئے کیونکہ ماں اور بہنوں سے دور تھے، ورنہ جب تک ان کی بیویاں یہاں پر رہتی تھیں زندگی میدان جنگ کا منظر پیش کرتی تھیں، ماں بیٹیوں نے مل کر ایسے ایسے سازشی کھیل رچائے تھے کہ کیا انڈین سوپ سکھاتے یاد کھاتے ہوں گے۔

دراصل ہماری مڈل کلاس، گھریلو خواتین کو آگے بڑھنے کے موقع نہیں ملے ہوتے اسی لئے ان کے دماغ کی ساری زرخیزی اور توانائی گھریلو سیاست اور سازشوں میں استعمال ہوتی ہے۔

دونوں بیٹیاں خیر سے شادی شدہ اور اسی شہر میں آباد تھیں اسی لئے تو آئے روز میکے کا رخ کیے رکھتی تھیں، جہاں ان کے آنے پر بھابھیوں کی تیوریاں چڑھ جاتی تھیں اور وہاں ہی دوسری طرف ان کے میکے جانے پر شوہر اور اس کے گھر والے شکر کا کلمہ پڑھتے تھے اور جتنے دن وہ میکے رہتی تھیں ان کے سسرال میں ہر دن عید کا اور ہر رات شب برات ہوتی تھی، خوشی ہی اتنی ہوتی تھی کہ سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی اور ان کے واپس آتے ہی سب چپ کی بکل اوڑھے، طبل جنگ کا انتظار کرتے رہتے تھے۔

یہ تو تھیں شادی شدہ بیٹیوں کی کہانی، اب آتے ہیں سب سے چھوٹی اور موٹی (اس لئے کہ قد وقامت میں باپ پر گئی تھی، مگر موٹاپے پہ ماں پر) نازیہ کی طرف، جس کی عمر تیس تھی مگر شادی نہ ہونے کی وجہ سے وہ پچیس سے اوپر نہیں جاتی تھی۔

بڑی دونوں کی باری بھی رشتے ڈھونڈنے میں دانتوں تلے پسینہ آ گیا تھا، مگر نازیہ عرف نازی کا رشتہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے، رخشندہ بیگم تھک ہار کر مایوس ہونے لگی تھیں، ان دونوں ماں بیٹی کا خیال تھا کہ اس کے حسن سے جل کر (جو پہلے ہی جلا ہوا تھا) رشتے داروں نے تعویذ کروا دیئے ہیں، رشتے پر بندش ہے، نازی خود کو کسی بھی طرح حسینہ عالم سے کم نہیں سمجھتی تھی اس لئے بھی کسی طرح بھی اپنے آئیڈیل سے کم پر تیار نہیں ہوتی تھی اور اسی وجہ سے اس کے ہاتھوں سے جوانی کا سنہرا ریشم پھسلتا جا رہا تھا۔

''ہوں گھر تو سچ میں کافی اچھا اور بڑا ڈھونڈ لیا ہے، مگر عجیب سی خاموشی اور ویرانی ہے یہاں، سنا ہے اوپر والے پورشن مالک مکان نے اپنے پاس ہی رکھا ہے، صرف نیچے والا ہی ہمیں استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔''

رخشندہ بیگم نے نازی کے ساتھ سارے گھر کا جائزہ لیتے ہوئے، لاؤنج کے کونے میں بنی اوپر کے پورشن کی طرف جاتی سیڑھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا، یہ لاؤنج بہت بڑا تھا اور سیڑھیاں بالکل کونے میں تھیں، باقی گھر سے اس حصے کا کوئی تعلق نہیں تھا، کیونکہ یہ گھر بہت بڑا اور وسیع تھا۔

''بیگم ہمارے لئے نیچے کا پورشن بھی کافی ہے، ہم تین ہی تو بندے ہیں، ویسے بھی ہم نے کچھ عرصہ ہی یہاں رہنا ہے، جب تک ہمارا گھر بن نہیں جاتا ہے، میں تو حیران ہوں کہ اتنے عالیشان گھر کا، اتنا کم کرایہ، مالک مکان ملک سے باہر ہے، اسی لئے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، جتنا بھی کرایہ ہو۔'' قیوم صاحب نے پراپرٹی ڈیلر کے لفظ دہراتے ہوئے فخریہ کہا تھا، وہ اپنے کارنامے پہ کچھ زیادہ ہی اکڑ رہے تھے اور یہ بات رخشندہ بیگم کو کچھ زیادہ بھا نہیں رہی تھی۔

''خیر ایسا بھی کوئی کارنامہ سر انجام نہیں دے دیا، مانا کہ یہ شہر کا پوش ایریا ہے مگر یہ گھر کچھ ہٹ کر بنا ہوا ہے اور پھر اتنا بڑا کہ بندہ اس میں گم ہو کر رہ جائے۔''

رخشندہ بیگم نے قیوم صاحب کے خوشی کے غبارے سے ہوا نکالتے ہوئے کہا تھا۔

''اماں آپ نے دیکھا تھا اس عورت اور بچوں کو کیسے ہمیں دیکھ کر فوراً پیچھے ہٹ گئے تھے،

ریلنگ سے، کوئی تمیز طریقہ ہی نہیں ہے کہ ہم لوگ نئے آئے ہیں، یہ ہی پوچھ لیتے کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔" نازی نے اوپر نظر کی تو اسے چھت پہ کھڑی ایک عورت اور بچے نظر آئے تھے، مگر ان کو دیکھتے واپس اندر چلے گئے تھے، نازی کو یہ بات بہت بری لگی تھی اور اس کا منہ پھول گیا تھا۔

"دفع کر...... بڑا علاقہ ہے ناں، یہاں کے لوگوں کے بھی دماغ بڑے ہوں گے، تو بھی اب پرانے اور چھوٹے محلوں جیسی سوچ چھوڑ دے، خیر سے ہمارا گھر بھی اسی پورش ایریے میں بننے والا ہے، ابھی سے سیکھ لے ان جیسی حرکتیں کرنا۔" رخشندہ بیگم نے بیٹی کو سمجھایا تھا جو برے برے منہ بنا کر رہ گئی تھی، دونوں بیٹوں کے منی آرڈرز بہت باقاعدگی سے آتے تھے، جن سے رخشندہ بیگم نے کمیٹیاں ڈال کر اتنا جوڑ لیا تھا کہ کسی بھی اچھے ایریے میں گھر لے سکتے تھے، اسی لئے انہوں نے اپنا آبائی گھر فروخت کر کے پہلے سے خریدے گئے پلاٹ پر تعمیری کام شروع کروا دیا تھا، وقتی رہائش کے لئے اسی جگہ کو ترجیح دی گئی تا کہ پاس رہ کر اپنی نگرانی میں کام کروایا جا سکے۔

شومئی قسمت ان کے پلاٹ سے کچھ دور ہی انہیں اسی ایریے میں بنا یہ دو کنال کا گھر بہت کم کرائے پر مل گیا تھا۔

سدا بچت کے شوقین اور کنجوس میاں بیوی نے کم کرائے کی وجوہات پر غور کیے بغیر اور آس پاس والوں سے پوچھے بغیر چھ ماہ کے ایڈوانس کرائے پر یہ گھر لے لیا تھا اور اب اس بڑے سے گھر میں پھرتے دونوں اپنی کامیابی پر پھولے نہیں سما رہے تھے، مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی لاپروائی اور چشم پوشی کتنی بھاری پڑنے والی تھی ان سب پر۔

☆☆☆

زرش نے کمرے میں جھانکا، تینوں بچے سو چکے تھے، زرش نے ان کے کمرے کی لائٹ آف کی اور اپنے کمرے میں آ گئی، بیڈ پہ دراز احمد ایک بازو آنکھوں پر رکھے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آج اتنی جلدی نیند آ گئی؟" زرش نے لحاف کھول کر احمد کے اوپر ڈالا اور نائٹ بلب جلا کر خود بھی سونے کے لئے لیٹ گئی تھی۔

"ہوں! آج بہت تھک گیا ہوں۔" احمد نے نیند میں ڈوبی آواز میں کہا۔

"آپ کو پتا ہے کہ نئے کرائے دار آ گئے ہیں۔" زرش نے کہنی کے بل احمد کی طرف منہ کرتے ہوئے بتایا تھا۔

"ہوں! کافی عرصے سے نیچے والا پورشن خالی پڑا ہوا تھا ایک نہ ایک دن تو کرائے دار آنے ہی تھے۔" احمد نے تفصیل سے جواب دیا تھا۔

"میناہل کے وہ ہی سوالات، کیا جواب دوں اسے؟ بچے ہیں ڈر بھی سکتے ہیں۔" زرش نے اپنی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"تم پریشان مت ہو، میں بچوں کو ہینڈل کر لوں گا، میناہل میری بات سمجھ جائے گی۔" احمد نے غنودگی میں اپنی محبوب بیوی کو تسلی دی تھی، تو زرش آنے والے وقت کے بارے میں سوچتے سوچتے خود بھی نیند کی وادی میں اتر گئی تھی۔

☆☆☆

نازی بڑے سے لان کا بہت غور سے مشاہدہ کر رہی تھی، لان کی مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کے باوجود لان میں مختلف رنگوں کے پھول کھلے ہوئے تھے، لان کے بیچ میں بہت خوبصورت سنگ مرمر کا فوارہ بھی لگا ہوا تھا، نازی لان میں چکر لگا رہی تھی جس وقت اس کی نظر

سامنے والے ٹیرس پر پڑی، جو یہاں سے صاف نظر آتا تھا، نازی نے اپنی ہم عمر لڑکی کو بچوں سمیت دیکھا، اسے دیکھ کر لڑکی نے بچوں کو اندر بھیج دیا تھا، اسی اثناء میں اس کا شوہر آ گیا دونوں عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے باتیں کرتے وہاں سے ہٹ گئے تھے۔

"عجیب لوگ ہیں یہاں کے، ملنا تو دور کی بات سلام کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔" رخشندہ بیگم لان چیئر پر آ کر بیٹھیں تو نازی برا سا منہ بناتی ماں سے مخاطب ہوئی تھی، جو تھوڑا سا چلنے کی وجہ سے ہی پھولی سانسوں کے ساتھ بولنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"لوگوں کو مار گولی، پہلے کسی کام والی کا بندوبست کرنا پڑے گا، اتنے بڑے گھر کی صفائی ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔" رخشندہ بیگم نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تھا، نازی کو کام کرنے کی عادت نہیں تھی، اکیلے ان سے کام ہوتا نہیں تھا۔

"اماں! یہاں کوئی ہمیں جانتا نہیں ہے اور نہ ہم کسی کو، آس پاس کے گھروں سے ملنا ملانا ہو گا تو کام والی بھی مل جائے گی اور ہو سکتا ہے کوئی اچھا اور امیر گھر سے رشتہ بھی مل جائے۔" نازی نے دور کی کوڑی لائی تھی، اماں نے بے زاری سے سر جھٹکا تھا۔

"اماں کیا مصیبت ہے، آپ غریبوں کے محلے گلیوں سے نکل آئیں ہیں، جہاں ایک گھر کا خبر سب کو ہوتی ہے، کون آ رہا ہے کون جا رہا ہے، یہ شہر کا مشہور اور مہنگا علاقہ ہے یہاں کے طور طریقے بھی ذرا اور طرح کے ہوں گے، میرے خیال سے تو ایسا کرتے ہیں کل کوئی اچھی سی ڈش بنا کر آس پاس کے گھروں میں دے کر آتے ہیں اس طرح انہیں ہمارا اور ہمیں ان کا پتا چل جائے گا۔" نازی نے اماں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"لو اب پڑوسیوں سے تعلقات بنانے کے لئے فضول کا خرچہ کرنا پڑے گا، یہ کیا بات ہوئی بھلا؟" رخشندہ بیگم نے نیم رضا مندی سے جواب دیا تھا، دونوں ماں بیٹی حسب عادت بہت زور و شور سے گفتگو کرنے میں مگن تھیں، یہ جانے بغیر کے کسی اور کے کانوں میں بھی ان کے الفاظ پڑ رہے تھے۔

"چلو جی کل سے ایک اور نیا تماشا شروع ہونے والا ہے، ہمیشہ کی طرح سے۔" زرش جو اپنے ٹیرس پر بیٹھی سبزی بنا رہی تھی، نیچے سے آتی آوازیں سن کر منہ بنا کر خود سے بولی تھی اور پھر سبزی کی ٹوکری اٹھا کر کچھ سوچ کر مسکراتے ہوئے اٹھ گئی، آنے والی صبح اس کی سوچ اور توقع کے مطابق ثابت ہوئی تھی۔

☆☆☆

"ہائے ہائے قیوم صاحب، کس جنم کا بدلہ لیا ہے جو ہم معصوم ماں بیٹی کو یہاں لے آئے۔" رخشندہ بیگم جو نازی کے ساتھ ابھی ابھی پڑوس کے گھروں سے ہو کر آئی تھیں اور وہاں سے ملنے والی معلومات نے دونوں ماں بیٹی کے اوسان خطا کر دیئے تھے، اب دونوں لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی زور و شور سے قیوم صاحب کی جلد بازی پر تبصرے کر رہی تھیں۔

زرش نے نیچے سے آتی آوازوں پر لاؤنج کی طرف کھلنے والی کھڑکی جو ذرا سی کھلی ہوئی تھی، کو مضبوطی سے کھینچ کر بند کرنا چاہا، مگر پھر بھی وہ ذرا سی کھلی رہ گئی تھی، زرش کو ڈر تھا کہ کہیں بچے کچھ نہ سن لیں، بچوں کو سمجھانا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔

"آج آ جائے تمہارا باپ، کرتی ہوں اس سے بات خود تو صبح کے نکلے شام ڈھلے گھر آتے

ہیں، پیچھے اتنے بڑے اور خوفناک گھر میں ہم ماں بیٹی تنہا پڑے رہتے ہیں۔'' رخشندہ بیگم غصے سے پیچ وتاب کھا رہی تھیں، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح قیوم صاحب ان کے سامنے آ جائیں۔

''اب کیا ہو گا؟'' نازی نے خوفزدہ سے لہجے میں ماں سے پوچھا۔

''تو پریشان مت ہو بچی، تیری ماں ابھی زندہ ہے۔'' رخشندہ بیگم نے نازی کا اڑا ہوا رنگ دیکھا تو اسے گلے لگا کر تسلی دینے لگی۔

''اتنی دبنگ خاتون کے سامنے، دم مار بھی کون سکتا ہے۔'' زرش نے کھڑکی ٹھیک سے بند نہ ہونے کی ناکامی کا غصہ خود کلامی کر کے نکالا تھا، اسی وقت قیوم صاحب کی بائیک کی آواز سنائی دی، بیرونی گیٹ کی چابی ان کے پاس تھی، جسے کھول کر وہ خود ہی دروازہ کھول کر اندر آ جاتے تھے۔

''کیا بات ہے آج ماں بیٹی میں بڑا جذباتی سین چل رہا ہے۔'' قیوم صاحب نے اندر آتے ہوئے کہا، نازی ماں سے لپٹی بیٹھی ہوئی تھی، قیوم صاحب تھکے ہارے سے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔

''اب آپ کی باری ہے اس جذباتی سین کا حصہ بننے کی۔'' زرش نے جل کر سوچا تھا اور کھڑکی کی باریک درز سے نیچے جھانکا تھا، جہاں سے وہ تینوں صاف نظر آ رہے تھے۔

''قیوم صاحب! آپ نے اچھا نہیں کیا اس عمر میں میرے ساتھ۔'' رخشندہ بیگم دانت کچکچاتے ہوئے بولیں تھیں۔

''مگر میں نے ایسا کیا کر دیا بیگم؟'' قیوم صاحب اس الزام پہ ایک دم ہی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

''بس رہنے دیں اتنے بھی معصوم مت بنیں آپ، جیسے کچھ پتا ہی نہیں ہے۔'' رخشندہ بیگم کا انداز جلالی تھا۔

''آخر پتا تو چلے کہ ہمارا قصور کیا ہے؟ کیوں آج مزاج گرامی سوا نیزے پر ہے؟'' قیوم صاحب نے سر سے ٹوپی اتارتے ہوئے پوچھا تھا۔

''آج میں اور نازی خاص طور پر کھیر بنا کر پڑوس کے گھروں میں گئے اور وہاں جا کر جو ہمیں پتا چلا اس نے تو ہمارے ہوش ہی اڑا دیئے۔'' رخشندہ بیگم بولنا شروع ہوئیں۔

''اوہ اچھا سمجھ گیا، تو آپ دونوں اس وجہ سے پریشان ہو رہی ہیں۔'' قیوم صاحب کی سمجھ میں اصل کہانی آ گئی تھی، اسی لئے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے آرام دہ حالت میں بولے۔

''اچھا تو آپ سب کچھ جانتے تھے، یعنی میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔'' رخشندہ بیگم نے خشمگیں نظروں سے انہیں گھورا تو وہ گڑبڑا کر رہ گئے۔

''نہیں نہیں بیگم صاحبہ! آپ کے سر کی قسم، مجھے تو خود یہاں آ کر پتا چلا تھا، جس جس کو پتا چلا وہ حیران ہو کر یہ ہی پوچھتا ہے کہ آپ لوگ ''آسیب زدہ'' گھر میں رہتے ہیں اور ایسے گھورتے ہیں جیسے خدانخواستہ ہم خود ہی آسیب ہیں۔''

قیوم صاحب جو اکیلے ہی اتنے دنوں سے لوگوں کی باتیں اور رویے برداشت کر رہے تھے سب کچھ بتاتے ہوئے بولے۔

''اور کیا پڑوس کے گھروں نے بھی یہ ہی بتایا ہے کہ یہ گھر کبھی بھی زیادہ عرصے کے لئے آباد نہیں ہوا ہے، جو بھی آیا ہے نقصان اٹھا کر ہی

گیا ہے، اس گھر کے آسیب بہت خطرناک ہیں، ہائے کہیں میری جوان اور خوبصورت بیٹی پہ آسیب کا دل آ گیا تھا؟'' رخشندہ بیگم نے نازی کو خود سے چمٹاتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں کہا تھا، ڈرنے کے باوجود اپنے لئے جوان اور خوبصورت جیسے الفاظ سن کر نازی اندر ہی اندر خوشی سے سرشار ہو گئی۔

''استغفار! بٹی خوبصورت ہو گی تو کسی کا دل آئے گا ناں، لوگ بھی کیسی کیسی فرضی کہانیاں بنا لیتے ہیں۔'' زرش نے ان کا ڈرامہ طویل ہوتے دیکھ کر اکتائے ہوئے سوچا تھا اور واپس اندر کی طرف مڑ گئی تھی۔

''ہاں بیگم! میں نے بھی لوگوں سے کم وبیش ایسی ہی باتیں سنی ہیں، مگر تم ڈرو مت، لوگ کہانیاں بھی بنا لیتے ہیں، وہ تمہارے سامنے ہی تو اوپر والی منزل پہ میاں بیوی بچوں سمیت رہتے ہیں، اس کا شوہر ملا ہے مجھے کئی بار، بتا رہا تھا کہ کافی عرصے سے ہیں یہاں پر، اگر ایسی ویسی کوئی بات ہوتی تو وہ لوگ بھی چھوڑ کر چلے جاتے۔'' قیوم صاحب نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں مگر ابا، وہ تو بہت نک چڑھی سی عورت ہے آج دونوں میاں بیوی اپنے ٹیرس پر کھڑے ہمیں دیکھ کر باتیں کر رہے تھے۔'' نازی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! تم خود ہی ان سے سلام دعا کرو، ان سے دیوار سے دیوار ملتی ہے، وہ ہی ٹھیک سے بتا سکتی ہے۔''

''ہاں کہتے تو آپ ٹھیک ہیں میں نے بھی بہت بار، ادھر سے ادھر اسے کام کرتے ہوئے دیکھا ہے، کافی مغرور سی لگتی ہے، وہ تو کسی کی طرف دیکھتی بھی نہیں ہے۔'' رخشندہ بیگم نے تائید بھی کی اور ایک ایک اعتراض بھی جڑ دیا تھا، اندر سے خوفزدہ ہونے کے باوجود ان کی کچھ تسلی بھی ہوئی تھی۔

''اور ویسے بھی ہم نے چھ مہینے کا ایڈوانس کرایہ دیا ہوا ہے اور تقریباً اتنا ہی وقت ہمارے گھر کی تعمیر میں لگے گا۔''

نازی بہت خوفزدہ نظروں سے ادھر سے ادھر دیکھتی ماں باپ کو سن رہی تھی، اس کے ذہن میں بہت سی فلموں اور ڈراموں میں دیکھے گئے سین گھوم رہے تھے، خوف کی لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی تھی، نازی نے دوپٹہ اچھی طرح سر پہ لپیٹ لیا اور ہل ہل کر مختلف سورتیں پڑھ کر خود پر دم کرنے لگی۔

☆☆☆

مینا ہل! آدم اور کومل کے ساتھ چھت پر بال سے کھیل رہی تھی، جب ایک زوردار ہٹ سے بال اڑتی ہوئی سیدھا لان میں واک کرتی نازی کے سر سر جا لگی، بچے یہ دیکھ کر ڈر گئے، مینا ہل نے آدم اور کومل دونوں کو منع کیا کہ مما کو نہیں بتانا ہے، جب آنٹی اندر چلی جائیں گی تو وہ خود جا کر بال لا دے گی۔

وہ تینوں خاموشی سے ٹی وی کے سامنے آ کر بیٹھ گئے تھے، کپڑے استری کرتی زرش نے اتنی خاموشی اور شرافت سے تینوں کو بیٹھے دیکھا تو حیران نظروں سے دیکھتی، کندھے اچکا کر رہ گئی۔

جبکہ مینا ہل نے چور نظروں سے ماں کی طرف دیکھا تھا، ماں کو مصروف دیکھ کر اس کا ارادہ چپکے سے بال واپس لانے کا تھا۔

مگر ابھی حالات سازگار نہیں تھے، اس لئے وہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

☆☆☆

نازی جو بہت مزے سے لان میں ادھر سے ادھر چکر لگاتی، ٹھنڈی ہوا کے مزے لے رہی

تھی، اس دن کی باتوں کا اثر بہت کم ہو چکا تھا اس لئے نازی بہت آرام اور مزے سے سارے گھر میں پھر رہی تھی۔

اسی وقت نیلے رنگ کی بال بہت زور سے اس کے سر پر لگی تھی، نازی سمجھی کہ ٹیرس پر سے بچوں کے کھیلنے اور بولنے کی آوازیں کافی دیر سے آ رہی تھیں، یہ بال بھی ان کی ہی ہو گی، مگر جب اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو اسے ٹیرس پر کوئی نظر نہیں آیا، نازی نے حیران نظروں سے سامنے والے ٹیرس کو دیکھا تھا، جہاں اکثر عورت اور اس کے بچے نظر آتے تھے، مگر آج وہ خالی پڑا ہوا تھا، اچانک اس کے ذہن میں آسیب کا خیال آیا اور وہ خوفزدہ سی ہو کر بال وہاں ہی پھینک کر اندر کی طرف بھاگی۔

''اماں......!'' پھولی سانسوں کے ساتھ نازی نے ماں کو آواز دی تھی۔

''کیا ہوا ہے کیوں اتنے زور سے چلا رہی ہو، ڈر کے میرے ہاتھ سے پتیلی چھوٹ گئی۔'' زخشندہ بیگم نے کچن سے نکلتے ہوئے غصے سے پوچھا تھا۔

''اماں...... میں لان میں چکر لگا رہی تھی کہ آسیب نے مجھے بال دے ماری، سچ میں اماں، یہاں ضرور کچھ ہے۔'' نازی نے خوفزدہ لہجے میں کہا تو رخشندہ بیگم ٹھٹک کر رہ گئیں۔

''باؤلی ہوئی ہے کیا؟ آسیب کیا فٹ بال کھیلتے ہیں، یا تجھے پھینک کر چیک کر رہے تھے کچھ عقل سے بھی کام لیا کر، غور سے دیکھ آس پاس کے کسی گھر سے آئی ہو گی۔'' اماں نے اکیلے کام کرنے کا سارا غصہ نازی پر نکالتے ہوئے کہا تھا۔

''قیوم صاحب سے کہوں گی آج بازار سے کچھ لے آئیں، ہمت نہیں کچھ پکانے کی، چل اب آ جا ڈرامے کا ٹائم ہونے والا ہے۔'' زخشندہ بیگم نے رات کا کھانا بنانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے، لاؤنج کے صوفے میں دھنستے ہوئے نازی کو بھی آواز دی، دونوں ماں بیٹی انڈین سوپ ڈراموں کی دیوانی تھیں۔

نازی نے سر ہلاتے ہوئے ٹی وی آن کیا، ڈرامے میں پوجا بھٹ کا کوئی سین چل رہا تھا، ٹی وی کا والیوم بہت اونچا تھا، سارے گھر میں بھجن کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

کچھ دیر گزرنے کے بعد نازی کو اچانک خیال آیا کہ وہ جلدی میں داخلی دروازہ بند کر کے نہیں آئی تھی، نازی اٹھی اور اس کا اندازہ درست نکلا، داخلی دروازہ کھلا ہوا تھا، نازی نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کرنا چاہا جب اس کی نظر بے خیالی میں ہی لان کے اس حصے پر پڑی، جہاں وہ بال چھوڑ کر خوفزدہ ہو کر بھاگی تھی، وہ بری طرح چونک گئی تھی، لان میں بال موجود نہیں تھی، خوف کی شدید لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔

''اماں......!'' وہ بے اختیار چیختی ہوئی اندر بھاگی تھی۔

☆☆☆

''آدم یہ بال......'' میناہل نے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے آدم کو دیکھا جس کے ہاتھوں میں نیلے رنگ کی بال تھی۔

''آپی ان کا دروازہ کھلا ہوا تھا تو میں جلدی سے بھاگ کر لے آیا۔'' آدم نے فخریہ اپنا کارنامہ بتایا تھا۔

''اچھا چپ مما سے مت کہنا، ورنہ وہ ڈانٹیں گی بغیر اجازت کسی کے گھر جانے پہ۔'' میناہل نے بھائی کو سمجھایا تو وہ سمجھداری سے سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

زرش نے مغرب کی نماز پڑھ کر سلام پھیرا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے مگر نیچے سے اونچی آوازیں اس کے ارتکاز کو توڑ رہی تھیں۔

پوجا بھٹ اور بھجن کی تیز آوازیں بڑے سے گھر میں گونج رہی تھیں، زرش جھنجھلاہٹ میں توبہ واستغفار کرتی وہاں سے اٹھ گئی۔

''دونوں ماں بیٹی کو ذرا بھی ہوش نہیں ہے کہ نماز کا وقت ہے۔''

زرش جلتی کلستی کچن میں آ کر چائے کا پانی رکھنے لگی کیونکہ احمد اسی وقت اندر داخل ہوا تھا، احمد کے نماز پڑھنے تک زرش چائے بنا کر لے آئی، احمد تینوں بچوں کو پاس بٹھائے باتیں کر رہا تھا زرش بھی کپ پکڑا کر پاس ہی بیٹھ گئی۔

''پاپا! پتا ہے آج میں نے کیا کیا؟'' آدم نے معصومیت سے باپ کو متوجہ کیا اور بال لانے کی ساری کہانی سنانے لگا۔

''اُف آدم! میں نے منع کیا تھا ناں کہ......'' میناہل نے آدم کو غصے سے ٹوکتے ہوئے گھورا تھا، مگر ماں کے چہرے پر نظر پڑتے ہی چپ ہو گئی، زرش کے چہرے پر خفگی نمایاں تھی اور وہ تیز نظروں سے تینوں کو گھور رہی تھی۔

''آپی آپ نے مما کو بتانے سے منع کیا تھا، پاپا کو تو نہیں۔'' آدم نے معصومیت سے کہا تو احمد بے ساختہ ہنس پڑا، زرش کے چہرے پر بھی مسکراہٹ در آئی جسے چھپانے کے لئے اس نے سر جھکا لیا تھا، احمد نے آدم کو اٹھا کر بے ساختہ پیار کیا تھا۔

''میں نے منع کیا ہوا ہے ناں آپ تینوں کو پھر بھی۔'' زرش نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''سوری مما، ہم نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا۔'' میناہل نے شرمندگی سے کہا تو احمد نے زرش کو آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود بچوں سے باتیں کرتا انہیں دھیرے دھیرے سمجھانے لگی۔

زرش جانتی تھی کہ بچے باپ سے زیادہ قریب ہیں اور اس کی سنتے بھی زیادہ ہیں، وہ خاموشی سے چائے کے سیپ لینے لگی۔

☆☆☆

''امی یہ نازی کیا کہہ رہی ہے؟ کیا سچ میں یہ گھر آسیب زدہ ہے؟'' رخشندہ بیگم کی دونوں بیٹیاں مع بچوں کی فوج کے اماں کے بلانے پر دوڑی چلیں آئیں تھیں، اس بڑے سے عالیشان گھر کو دیکھ کر دونوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں تھیں مگر نازی کی زبانی اس کے آسیب زدہ کا سن کر ساری خوشی ہوا ہو گئی تھی اور اب وہ خود بھی خوف کا شکار ہو کر ماں کو سمجھا رہی تھیں۔

''اماں! اس بات کو معمولی مت سمجھیں، ایسی چیزوں کے اثرات بہت بڑے ہوتے ہیں، اگر آپ لوگوں کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو۔'' بڑی والی بیٹی شمع نے کہا تو اس سے چھوٹی رامینہ نے بھی حصہ لیا تھا۔

''ہاں امی، میری بات مانیں تو کسی عامل سے رجوع کریں، اپنی حفاظت کے لئے کوئی تعویذ وغیرہ بنوا لیں، آپ بھول گئیں عابدہ باجی کی بیٹی پر جن عاشق ہو گیا تھا اور وہ کیسی عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگی تھی، بیچاری کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی، اسی وجہ سے۔'' رامینہ نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے مثال بھی دی تھی۔

''ہاں کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو، مگر میں کسی عامل کو نہیں جانتی۔'' رخشندہ بیگم نے پریشانی سے کہا تھا جبکہ نازی کی حالت خوف سے پتلی ہو رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں ایک بہت ہی پہنچے ہوئے عامل بابا کو، مگر پیسے ٹھیک ٹھاک لگیں گے۔'' رامینہ

نے کہا تو رخشندہ بیگم سر ہلا کر رہ گئیں، اس دن کچھ دیر بعد ہی دونوں بیٹیاں مختلف بہانے کر کے واپس چلیں گئیں، آسیب زدہ گھر میں رات گزارنے کا حوصلہ ان دونوں میں نہیں تھا۔

☆☆☆

بہار کی آمد تھی، رنگ رنگ کے دلفریب پھول اپنے جوبن پر تھے، درختوں پہ نمو پاتے پتے، بہار کو خوش آمدید کہہ رہے تھے، احمد شام کو جلدی گھر آ گیا تھا، زرش نے بہت خوبصورت ست رنگی دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا اور اپنے لمبے اور گھنے بالوں کو پشت پہ کھلا چھوڑا ہوا تھا، دونوں چھت پر واک کر رہے تھے، جب احمد نے رک کر زرش کے خوبصورت ہاتھوں میں ست رنگی چوڑیاں پہنائی تھیں، تو فضا میں ہوا کے سنگ اس کی کھلکھلاتی ہنسی، چوڑیوں کی کھنک اور اڑتے بالوں کی خوشبو کے سنگ دور تک پھیل گئی تھی۔

احمد محبت بھری نظروں سے زرش کو دیکھتا، ریلنگ سے ہٹ گیا، دونوں دھیمی سروں میں باتیں کرتے چھت پر ٹہلنے لگے۔

لان میں کرسی پر بیٹھی چائے پیتی نازی نے شوخ ہنسی اور چوڑیوں کی کھنک کی آواز پر چونک کر اوپر دیکھا، جہاں اسے ست رنگی آنچل لہراتا ہوا نظر آیا۔

خوف کی شدت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں تھیں اور وہ ماں کو پکارتی بے اختیار اندر کو بھاگی تھی۔

☆☆☆

''اچھا ٹھیک ہے اور کیا بتایا انہوں نے؟'' رخشندہ بیگم فون پر بات کرتے کرتے ایک نظر بخار میں جلتی نازی پر بھی ڈال رہی تھیں، چہرے پر پریشانی واضح تھی۔

''کیا کہہ رہی تھیں باجی؟'' فون بند ہونے پر نازی نے نقاہت زدہ لہجے میں پوچھا تھا اس دن خوف سے اسے بخار چڑھ گیا تھا اور اس کے بتانے پر رخشندہ بیگم نے راہینہ کو جلد کچھ کرنے کو کہا تھا۔

''راہینہ گئی تھی عامل بابا کے پاس، انہوں نے بتایا ہے کہ بہت سخت آسیب ہے یہاں، تعویذ اور دم کر کے پانی بھی دیا ہے اور کہا ہے کہ جلد از جلد یہ گھر چھوڑ دیں ورنہ نقصان اٹھائیں گے۔'' رخشندہ بیگم نے ساری تفصیل بتائی، یہ سن کر نازی مزید خوف زدہ ہوگئی۔

''اب کیا ہوگا؟'' اس کے لہجے سے خوف جھلک رہا تھا۔

''پریشان مت ہو، کل راہینہ کا میاں ساری چیزیں دے جائے گا۔'' رخشندہ بیگم نے کہا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکلنے لگیں، تو نازی بھی اکیلے کمرے سے خوفزدہ ان کے پیچھے لاؤنج میں چلی آئی۔

''یہاں بیٹھ میری بچی، میں تیرے لئے جوس لے کر آتی ہوں۔'' رخشندہ بیگم اس کے ڈر کو سمجھتی تھیں، اس لئے اسے صوفے پر بٹھا کر جوس لینے چلیں گئیں۔

''یہ پی لے، کیا حالت ہوگئی ہے تیری۔'' اماں نے جوس کا گلاس اس کے لبوں کو لگایا، پھر بولنے لگیں۔

''راہینہ بتا رہی تھی کہ عامل بابا نے بہت سخت چلہ کاٹا ہے، پھر پتا چلا ہے ان کو کہ اس گھر میں ایک ہندو عورت اپنے بچوں کے ساتھ رہتی ہے، مگر ہمیں تین مہینے ہو گئے ہیں آج تک کوئی نقصان تو نہیں پہنچا ان لوگوں سے۔'' رخشندہ بیگم نے باقی کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''لو جی، اس ہندو عورت سے نقصان کیا پہنچے گا، ہر وقت تو دونوں ماں بیٹی انڈین ڈراموں

میں پوجا پاٹ دیکھ رہی ہوتی ہیں، ہندو عورت ہوتی تو اس عنایت پر ان دونوں کی داسی بن چکی ہوتی، اس کی آتما کو اتنی شانتی پہنچانے پر۔'' غصے سے تیز تیز ہانڈی میں چمچ چلاتی زرش نے نیچے سے آتی آوازوں کو سن کر کہا تھا۔

''اماں آپ بھول رہی ہیں، پچھلے ہفتے اب کی بائیک کی ٹکر ہوگئی تھی، ابوظہبی والے بھائی کا وہاں ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، آپ مسلسل بیمار رہنے لگی ہیں اور تو اور میرا کوئی رشتہ بھی نہیں آ رہا۔'' نازی نے سب واقعات کو ملا کر ایک خوف ناک منظر پیدا کر دیا تھا۔

''کہہ تو ایسے رہی ہے جیسے پہلے تو رشتوں کی لائن لگی ہوئی تھی، توبہ ہے لوگ بھی کیسی کیسی جھوٹی کہانیاں گھڑ لیتے ہیں۔'' زرش نے آٹے کو مکیاں مارتے ہوئے کلس کر سوچا تھا۔

''ہاں، کہہ تو ٹھیک رہی ہے۔'' رخشندہ بیگم نے بھی غور سے واقعات کا جائزہ لینا شروع کیا تھا۔

تو عام سے معمولی واقعات بھی بڑے اور خاص نظر آ رہے تھے، انسانی فطرت بھی عجیب ہے اپنے دماغ کے کرشمے سے ایسے ایسے کردار اور واقعات تشکیل دینے لگتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے، مگر ہم اپنے وہم اور شک پر تصدیق کی مہر کسی نہ کسی طرح سے ضرور لگاتے ہیں۔

خوف کا تعلق بھی کچھ کچھ ایسا ہی ہے، خوف کسی فرد یا چیز کا نام نہیں ہے، خوف ہمارے اندر کی کیفیت کا نام ہے، جسے ہم مختلف، چیزوں، لوگوں اور واقعات کے ساتھ منسلک کر دیتے ہیں اور وہم خوف میں ایسا ہے جیسے جلتی پہ تیل، خوف کو جتنا بڑھانا چاہو بڑھا لو اور مزے کی بات یہ ہے کہ ہم ساری زندگی کسی نہ کسی خوف یا وہم کا شکار ضرور ہوتے ہیں، چاہیں ہم مانیں یا نہ مانیں۔

☆☆☆

''رخشندہ بیگم کہاں ہو بھئی، غضب ہو گیا؟'' قیوم صاحب بہت گھبرائے ہوئے سے گھر میں داخل ہوئے تھے۔

''یا الٰہی خیر، کیا ہوا قیوم صاحب؟ آپ کے چہرے کا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے؟'' رخشندہ بیگم نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا تھا۔

''زیر تعمیر مکان کی دوسری منزل دوران تعمیر گر گئی ہے، تین مزدور بھی شدید زخمی ہوئے ہیں، شکر ہے کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔'' قیوم صاحب نے نازی کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیتے ہوئے تفصیل بتائی تھی۔

''ہائے میرا اللہ، یہ کیا ہوگیا؟'' رخشندہ بیگم نے ماتھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''اماں یہ ضرور اسی آسیب کی کارستانی ہو گی، ضرور اسے ہمارا عامل بابا سے رابطہ کرنا پسند نہیں آیا ہے۔'' نازی نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

دو ہفتے پہلے راہینہ کے بھیجے تعویذ پورے گھر کے کونے کونے میں دبا دیئے گئے تھے، پانی کا چھڑکاؤ بھی کر دیا تھا، رخشندہ بیگم اور قیوم صاحب نے چونک کر نازی کی طرف دیکھا تھا۔

''ہاں، نازی کی بات میں دم ہے، میں ابھی فون کر کے عامل بابا سے پوچھتی ہوں۔'' رخشندہ بیگم نے فون کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''مگر بیگم!'' قیوم صاحب نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

''آپ چپ کریں، آپ نہیں سمجھتے ان باتوں کو۔'' رخشندہ بیگم نے قیوم صاحب کو ٹوکتے ہوئے کہا اور فون پر عامل بابا سے بات کرنے

لگیں، جنہوں نے ایک گھنٹے بعد حساب لگا کر بتانے کا کہا، اب وہ تینوں بے صبری سے بیٹھے وقت گزرنے کا انتظار کر رہے تھے، اب آگے کا لائحہ عمل بابا کے بیان پر منحصر تھا۔

☆☆☆

آج پھر اس گھر میں بہت بے ہنگم سا شور مچا ہوا تھا، مزدور سامان اٹھا اٹھا کر ٹرک میں لوڈ کر رہے تھے، عامل بابا نے آسیب کی طاقت اور غصے میں آنے کا بتا کر ایک چلہ کاٹنے کو کہا تھا اور اس کے لئے کافی بڑی رقم مانگی تھی، اگر نہیں تو پھر یہ گھر فوری طور پر چھوڑنے کا کہا تھا، رخشندہ بیگم نے سوچا تھا کہ کون سا ذاتی گھر ہے جس پر اتنا پیسہ لگایا جائے، انہیں یہ ہی بہتر لگا کہ پرانے محلے میں کرائے پہ گھر لے کر اپنے نئے گھر کی تعمیر مکمل ہونے کا انتظار کیا جائے، دو مہینے کا کرایہ یہاں ہی چھوڑا اور فوراً گھر چھوڑنے کو ترجیح دی اور چار مہینے بعد وہ دوبارہ سے واپس اپنے پرانے محلے جا رہے تھے، سارا سامان لوڈ کروا کر بڑے سے خالی گھر پر نظر دوڑاتے وہ گیٹ کو تالا لگانے لگے، جب ساتھ والے گھر سے دونوں میاں بیوی اپنے تینوں بچوں سمیت گھر سے باہر نکلے، انہیں سامان لوڈ کرواتا دیکھ کر اپنے بچوں کو کار میں بٹھایا اور دونوں ان کی طرف بڑھ گئے۔

''آپ لوگ بھی یہاں سے جا رہے ہیں؟'' مرد نے آگے ہو کر قیوم صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''ہم نے اس گھر کا اوپر والا پورشن تین سالوں سے کرائے پر لیا ہوا ہے۔'' اس مرد نے ساتھ والے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جن کے ٹیرس سے ان کا لان صاف نظر آتا تھا۔

''دراصل نیچے والا سارا گھر لاکڈ ہے کیونکہ مالک مکان ملک سے باہر ہیں، مگر سال میں ایک بار ضرور آتے ہیں۔'' اس کی بیوی نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

''میں اکثر آپ لوگوں کو دیکھتی تھی، مگر اس گھر کے اتنے قصے مشہور ہیں کہ ہمت نہیں پڑی آپ کے گھر آنے کی، ویسے بھی یہاں جو بھی آتا ہے ایک یا دو مہینے سے زیادہ نہیں رہتا ہے، آپ تو پھر بھی چار مہینے رہ گئے ہیں یہاں۔'' لڑکی نے اپنے نہ آنے کی معذرت کرتے ہوئے تفصیل سے بتایا تھا۔

''کیا آپ کو کبھی کچھ محسوس نہیں ہوا یا کوئی نقصان پہنچا ہو؟'' رخشندہ بیگم نے تجسس سے پوچھا تھا۔

''نہیں ایسا تو کبھی کچھ نہیں ہوا، ہاں مگر کبھی کبھار چلنے کی آوازیں، بچوں کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں، یا ایسا لگتا ہے جیسے کوئی باتیں کر رہا ہو، مگر کبھی دیکھا کچھ نہیں ہے۔'' اس لڑکی نے خوفزدہ نظر گھر پر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا ہم تو جب سے آئے تھے نقصان پہ نقصان اٹھا رہے ہیں۔'' رخشندہ بیگم نے مبالغہ آرائی کی تھی۔

''اچھا اب ہم چلتے ہیں، بچے انتظار کر رہے ہیں۔'' اس مرد نے انہیں خدا حافظ کہا اور چلے گئے، ان کے جاتے ہی ان تینوں نے بھی بڑے سے عالیشان گھر پہ آخری نظر ڈالی اور چلے گئے۔

☆☆☆

شام کے سائے آہستہ آہستہ گہرے ہو رہے تھے، زرش اور احمد نے چھت کی ریلنگ پہ سے جھانک کر نیچے دیکھا سب لوگ چلے گئے تھے، حسب روایت دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر نیچے اتر آئے، سارے گھر پہ ہو کا عالم طاری تھا، تینوں

بچے لان میں آ کر خوشی اور آزادی سے کھیلنے لگے تھے اور یہ آزادی تب تک تھی جب تک نئے کرائے دار نہ آ جاتے، احمد اور زرش لمبے سے پورچ میں چکر لگاتے ہوئے ساتھ ساتھ ایک نظر بچوں پر بھی ڈال رہے تھے۔

''آج اتنے دنوں کے بعد بچے آزادانہ کھیل رہے ہیں۔'' احمد نے بچوں کو خوش دیکھ کر کہا۔

''یہ تو ہے۔'' زرش نے تائید کی۔

''تم نے بچوں پہ پابندی بھی تو اتنی لگا رکھی تھی۔'' احمد نے اسے یاد دلایا۔

''ابھی اتنی احتیاط اور پابندی تھی پھر بھی کیا کیا باتیں نہیں بن گئیں ہیں۔'' زرش نے منہ بنا کر کہا تو احمد قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''یہ تو فطری چیز ہے کہ جو نظر نہیں آتا اس سے خوف تو محسوس ہوتا ہی ہے۔'' احمد نے ایمانداری سے تجزیہ کیا تھا۔

''مگر احمد! آپ کو نہیں لگتا کہ یہ انسان کچھ زیادہ ہی وہمی اور توہم پرست ہوتے ہیں، اپنے فائدے کے لئے دوسروں کا نقصان کرنے والے، جھوٹے اور دغاباز، جیسے وہ عامل بابا، پیسے بٹورنے کے لئے جھوٹ پر جھوٹ بولتا رہا۔'' زرش نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہوں یہ تو ہے مگر کچھ غلطی ہم سے بھی ہوئی، بچوں کا بال مارنا اور پھر آدم کا بال واپس لے کر آنا اور جب ہم چھت پر واک کر رہے تھے، تمہاری چوڑیوں کی کھنک اور لہراتا دوپٹہ دیکھ کر کوئی بھی ڈر سکتا تھا، جبکہ یہ بھی سیڑھیوں پر قدم رکھ کر۔'' زرش نے مڑ کر بڑے سے ویران لاؤنج پر نظر ڈالی تھی، سارے گھر میں سناٹے کا راج تھا اور نئے کرائے دار آنے تک ایسا ہی رہنا تھا۔

زرش نے مسکرا کر دیکھا تھا اور سیڑھیوں پہ چلتے ان سب کے وجود غائب ہو گئے تھے۔

☆☆☆

سدرۃ المنتہیٰ

پچیسویں قسط کا خلاصہ

رات کے پچھلے پہر امر کلہ اور علی گوہر کا آمنا سامنا ہوتا ہے، وہ اسے کہتی ہے میرے راستے میں مت آنا، ہماری منزل الگ ہے۔

امرت، ھالار کو لے کر گاؤں کے لئے نکل جاتی ہے۔

اور امر کلہ کو اپنے گھر چھوڑ دیتی ہے، امر کلہ کا اس کے گھر میں بہت اچھا وقت گزرتا ہے، امر کلہ اور امرت کی تفصیل سے بات ہوتی ہے فون پہ، جس کے آخر پہ وہ اپنے کھوئے ہوئے باپ کے بارے میں سوچتی ہے اور ماں کے پاس واپس جانے کی تیاری کرتی ہے اسے سادھنا کو ڈھونڈنا ہے۔

بچوں کی کلاس کے اندر بہت شور ہے، امرت باہر بیٹھی ہے گاڑی میں، جب فرید حسین اسے رشتہ ٹھکرائے جانے کا شکوہ اور شکریہ ادا کرتا ہے، اس کا کہنا ہے جب وہ دوسری بار رشتہ بھیجے گا تو اس نے انکار نہیں کرنا۔

اب آپ آگے پڑھیے

چھبیسویں قسط

''تم اے بی سی ڈی بند کروانا چاہتے ہو کیا؟'' وہ باقاعدہ ہنسی۔
''ان سے پوچھو فرید حسین۔''
''وہ مجھے دیکھ کر کلاس سے سر پہ پیر رکھ کے بھاگ جائیں گے۔''
''ان کو بھگانے کا اور کوئی سلوشن نہیں ہے، جب ان کو بھگانا ہوگا تب تمہیں بلا لاؤں گا، ابھی تو تم نے جانے کی بات کرلی ہے۔'' اس نے کھڑکی سے سر نکالا بے مقصد ہی اور اتفاقی نگاہ ٹکرائی تھی، وہ یہی چاہتی تھی، مگر پھر گاڑی اسٹارٹ کی، دل ایک دم سے جیسے کسی نے جکڑ لیا تھا۔

ان کا چہرہ بھی دھواں تھا، کلاس میں بڑے بچے تھے، سولہ سترہ سال کے، جو سب سے پیچھے بیٹھے تھے، ایک چودہ اور تیرہ کے، ایک انیس بیس تک کے، سادھنا نے سب میں ٹافیاں بانٹ دیں۔

یہ ٹیوشن کلاس کا وقت ہوتا تھا، اس میں وہ کوئی کہانی سناتے تھے اور پھر اس کہانی پہ سوال اٹھتے تھے اور وہ جواب دیتے تھے۔

کہانی سنانے کے بعد وقفہ چھ منٹ کا تھا، چار ضرورت کے دو توقف کے، اب سوالات کی باری تھی اور ان کے ذہن میں کوئی اور فلم چلنے لگی تھی۔

☆☆☆

''اگلی بار رشتہ بھیجوں گا تو انکار نہیں کرنا۔''
فرید حسین کا جملہ پورے سفر میں اس کے سر پہ جیسے پھیریاں لگا تا رہا تھا، گونجنے لگا تھا۔
یہ ہوٹل تھا، ڈبہ ہوٹل، چائے کی بریک تھی، اس نے امر کلہ کو فون ملایا۔
''کیا بات ہے امرت؟'' اسے احساس تھا وہ وہاں گئی ہے تو کچھ منفرد تو ہوا ہوگا۔
''تم ہو کر آگئیں اے بی سی ڈی اسکول سے؟'' وہ اسی کے رکھے نام کو مذاق بنا رہی تھی۔
''کس نے کہا تھا اتنا بڑا اسفر اکیلے کرو۔''
''امر مجھے فرید نے ایک عجیب بات کہی ہے۔''
''بولا وہ کیا؟''
''شکوہ کیا ہوگا اس نے رشتہ ٹھکرانے کا۔''
''اس نے شکوہ نہیں شکریہ ادا کیا کہ عزت سے رشتہ ٹھکرایا ہے۔''
''پھر عجیب کیا ہے؟''
''اس نے کہا دوبارہ رشتہ بھیجوں گا تو انکار نہیں کرنا، اس نے یہ کیوں کہا مجھے ایسا، وہ دوبارہ رشتہ کیوں بھیجے گا؟''
''وہ دوبارہ رشتہ نہیں بھیجے گا امرت۔'' اسے یقین نہ تھا۔
''وہ بھیجے گا اس کے لہجے کا یقین بتاتا ہے کہ وہ بھیجے گا۔''
''تم نے اس سے پہلے کیا کہا تھا فرید کو؟''
''میں نے تو یہی کہا تھا کہ جب تمہیں امرت ہی چاہیے، امرت جیسی نہیں تو بھیج دینا۔''
''پھر تم فکر کرتی رہو، وہ رشتہ بھیجے گا، ضرور بھیجے گا۔''

''تم کیسی دوست ہو ہنس رہی ہو؟'' اسے امر کلہ کا ہنسنا برا لگا۔
''دوست ہوں تبھی تو ہنس رہی ہوں پیاری، دشمن ہوتی تو فون کاٹ دیتی اور اس کے بعد کہتی کہ سوری لائن کٹ گئی ہے۔''
''کتنی بے ضرر دشمنی ہے ویسے کہ لائن کٹ گئی۔'' وہ ہنسی اس بار۔
''لائن تک اگر دشمنیاں رہیں تو بھی اچھا، لائن ڈسکنیکٹ، دشمنی ختم۔''
''یہ مت کہو امرت کبھی کبھار لفظوں کی دشمنی گولیوں سے تیز ہوتی ہے، سیدھی لگتی ہے، خطرناک دشمنی ہوتی ہے۔''
''تم دشمنی کو چھوڑو۔'' سامنے بیرے کو آتا دیکھ کر رہ رکی تھی، وہ کپ لے گیا تھا۔
''تم نے چائے پی ہے؟''
''صرف چائے، نان خطائیاں بھی کھائی ہیں۔'' امر کلہ مسکرائی۔
''اچھا کیا، اب گھر جلدی پہنچو شام ہونے نہ لگ جائے، ابھی تو دوپہر ہے، مگر شام تک پہنچو، میں آنٹی کو کہتی ہوں فرید دوبارہ رشتہ بھیجے گا، وہ مطمئن ہو جائیں گی تب سے پریشان ہیں۔''
''نہیں امر کلہ، ایسا مت کرو، فرید کو روکو، اب اگر اس نے رشتہ بھیجا تو میرے لئے مشکل ہو جائے گا انکار کرنا۔''
''تو مت انکار کرنا کتنے رشتے ٹھکراؤ گی لڑکی۔''
''امر کلہ میں تمہیں تو دیکھ ہی لوں گی، لگتا ہے خود ہی مجھے کچھ کرنا پڑے گا، رکھو فون میں نے ڈرائیو کرنی ہے۔'' اسے پتہ تھا اب وہ اتر آئی ہے اصلیت پہ۔
''اپنا خیال رکھنا۔'' امر کلہ نے فون رکھا۔
''کس کا فون تھا امر کلہ؟'' نگار پیچھے کھڑی تھی۔
''امرت کا تھا۔''
''رشتے کے لئے مان گئی ہے کیا؟''
''وہ اور مان جائے، یہ شاید اگلے جنم میں جنت کے فرشتے سے شادی کرے گی۔''
''تم نے اسے ایسا کہا کیا؟''
''نہیں آپ کو کہہ رہی ہوں۔''
''اسے کہنا فرشتوں سے کیا فائدہ انسانوں سے شادی کرنے کا سوچے۔''
''اچھا کہہ دوں گی۔''
''تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا امر کلہ؟'' وہ اصل بات پر آگئیں۔
''کچھ نہیں، میں نے کبھی کچھ نہیں سوچا۔''
''تمہیں یاد ہے جیکب جو ہوتا تھا۔''
''جی مجھے یاد ہے۔'' اسے پتہ تھا وہ کیا کہنے لگی ہیں۔
''جیکب کی شادی ہو چکی ہے۔''
''اس کا جو دوست ہے نادار...... وہ کیسا ہے؟''

"اماں...... خدا کے لئے۔" وہ جھلا کر باہر نکل گئی۔
"امر کلہ یہ سن لو، میں تمہاری کسی مسلمان سے شادی نہیں کروں گی۔" وہ ٹھنک کر رکی تھی۔
"آپ بے فکر رہیں، نہ میں کسی مسلمان سے شادی کروں گی نہ کسی کرسچن سے، نہ کسی ہندو سے۔"

"کیا تمہارا چرچ جانے کا ارادہ ہے امر کلہ؟"
"کتنی سنگدل ماں ہیں آپ۔" وہ پھیکی مسکرائی۔
"میں اتنی پارسا نہیں ہوں کہ چرچ چلی جاؤں۔"
"اتنی پارسا ہوتی تو نماز پڑھتی، نماز اگر نہ سہی تو کلمہ تو پڑھ ہی لینا تھا۔"
"پھر تو مزاروں پہ کیوں جاتی ہے امر کلہ؟"
"آپ مزار پہ کیوں جاتی تھیں اماں؟"
"میں تو مجبور تھی کوئی امید نہیں ہاتھ لگتی تھی تیرے ملنے کی۔"
"تو میں بھی سمجھیں مجبور تھی، کوئی امید نہ ہاتھ لگتی تھی میرے۔"
"کس کے ملنے کی؟" ماں ایسا سوال کرنے سے پہلے سو بار سوچتی، انہوں نے ایک بار نہ سوچا۔
"ماں اور بیٹی کے درمیان لحاظ کا پردہ ہوتا ہے۔" وہ اس بار کچھ کہہ نہ سکی۔
"میں مجبور تھی پر......"
"میں نے کچھ نہیں مانگا، میں بغیر مانگے ہی پھرتی تھی۔"
"امر کلہ بیٹی! تمہیں کچھ نہیں ملا نہ، جبھی نہیں ملا، تمہیں مانگنا چاہیے تھا۔" سکھی نے چار جملے ہی سنے تھے۔
"تم نے کیوں نہیں مانگا؟"
"مجھے خود نہیں پتہ کہ میں کیوں پھرتی ہوں اور مجھے کیا چاہیے، مجھے کچھ نہیں چاہیے شاید، مجھ پر مہربانیاں ہو جاتی ہیں، کھانے پینے کو مل جاتا ہے، پہننے کو مل جاتا ہے۔"
"مجھے کام پہ جانا ہے۔" وہ چادر لے کر نکل گئی۔
"دیکھا سکھی تم نے یہ نہیں بدلتی، یہ نہیں میری بات سنتی، یہ نہیں سنے گی۔"
"بات ایسے نہیں کی جاتی جیسے تو کرتی ہے نگار۔"
"پھر بات کیسے کی جاتی ہے، تجھے تو بات کرنی آتی ہے نا۔"
"میرے بھی منہ سے لفظ نکلتے ہیں تیرے بھی منہ سے لفظ، تو شاید انوکھا بولتی ہے، تو ہی بول۔"
"اسے وقت دے نگار۔"
"ہاں تاکہ وہ بوڑھی ہو جائے، ابھی سے خود کو کیسے بگاڑ دیا ہے اپنی پرواہ ہی نہیں کرتی، بے فکری ہے صدا کی۔"
"تو اس کی دوست امرت سے کہہ کہ نگار وہ اسے سمجھائے۔"

"لے، وہ تو خود شادی کے لئے تیار نہیں ہوتی، اسے کرلے گی؟"
"وہی کرے گی اسے، میں بات کروں گی، کہوں گی سمجھائے اسے، تو پریشان نہ ہوا کر۔"
اسی وقت فون دوبارہ بجا تھا، وہ فون بھول گئی تھی، اس نے اٹھایا، سکھی نے، فون تھانے سے کہا تھا۔

☆☆☆

جیل کی سلاخوں کے پیچھے موت کی بات ہو رہی تھی۔
موت کی ہی ہو سکتی ہے، قید کی ہی ہو سکتی ہے، محبت کی بری لگتی ہے، وہ قیدی سٹھیا گیا تھا جوانی کے معاشقوں کی باتیں کر رہا تھا، بھوری آنکھوں والی پتلیاں نچا کر وہ بھورے بالوں والا قیدی سٹھیائے ہوئے پر ہنس دیا، قہقہہ چھوڑا اور پھر اپنا ہاتھ دیکھا۔
"میری زندگی کی لکیر لمبی ہے اور کہتے ہیں تجھے پھانسی ہو جانی ہے، ہی ہی ہی، ہاہا۔" وہ پاگلوں کی طرح ہنستا تھا۔
"اوئے کلموہے، ہاتھ پڑھنے کا ناٹک کرنے والے، قاتل تجھے پھانسی تو ہوگی، تیرے پیو کو بھی ہوگی، سفید داڑھی والا اس کی بک بک سے جھلاتا تھا، کل چار بندے تھے گنتی کے، دو نوجوان، ایک سفید داڑھی والا تلخ لہجے والا بزرگ ایک بالکل ہی بھورے بالوں اور آنکھوں والا نوجوان، ایک نیا جذباتی اور ایک سٹھیایا ہوا ادھیڑ عمر چور، ابے اتنے جوتے لگے ہیں سالے تجھے سدھرتا نہیں معاشقوں سے باز نہیں آتا تو سفید داڑھی والا جس نے غیرت کے نام پہ قتل کیا تھا اور جیل ہو گئی تھی ہر کسی کو غیرت دلوانا اپنا فرض اولین سمجھتا تھا۔"
"ابے او کھوتے کی اولاد، ابے او چور کے پتر خود چور بند کر اپنی بک بک۔" بھورے بالوں والا پھر ہنسا۔
چور کا منہ بن گیا تھا۔
"ساری عمر رب نے چوری کا کھلایا۔"
"او رب کو نہ دے، نہ کہہ اسے، سارا تیرا کیا دھرا ہے لفنگے، اپنے کرتوتوں کی وجہ سے آیا ہے۔"
"تو بھی تو چاچے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے آیا ہوا ہے۔" منہ بسور کر کہا۔
"او میں بے غیرت غیرت کا قتل کر کے آیا ہاں، میں کوئی تیرے جیسا لچا چور لفنگا نہیں ہوں، جیل میں بھی نماز پڑھتا ہوں۔" یہ جملہ اس نے آہستگی سے ادا کیا تھا۔
"او رب پہ اپنی نماز کا رعب نہ جھاڑ چاچے، بڑے دیکھ لئے ہوئے ہیں نمازی ہم نے۔" بھورے بالوں والے شوکی نے مداخلت کی، ورنہ اس کا پہلا کام ہنسنا دوسرا آنکھوں کی پتلیاں نچانا اور لطیفے سنانا، تیسرا ہاتھ کی لکیروں کے جنتر منتر پڑھتے رہنا اور چوتھا بک بک بولنا تھا۔
اور ایک نوجوان تھا جو چپ ہی رہتا تھا زیادہ تر، تازہ واردات کر کے آیا تھا، پہلی واردات لگتی تھی اس کی، سہما ہوا خیالوں میں کھویا ہوا رہتا تھا، تھا بھی کوئی تیس کے اندر۔
اور بھورے بالوں والا پینتیس کے برابر، دو قتل کیے تھے اس نے، پہلا کر کے بھاگ گیا،

دوسرے پر ہاتھ لگ گیا چور نے آدھی زندگی جیل کی ہوا کھائی تھی۔
''چور کی بھی کیا زندگی ہے، چھپ چھپ کر ڈاکے ڈالو، پھر چھپتے رہو۔''
کسی نے کہا تھا میاں ساری زندگی بددعا کا رزق کھاتے ہو، کبھی اپنا بھی کھایا کرو۔''
وہ ابھی تک اپنی ہر چوری سے ٹافیاں خریدتا تھا اور بانٹ دیتا تھا۔
اب بھی اس کی جیب میں چار چھ دن پہلے والی ٹافیاں پڑی تھیں، جو اس نے بانٹی تھیں۔
''ابے او...... کھوتے...... یہ ٹافی پکڑ۔'' یہ جیل کے قیدیوں کی زبان تھی، یہاں قدغن نہیں لگتے تھے، بدزبانی عام تھی۔
ان کی نظر میں امر کلہ کا چہرہ گھوم گیا۔
بچپن والا ابے سے ٹافیاں لینے والا، پھر بیمار چہرہ۔
''تم مسلمان لوگ مرے ہوئے لوگوں کے نام پہ چیزیں دیتے ہو نا چاچا۔'' بزرگ سے پوچھا، جو غیرتی کہلاتا تھا۔
''ہاں...... یہ تیری بیٹی کے نام پہ ہیں؟ مری کیسے تھی؟''
''ہاں چاچا...... بس مر گئی، نہر میں کود کر مر گئی۔''
''پھر تو تمہیں نہر میں ٹافیاں ڈالنی چاہیں۔'' بھورا ہنسا۔
ایک تو ہنسا اس پر بک بک کرنا عادت تھی، عادت تو پرانی تھی۔
سفید والا غیرتی کانوں کی لوئیں چھو کر نعوذ باللہ کہنے لگا۔
چور نے ٹھان لی اب اگر جیل سے رہا ہوا تو اسی نہر میں ٹافیاں پھینکنے جاؤں گا، آنکھوں میں پانی کہہ رہا تھا۔
''میری بیٹی نے ڈوب کر خودکشی کر دی، میں نے گھر چھوڑا ہوا تھا پہلے ہی آخری بار اسی دن، گھر سے نکلا تھا، بیوی بھی چھوڑ گئی۔''
''عزت کی روٹی آہ...... کیسا ذائقہ ہوتا ہوگا عزت کی روٹی کا۔''
''عزت کی روٹی۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔
''عزت اور روٹی...... اور ذائقہ...... کیا حلال اور حرام کی روٹی کا ذائقہ الگ ہوتا ہے کیا؟''
چاچے نے سرد آہ بھری۔
''کئی دن سے جیل کی روٹی کھا رہا ہوں، اصل ذائقہ زبان پر ہی نہیں چڑھتا ہے۔''
جب اس کی بیوی کھانا لاتی تھی وہ جی بھر کر کھایا کرتے۔
چور نے کہا۔
''میرے لئے تو کبھی کوئی روٹی نہیں لایا، کاش میری بیٹی زندہ ہوتی، مگر اچھا ہوا، بہت اچھا ہوا کہ وہ مر گئی، زندہ ہوتی تو کہاں سے کھاتی۔'' کہنے والا کہاں جانتا تھا کہ اس کا پیٹ لنگر بھرتا۔ خود کی کمائی بھرتی، ماں کی کمائی بھرتی، کسی نے کسی طرح سے کھا رہی تھی، اسے حرام کے ذائقے کا نہیں علم تھا، اسے حلال کا ذائقہ بھولا ہوا تھا۔
''سنو، اگر تم چھوٹ گئے تو میری طرف سے اس جھیل میں ٹافیاں ڈالنے جانا۔''

''تم میں سے جو بھی مجھ سے پہلے چھوٹا۔'' چاچا نعوذ باللہ کہتا اگر اس بار اس کی آنکھیں نہ نم ہوتیں۔
جیل میں موت کے علاوہ بھی بات ہوتی تھی۔

☆☆☆

زندگی عجیب سروں کا سرگم کھیلتی ہے اور کسی کے زور زبردستی کے بغیر کھیلتی ہے، اس میں بس وہ لوگ جگہ بنا پاتے ہیں جو کسی نہ کسی بہانے سے زندگی کو جاری رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔
''دکھوں سے قطعی نہیں گھبراتے علی گوہر، یہ تو بہادروں کو ورثے میں ملے ہیں تاکہ وہ تلوار کے زور یا طاقت کے زور پہ دکھوں کو کاٹتے جائیں اور رستے بناتے جائیں۔''
''فنکار فنکار نہیں رہا تھا، انکار بن گیا ہے۔'' یہ ھالار نے اسے کہا تھا بار جانے سے پہلے اور اسے یہ بات دل پہ لگی تھی، وہ مسکرایا تو صاحب سمجھ گئے۔
''علی گوہر کیا یاد آ گیا ہے تمہیں؟'' لکڑیوں کے ڈھیر پہ دونوں بیٹھ گئے تھے، آس پاس سے خزاں رسیدہ پتے درختوں سے جھڑتے ہوئے جو گر رہے تھے، رستے کو کسی قدر خوبصورت بنا گئے تھے۔
گنجے سر والے درخت ٹہنیوں کے ہاتھوں سے جیسے سر میں کھجلی کرتے لمبی جمائیاں لیتے ہوئے نظر آنے لگے۔
''ہر چیز تھکتی ہے، جو کام کرتی ہے، اسے تھکن ہوتی ہے، امرت کی طرح محنت کرتا ہے، رلتا ہے، مگر اس کے سامنے آئینے ہیں، وہ اپنے عکس پر یقین رکھتا ہے۔''
''وہ بے عقیدہ نہیں ہے، وہ تھوڑے پہ راضی رہنے والا ہے اسے شکر گزاری آ گئی ہے، اس کے ہاتھ سکون کی چابی لگ گئی ہے، وہ خواش کا غلام نہیں ہے اس لئے کم پریشان رہتا ہے۔''
''تانگہ چلانے میں خوش ہے، عجیب آدمی ہے، میں اس کی جگہ ہوتا تو اب تک کئی تانگے بیچ چکا ہوتا، کئی رستے دریافت کر چکا ہوتا، سیدھے رستے پر نہ چلتا۔''
''آپ ہوتے تو زندگی آپ کو نیا رستہ دکھاتی مگر آپ کہتے کہ زندگی آؤ میں تمہیں ایک نیا رستہ دکھاؤں۔'' وہ ہنس پڑے۔
''چلو گوہر کام کرتے ہیں۔''
''میں کل سے مزدوری پہ جانے لگا ہوں سر، مجھے آفیسری نہیں بھاتی، غریب کا بچہ ہوں، غریبی جچتی ہے۔''
''مزدوری میں بڑی برکت ہے، تم اپنے تخیل کے پر اونچے کرو علی گوہر ایک یہی تو عمر ہے۔''
وہ علی گوہر کی جوانی کو کارآمد بنانا چاہ رہے تھے۔
''سر انسان کبھی اندر سے بوڑھا نہیں ہوتا، اگر وہ چاہے، آپ تو ابھی تک نوجوان ہیں، دیکھئے نوجوان وہ ہے، جو کام کرے، خواب دیکھے سوتے میں، دن میں اس کی تعبیر کھوجے شام کو دلکشی کھوجے، رات کو پیر پسارے، دن کو چڑھتے سورج کے ساتھ بھاگنا شروع کر دے، آپ بھی ایسے ہیں، آپ میں کام کی جستجو ہے، آپ نوجوان سے کئی گنا آگے کھڑے ہیں، اللہ آپ کو لمبی عمر عطا

کرے۔'' وہ مسکرائے۔

''علی گوہر تمہاری خیر ہو میرے یار، میرے بجن، میں چاہتا ہوں ایک اور جوانی ملے جس میں، میں کام کروں ایک جوانی آوارہ گردی کی نظر کر دی، لٹا دی، ایک جوانی تعبیر کو کچھ کافی ہو، بس خواب ہی دیکھے، کیا کچھ نہیں، پتہ ہے گوہر، تم میں مجھ میں اور امر کلہ میں یکساں کیا ہے؟''

امر کلہ کا نام تو جیسے علی گوہر کا پیچھا کرتا تھا، جہاں وہ...... وہاں یہ اپنا حوالہ لئے چلا آتا تھا، وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا یکساں ہے۔

''ہمیں منزل کا نہیں پتہ، ہم مختلف رستوں سے جا رہے ہیں ہمیں بھول بھلیاں میں گھومنے کا شوق ہے، ہمیں الجھاوے پسند ہیں، ہم گھوم پھر کر ایک ہی رستے پر آ جاتے ہیں اور اس پر بھی چل اس لئے نہیں سکتے کہ ہمیں سیدھے راستوں سے انسیت نہیں ہے، ہمیں خلاؤں کی سیڑھی پر لٹکنے کا شوق ہے اور امرت، ھالار اور فرید حسین کو رستہ نکالنا آتا ہے، وہ صدق دل سے سیدھے پر چلتے ہوئے پتھر ہٹاتے ہیں، عمارہ اور لاھوت کو تو دنیا کے بکھیڑوں سے کوئی غرض نہیں ہے، وہ آسانیاں چاہتے ہیں، ان کی مسکراہٹ مشکل کو آسان اور آسان کو بائیں ہاتھ کا کھیل بنا دیتی ہے، مگر ان سب میں سے نواز حسین بڑا عجیب ہے، وہ تیری طرح اندر سے پکتا رہتا ہے، اللہ تیری جوانی کو کبھی گھن نہ لگائے، اللہ تیری جوانی کو سلامت رکھے، یہ جو روگ لگا رکھے ہیں ان سے جان چھڑا علی گوہر، رستے کو ذرا صاف رکھ، ہم میں یہ خوبی ہے کہ ہم دلیر ہیں، بھگوڑے نہیں ہیں، رستہ ٹیڑھا ہی سہی مگر ہم سچے ہیں، جان لٹا آتے ہیں، فرار نہیں ہوتے، بس الجھتے زیادہ ہیں، اقرار نہیں کرتے، ہم میں اقرار کا دم خدا جانے کب آئے گا۔'' کہتے ہوئے چہرے پہ مایوسی آ گئی، مگر اس میں بھی مسکراہٹ چہرے پہ رینگنے کا دم رکھتی تھی۔

علی گوہر نے خزاں رسیدہ درختوں کو دیکھا، ابھی الف لیلوی داستان باقی تھی۔

☆☆☆

وہاں ایک لمبی بحث چل رہی تھی، اوطاق میں، لوگ مجمع کر کے مزار کی طرف جا رہے تھے کہ فنکار کو لے آئیں اور بھائی کا وارث بنا کر بٹھا دیں، لاھوت بھی انہی کے ساتھ تھا کہ مخالفت کی صورت لوگوں کو یہی خدشہ ہو جانا تھا کہ لاھوت پگ باندھ کر یہ ذمہ داری خود اپنے سر لینا چاہتا تھا، اس کی خود جان چھوٹ رہی تھی، اس پر اس نے سوچا کہ چلو وہ یہاں سے نوکری کے بہانے نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا، ماں اور بیوی کو لے کر شہر میں ایک چھوٹا سا گھر لے لے گا، ماں نہ بھی چلی ساتھ تو بیوی تو چلے گی ہی۔

وہ بڑا مطمئن تھا کہ اس صورت، زمین، کھیت، پیری، مریدی، دوست احباب، گاؤں برادری، پنچائیت سے جان چھوٹ جائے گی، اسی لئے وہ بھی فنکار کو منانے والوں کے ساتھ نکل کھڑا تھا۔

مگر یہاں امرت نے ایک چالاکی کی ان سے پہلے وہ گھر سے نکل آئی اور آج اس نے چادر لے لی تھی سر پہ ہمیشہ کی طرح، مگر ایک اضافہ آج نقاب بھی کیا تھا۔

لاھوت نے دو دن پہلے اسے کہا تھا۔

''امرت تمہیں شرم نہ آئے مگر لوگوں کو آتی ہے، وہ تمہیں دیکھ کر مقام سے ہٹ جاتے ہیں، نظریں چراتے ہیں، احاطہ خالی ہو جاتا ہے، سر جھک جاتے ہیں، ایک تمہارے جانے سے سارا ماحول ڈسٹرب ہو جاتا ہے، میں تمہیں جانے سے نہیں روکتا مگر ایسا نہ کیا کرو، ڈھک چھپ کر جاتی ہو، مگر چہرہ ڈھانپ لیا کرو تو تمہارا نقصان نہیں ہوگا۔''

عمارہ نے اسے گھر کا تھا کہ تم آ گئے، اپنی پیر پائی پر آخر، تب اس کا بھی یہی خیال تھا مگر ابھی اسے بڑا بھلا محسوس ہوا کہ اس کی وجہ سے کسی کا کام خراب نہیں ہو، وہ چادر سنبھالتی، چہرہ ڈھانپتی ہوئی مزار سے ہو آئی اور اب مسجد کے ساتھ بنے ہجرے کی طرف جہاں ھالار پہلے سے بیٹھا تھا سفید پتھر پر اسے دیکھ کر ذرا چونکا، آنکھوں سے پہچان لیا، چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

''اچھی لگ رہی ہو، پردہ اگر شر کو روکنے کے لئے کیا جائے تو اچھا ہے اگر حیاء تو بھی اچھا، مگر مجھے احتیاط کے طور پہ یہ کام کرنا پڑا۔''

''دبے پاؤں نکل آئی ہوں ھالار، کسی کو پتہ نہ چلا میرے آنے کا۔''

''یہ بتاؤ اندر کون ہے؟'' آواز ہلکی بھنبھناہٹ آ رہی تھی۔

''علی گوہر آیا ہے۔'' اس کے لہجے میں خفگی تھی، گویا اس نے نہیں بلایا تھا۔

''کیوں آیا ہے؟'' اسے حیرت ہوئی۔

''اس کی کیا ضرورت تھی یہاں پر۔'' ھالار چپ تھا، چہرے پہ خفگی۔

''تم کیوں آئی ہو؟'' وہ جانے لگی تھی اندر تب پوچھا۔

''بات کرنی ہے، لوگ آ رہے ہیں انہیں لینے منانے۔''

''گدی بٹھانے، ہجرہ تو پہلے ہی بسا لیا ہے انہوں نے اب گدی کی دیر ہے بس۔'' ھالار تلخی سے مسکرایا۔

''تم کیا بات کرو گی ہوگا وہی جو وہ چاہیں گے اور وہ یہی چاہتے ہیں امرت انہیں چھوڑ دو۔''

''انہوں نے تم سے کچھ کہا ہے کیا؟'' وہ ھالار کو دیکھ رہی تھی، وہ پھٹنے کے لئے بھرا بیٹھا تھا۔

''وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتے۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا۔'' وہ بولی۔

''جان دیتے ہیں وہ تم پر۔''

''پرانی بات تھی، لوگوں کے خون بدل کہ سفید ہو جاتے ہیں، میں تو پرایا خون ہوں۔''

''تمہیں یہ نہیں کہنا چاہیے ھالار، دل سے زیادہ قریب رکھا تھا، بھول گئے۔''

''بھولا نہیں، بے غیرت نہیں ہوں میں امرت، جبھی اب تک چوکھٹ پر پڑا ہوں، صبح کہہ رہے تھے، نکل جا بے غیرت تیرے ساتھ نہیں جا رہا میں۔'' کہتے ہوئے رونا آ گیا اسے۔

''ان سے کہو بے غیرت کو اجازت دیں کہ وہ چلا جائے، جوزف کو کہا تھا ٹکٹ کا، وہ کراچی آیا ہوا ہے، وہ تو بس میرا ہی...... دل نہیں اجازت دیتا ابے کو چھوڑ دوں، بڑا بے بس ہوں، ماں بھی میری ہیں، باپ بھی، دوست یار بھی یہی، مگر اب دیکھ امرت، دیکھ لینا، جاؤں گا تو لوٹ کر نہیں آؤں گا میں۔'' وہ بھیگا ہوا تھا، لہجہ بھیگا تھا۔

امرت کو مزید سننے کی ہمت نہ تھی، لفظ سادہ تھے، مگر کیفیت اس کی سہنے کے لائق نہ تھی۔

"امرت مجھے اجازت لے دے، اجازت لے دے، ایک بار وکہہ دیں؛ بے غیرت نکل جا، چلا جا، میں چلا جاؤں گا۔"

"تم نہیں جاؤ گے، وہ جائیں گے یہاں سے۔"

"وہ نہیں جائیں گے یہاں سے۔" ھالار کی آنکھ سے بچوں کی طرح آنسو بہنے لگے تھے، وہ اندر ایک طوفان کی طرح آئی اور آتے ہی برس پڑی۔

"کیا...... کتنا تماشہ...... رہتا ہے اب، کیش کرا رہے ہیں اپنی بزرگی کو، مل گیا نا سب بس یہی چاہیے تھا نہ، لوگ واہ واہ کر رہے ہیں، سائیں جی آ گئے ہجرہ بس گیا، سب آباد ہو گیا، درویش ہو گئے گدی سنبھالی، یہی نا، امرت تم اپنے باپ کے سامنے کھڑی ہو۔" ایک کمزور سا احتجاج گوہر نے کیا تھا۔

"میں ایک کمزور انسان کے سامنے کھڑی ہوں جس نے سارے فیصلے الٹے کیے اور آج وہ رو رہا ہے، تڑپ رہا ہے، جسے آنکھوں کا نور بنائے رکھا تھا، میں باپ کے پاس نہیں آئی، مجھے باپ کی ضرورت نہیں رہی، پل کر جوان ہو چکی ہوں میں علی گوہر، بچی نہیں ہوں، بچہ وہ ہے جو ان کے بغیر تڑپ رہا ہے، جسے لوریاں دے دے کر جوان کیا ہے، آج کھڑا ہے، دروازے پر، رو رہا ہے اور یہ یہاں تخت پر تشریف فرما ہیں۔" وہ جتنا تیکھا بول سکتی تھی بول رہی تھی۔

"امرت طاقت یہ نہیں کہ ہم کمزور کے سامنے بولیں اسے دبائیں برسیں گرجیں، طاقت یہ ہے کہ وقت آئے تو معاف کر دیں۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

"میں نے تمہیں کہا نا علی گوہر میں اپنے لئے نہیں لڑ رہی، میں اس کی بات کر رہی ہوں، جس کا ذمہ انہوں نے لیا تھا، میں نے اپنا کھاتہ تو کھولا ہی نہیں ہے۔"

وہ بیچ میں ہراساں کھڑے سہارا لے کر بیٹھ گئے تھے، کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا، پیروں میں جو چھالے پڑے تھے تیز دھوپ میں ریت میں چلنے کی وجہ سے پھر کانٹے چبھے تو پیپ بن گئے، زخم بن گئے، مگر ابھی اور کئی زخم ایک ساتھ ہرے ہوئے تھے۔

انہوں نے ایک لمحے کو سوچا تھا انہوں نے اپنی بیٹی کو اتنا ہی حوصلے والا دیکھنا چاہا ہو گا، اتنی ہی جرأت کرنے والی، جیسے وہ خود تھے، وہ بھی ایک دفعہ ابے کے سامنے چلائے تھے، مگر اس چلانے پر پچھتائے تھے، ابھی سوچ رہے تھے اسے روکیں مگر کس منہ سے اور یہ کام علی گوہر کر رہا تھا۔

"امرت اپنے ہتھیار کو غلط استعمال مت کرو، تم نے ہمیشہ سمجھ سے کام لیا ہے، آج صرف جذبات سے کام مت چلاؤ۔"

"علی گوہر میرے سامنے فلسفے نہ جھاڑو ابھی بڑی بڑی باتیں مت کرو، ان کو دکھاؤ آئینہ، نہیں دکھا سکتے تو چپ رہو، اپنا حمایتی کر کے بلایا ہے انہوں نے تمہیں۔"

"تم بہت غصے میں ہو امرت۔" علی گوہر کو لگ رہا تھا اس کی کوئی نہیں چلنے والی۔

"آپ نے تو انصاف اور بغاوت کی ہماری سرحدیں توڑ ڈالی ہیں نا۔" لہجہ فخر تھا علی گوہر مزید کچھ کہتا انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روکا تھا۔

"میرا احتساب ہو رہا ہے گوہر بچے، ہونے دو، کٹہرے میں کھڑا ہوں، بس بیٹھنے کی اجازت ہے، کہنے دو، ایک بار میری ماں بھی میرے سامنے مجرم بنی کھڑی تھی اور میں چیخ رہا تھا، ایک بار میرا باپ گرجا تھا میں تب بھی چلایا تھا، مگر ابھی میرے پاس گرجنے کا کوئی حق نہیں ہے، میرا احتساب ہو رہا ہے، ہونے دو۔"

امرت چپ ہو گئی، یہ سوچ کر نہیں کہ رحم آ گیا، یہ سوچ کر کہ اسے بدلا نہیں لینا۔

"میں نے کہا تھا کہ میں اپنے لئے بات کرنے نہیں آئی، نہ میں اپنے لئے چیخی ہوں، نہ چلائی ہوں، میں نے اپنا انصاف نہیں مانگا، میں اس کی بات کر رہی ہوں جو باہر کھڑا ہے۔" اور اسی وقت باہر شور تھا کچھ لوگوں گا۔

"امرت تم دوسرے دروازے سے باہر جاؤ۔" علی گوہر نے ادھ کھلے دروازے سے جھانک کر کہا۔

"باہر بہت لوگ کھڑے ہیں۔"

"وہ اندر نہیں آئیں گے۔" وہ بولی۔

"انہیں مت آنے دو۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا، میں کیسے روک سکتا ہوں۔" اس نے مدد طلب نظروں سے دیکھا ان کو۔

"ان کو آنے دو۔" دروازے کے پاس کھڑے ھالار نے سن لیا، صاف مطلب تھا آنے دو کا کیا ہے، اسے اب اجازت کی ضرورت نہ تھی، اس کے باپ نے رستہ چن لیا تھا، وہ رک کر کیا کرتا۔

امرت کے پاس وقت نہ تھا کہ روکے، دروازہ کھل گیا تھا، اس سے پہلے وہ دوسرے دروازے تک تھی، ایک کھلا، دوسرا بند ہوا، وہ بند دروازے کے باہر کھڑی تھی، جو کچھ توقع کے خلاف ہو رہا تھا۔

ھالار کو اس نے اس طرف سے جاتے ہوئے گیٹ سے نکلتے دیکھا، وہ اسے روکنا چاہتی تھی مگر اس کے پاس کوئی جواز نہ تھا، اس کا دل خالی ہو رہا تھا، اس کے باپ کے گرد مجمع لگا ہوا تھا، اسے لگا سب ہاتھ سے گیا، اس نے ھالار کو ایک میسج ٹائپ کیا، وہ یہ کہ ہائی وے پر پہنچنے سے پہلے میرا انتظار کرنا۔

☆☆☆

وہ فرید حسین کے ساتھ اندر آئی تھی، سکھی کو جیسے ناقابل یقین خوشی مل گئی تھی، وہ بہت خوش تھی، اس ایک لمحے میں جیسے انہیں منزل مل گئی ہو، فرید کچھ ہراساں ہو گیا تھا کہ اب کیا کرے، کیسے صفائی دے، اس نے نظروں ہی نظروں میں امر کلہ کو اشارہ کیا تھا مدد کا، وہ اسے انتظار کروا رہی تھی۔

قصہ الگ تھا، ہمیشہ کی طرح فاطمہ نے اسے ادا کہہ کر سلام کیا، ہمیشہ کی طرح اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ادی اور اماں کہا، سکھی منہ میں انگلی دبا کر رہ گئی، لڑکی کو خدا جانے کب عقل آئے گی، منہ اٹھا کر چلی آئی، وہ بھی اب ادی اماں نہ کہتا تو کیا کہتا، مگر دل نے کہا سکھی خوش ہو جا پر

معاملہ الگ ہے، دل ڈرا تھا، نرا وہمی جو تھا۔

کھانا کھایا گیا، سب خاموش تھے، امر کلہ اور فرید کھانا لائے تھے، فروٹ اور مٹھائی لائے تھے جس سے وہ مطمئن تھیں مگر ہول تو اٹھ رہے تھے، فرید حسین کے بولنے کا انتظار تھا، دس نے تمہید باندھی تھی، جب سکھی نے کہا تو آ گیا، ماں جی کے بلانے پر۔

''تو نے ماں پر احسان کیا ہے فریدے، اسے اشارہ مل گیا جیسے کہ اب بول فریدے، چپ بہت ہوئی، کہہ لے۔'' اس نے سر جھکا لیا۔

''ماں جی بلائے اور فریدہ نہ آئے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''ماں جی!'' اس وقت کمرے میں سکھی، نگار، امر کلہ، فرید تھے، پانچویں کو آنکھ کا اشارہ ملا فاطمہ منہ بنا کر نکل گئی، برتن مانجھتے ہوئے سو بار بڑبڑا رہی تھی۔

''ماں جی ہم بہن فاطمہ کے لئے رشتہ لائے ہیں، آپ دیکھئے لڑکا اعتبار کا ہے، بہت اچھا ہے، شریف ہے۔'' تصویر سکھی کے آگے کر دی۔

''مجھ سے زیادہ شریف ہے، مجھ سے زیادہ خوش شکل ہے، اپنے نصیب کا کماتا ہے، تانگہ چلاتا ہے، آگے جو دل کرے، حکم کریں تو کہہ دوں، آج شام ہی بھیا بھابھی کو لے آئے گا اور اگر آئے گا تو آپ نے انکار نہیں کرنا، اس لئے بہن سے مشورہ کر کے بتا دیں۔'' سکھی کو بولنے کا موقع تب دیا جب اپنی بات ختم کی، سکھی چپ تھی، ہاں کہہ سکی تھی نہ ہی نا۔

''فریدے ماں کو تو نے الجھا دیا۔''

''امر کلہ یہ تصویر لے جا، دکھا اسے اور کہہ ماں کا حکم ہے، مگر دل کی مرضی بتا، جو کہے اور آ کر مجھے سنا دے، وہ جو کہہ دے اس کے بعد تو کچھ نہیں کہنا، بس کہہ دینا جا۔'' تصویر بھلے مانس کی اسے تھمائی۔

امر کلہ تصویر لے کر باہر نکلی، فرید حسین نے ٹھنڈی سانس بھری اور سکھی کے چہرے پر چار شکنیں واضح تھیں، دل میں تسبیح کر رہیں تھیں خیر کی اور نگار کا ذہن ایک نیا منصوبہ بن رہا تھا۔

امر کلہ کچن میں آئی تھی۔

''فاطمہ سے کسی بھی قسم کی بات کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا تھا کہ کہیں اس کا دل نہ دکھے۔'' فاطمہ نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''فیصلہ سنانے آئی ہو؟ یا فیصلہ لینے؟''

''لینے آئی ہوں تو؟ اور اگر سنانے آئی ہوں تو؟'' وہ خود اٹکی تھی، تصویر ابھی دوپٹے کے پلو کے اندر چھپا رکھی تھی۔

''جھوٹ مت بولو امر کلہ، تمہیں جھوٹ بولنا نہیں آتا۔''

''فیصلہ لینے نہیں سنانے آئی ہو اور جب سنانے آئی ہو تو کچھ پوچھنے کی کیا تک بنتی ہے، ماں کو کہو فیصلہ سنایا ہے تو جو دل چاہے وہ کر لے، فاطمہ سے کیوں پوچھتی ہے، فاطمہ سے جب پوچھے گی تو جواب مہنگا پائے گی۔''

''تصویر دیکھو گی فاطمہ، میرا منہ بولا بھائی ہے۔''

''کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، بس یہ کہہ دو کہ جو بھی...... بس بھا فرید نہ ہو، بھا فرید کو ادا کہتی ہوں پر ابا سمجھتی ہوں۔''

''ادے اور ابے کی گالی مت دے، باقی جو چاہے سو کر لے۔'' وہ تصویر ویسے ہی لئے آئی، فرید سیدھا ہوا، سکھی فکر سے دیکھنے لگی۔

''کیا کہتی ہے؟''

''کہتی ہے بھا فرید کو ادا کہتی ہوں، پر ابا سمجھتی ہوں، ادے اور ابے کی گالی نہ دینا باقی جو چاہے سو کر لے۔'' فرید نے شکر کا سانس لیا۔

''بس انہیں کہہ کہ بھیج دے، اپنے ماں باپ، باپ بھیا بھابھی جسے چاہے بھیج دے، جب چاہے بھیج دے۔'' سکھی نے بات ختم کر دی تھی۔

اب بات فرید اور امر کلہ پر تھی، فرید نے سیل فون پر نواز حسین کا نمبر ملایا اور امر کلہ کی طرف بڑھایا۔

''بول بھا نواز، تیری مٹھائی تو لے آئی ہوں، کہہ تو بسم اللہ کروں، کہہ تو انتظار کرنا شروع کریں بھیا اور بھابھی کو بھیج دے۔''

نواز کے جیسے ہاتھ پاؤں بندھے تھے، پھر بھی مسکرایا۔

''جب تو نے آنکھ بند کر کے بات چلائی ہے تو بات بڑھا بھی تو، تو جو میری بہن بیٹھی ہے، بھیا بھابھی نکاح کا جوڑا لے کر آئیں گے، مٹھائی لائی ہے تو تیرے چار سو ضائع نہیں کرتا، تو بسم اللہ کر دے۔'' امر کلہ نے فون سکھی کو دیا، اس نے بات کر کے ذرا تسلی کر لی تھی۔

فرید مٹھائی کا ڈبہ لے کر آیا، سب سے پہلا لڈو جا کر فاطمہ کو کھلایا۔

''ادا کہتی ہے اور ابا سمجھتی ہے تو بھروسہ رکھنا، ادا تجھے کبھی چھوڑے گا نہیں فاطمہ، ابے کی طرح ساتھ نبھائے گا، آخری دم تک نبھائے گا۔''

اسے اس کے ابا نے بھی یہی کہا تھا، وہ تب تک سکھی رہی جب تک ابا سلامت تھا، جب ابا چلا گیا تو دنیا اندھیر ہو گئی اور جب شیرو گیا تو دنیا ہی نہ رہی تھی، آج نہ ابا تھا، نہ شیرو تھا، وہ ہونے جا رہا تھا جو کبھی سوچا نہ تصور کیا، بس یہی سمجھا ابے کے نہ ہوتے ہوئے کوئی ابا نہیں بنتا، اگر کوئی ابا بن جائے اور ادا کہلائے تو زندگی کے کچھ بکھرے رشتوں کو ایک کڑی مل جاتی ہے۔

اس کی آنکھ سے نہ آنسو نکلا نہ چہرے پر مسکراہٹ آئی، فریدہ خدا جانے کیوں افسردگی سے مسکرایا تھا اور اس کے سر پہ تھپکی دی، سہارا سارا رب کا، باقی سب بہانے، زندگی کو بہانہ ہی درکار تھا۔

(آخری قسط اگلے ماہ)

عمارہ امداد

مریم کالج سے آئی تو دیکھا سامنے صحن میں سکینہ کے ساتھ زلیخا خالہ بیٹھی ہوئی تھیں، انہیں دیکھتے ہی اس کے منہ کے زاویے بگڑنے لگے، مارے باندھے انہیں سلام کیا، ابھی انہوں نے جواب دیا ہی تھا کہ وہ جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی، وہ جانچتی نظروں سے اس کی پشت کو گھورنے لگیں۔

''تمہاری بیٹی کے تو مزاج ہی نہیں ملتے، جھٹ سے سلام کرنے کا فرض ادا کیا اور یہ جا وہ جا۔'' وہ ناگواری سے بولیں۔

''نہیں خالہ! ایسی بات نہیں، اصل میں اتنی گرمی ہے اوپر سے پڑھائی بھی اتنی مشکل ہے، تھکاوٹ ہو جاتی ہے، روزانہ آتے ہی کچھ دیر آرام کرتی ہے، کھانا بھی ٹھہر کر کھاتی ہے۔'' سکینہ نے بیٹی کی طرف داری کرتے ہوئے جلدی سے بات بنائی تو وہ سر جھٹک کر دوبارہ باتوں میں مصروف ہو گئیں جبکہ سکینہ نے ایک کڑی نگاہ کمرے کی کھڑکی سے نظر آتی مریم پر ڈالی تھی، یہ تو انہیں اچھی طرح پتہ تھا کہ مریم کو زلیخا خالہ ایک آنکھ نہیں بھاتی ہیں اور اس موضوع پر ان دونوں کی آپس میں تکرار بھی ہو جاتی تھی۔

مریم کے بقول زلیخا خالہ کا اِدھر کی بات اُدھر کرنے میں کوئی ثانی نہیں تھا اور وہ جان بوجھ کر بات اتنی ہوتی نہیں تھی جتنی اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر لوگوں میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کرتی تھیں، اس لئے اس کا خیال تھا کہ سکینہ کو ان سے میل جول کم کر دینا چاہے تھا لیکن سکینہ اس بات پر نہیں آتی تھیں، وہ کہتی تھیں کہ بائیس سال سے وہ اور زلیخا خالہ اسی محلے میں رہ رہی ہیں اتنا پرانا ساتھ ہے، دن رات کا آنا جانا ہے، وہ کیسے انہیں آنے سے منع کر سکتی ہیں۔

اس پر مریم کے پاس جواب تھا کہ اس بات سے زیادہ انہیں یہ بھی فکر ہے کہ اگر وہ ان کی طرف نہ آئیں تو امی کو محلے کی اور خاص طور پر تائی امی کی خبریں کون دے گا اور وہ تائی امی کی برائیاں پھر کس کے سامنے کریں گی لیکن یہ وہ صرف سوچ سکتی تھی ان سے کہہ نہیں سکتی تھی، کیونکہ کہنے کی صورت میں امی کی جوتیاں کون کھاتا۔

''سچی بات ہے خالہ! میں نے تو اب خالدہ سے میل جول رکھنا ہی نہیں ہے، اپنے آپ کو سمجھتی پتہ نہیں کیا ہے، بیٹا پڑھ کر نوکری کیا لگ گیا اس کے تو مزاج ہی نہیں ملتے، میری بیٹی کوئی گری پڑی نہیں ہے جو وہ یوں باتیں کرتی پھرتی ہے، اونہہ...... بڑا ناز ہے اسے بیٹے کی ماں ہونے پر، اگر زوہیب پڑھا لکھا برسر روزگار ہے تو میری بیٹی بھی پڑھی لکھی ہے اس میں بھی کسی چیز کی کمی نہیں۔''

وہ یونیفارم بدل کر ابھی بستر پہ آ کر بیٹھی ہی تھی جب اسے سکینہ کی آواز سنائی دی، اپنے اور زوہیب کے ذکر پر وہ ٹھٹک سی گئی اور وہی بیٹھے بیٹھے اس کے بارے میں سوچنے لگی، زوہیب اس کا تایا زاد تھا، گو کہ اس کے دل میں زوہیب سے متعلق کوئی بہت خاص قسم کے جذبات نہیں تھے، ایک تو وہ ماں اور تائی کی لڑائی جھگڑوں سے خائف ہوتی اس بارے میں سوچتی ہی نہ تھی اور دوسرے وہ لئے دیئے رہنے والی اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی لیکن یہ ضرور تھا کہ وہ زوہیب کے لئے دل میں نرم گوشہ ضرور رکھتی تھی، اس کی سلجھی ہوئی شائستہ طبیعت اور کردار کی اچھائی سے وہ متاثر ضرور تھی لیکن اگلے ہی لمحے جو تھوڑے بہت جذبات اس کے دل میں ابھرے تھے سکینہ کی آواز نے ان پر اوس پھیر دی تھی۔

''خالہ اسے جا کر کہہ دینا کہ یہ اس کی بھول

ہے کہ میں اس کے ساتھ رشتہ کرنے کی خواہش مند ہوں، اگر اسے کوئی چاہ نہیں ہے تو مجھے بھی کوئی چاہ نہیں، اس سے رشتہ کرتی ہے میری جوتی۔'' نخوت سے بولتی سکینہ کی باتوں سے اس کا دل بوجھل سا ہو گیا۔

یقیناً اب پھر زلیخا خالہ نے تائی امی کا کوئی پیغام ان تک پہنچایا تھا اور اسے پکا یقین تھا کہ آدھے سے زیادہ الفاظ کا خود زلیخا نے اضافہ کیا ہو گا۔

''پتہ نہیں امی اور تائی امی کی یہ سرد جنگ کب ختم ہو گی۔'' اس نے تاسف سے سوچا تھا۔

☆☆☆

''امی اور چچی جان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ دونوں دوسروں کے کانوں سے سنتی اور دوسروں کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کو سچ مانتی ہیں اور ایسا شروع سے ہے۔'' زوہیب اپنے گھنے سیاہ بالوں میں انگلیاں پھنسائے مضطرب سے انداز میں بولا۔

''میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے امی اور چچی کے آپس میں اختلافات ہی دیکھے ہیں، کچھ دن کے لئے صلح ہوتی ہے پھر کسی معمولی سی بات پر ناراضگی ہو جاتی ہے اور محلے والوں کو ایک چٹ پٹا موضوع مل جاتا ہے۔'' وہ قدرے بے بسی سے بولا تو جمیلہ نے لحظہ بھر کے لئے اسے دیکھا انہیں اس پر ترس آیا اور ہمدردی محسوس ہوئی، وہ پڑھا لکھا سمجھدار اور ماں کا انتہائی فرمانبردار بیٹا تھا اس لئے ماں کے منہ پر بدلحاظی کرتے ہوئے ان کی غلطیوں کی نشاندہی کبھی نہیں کر سکتا تھا، ایک دو دفعہ اس نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ خواہ مخواہ میں لوگوں کی باتوں میں نہ آیا کریں اور چچی سے جلدی بدگمان نہ ہوا کریں لیکن ان پر خاطر خواہ اثر نہ ہوا تھا ایک دو دفعہ تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئی تھیں پھر اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا تھا۔

''اچھا بیٹا تم پریشان نہ ہو، تم مجھے عاصم کی طرح عزیز ہو، میں اس پہلو پر سوچتی ہوں، انشاء اللہ ہم مل کر اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لیں گے، ابھی تو بیٹھو، میں چائے لے کر آتی ہوں، اب پرسکون ہو جاؤ اور سمجھو کہ تمہارا مسئلہ میرا ہے۔'' وہ اپنے مخصوص نرم، بردبار لہجے میں بولیں، ان کے لہجے کی مٹھاس اور ایقان سے اسے یک گونہ اطمینان محسوس ہوا۔

''بہت شکریہ آپ کی محبت کا، ابھی میں چلتا ہوں دفتر سے سیدھا ادھر ہی آیا ہوں امی کھانے پر انتظار کر رہی ہوں گی، پھر کبھی آؤں گا جب عاصم بھی ہو گا پھر اکٹھے چائے پئیں گے۔'' وہ اٹھتے ہوئے مہذب انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! بالکل تم گھر جاؤ، تھوڑی دیر زیادہ ہو جائے تو ماؤں کو فکر شروع ہو جاتی ہے، پھر امی کو بتا کر آنا کسی دن۔''

''جی آنٹی جی ضرور۔'' وہ مسکراتے ہوئے اٹھا اور سامنے اپنے گھر کی طرف چل دیا، جمیلہ چائے پینے کے دوران مریم اور زوہیب کے بارے میں سوچنے لگیں۔

☆☆☆

جمیلہ جس محلے میں رہتی تھیں یہ ایک مڈل کلاس لوگوں کا محلہ تھا، کچھ کی مالی حالت قدرے بہتر تھی، کچھ ایسے تھے کہ گزر اوقات اچھی ہو جاتی تھی جبکہ کچھ قدرے خراب مالی حالت میں گزر بسر کر رہے تھے، اس محلے میں زیادہ تر خاندان ایسے تھے جن کا کئی سالوں سے ساتھ تھا، ایک دوسرے کو جانتے تھے، جمیلہ شروع سے ہی اسی محلے میں رہتی تھیں، وہ قریبی سرکاری سکول میں پڑھاتی تھیں، انہوں نے گھر میں اکیڈمی بھی کھولی ہوئی تھی جہاں شام کو وہ بچوں کو ٹیوشن دیا کرتی تھیں، تقریباً محلے کے سارے بچے ہی ان سے ٹیوشن پڑھتے تھے کیونکہ یہاں رہائش پذیر زیادہ تر خواتین پڑھی لکھی نہیں تھیں اگر کچھ پڑھی تھیں تو وہ بھی واجبی سا ہی۔

جمیلہ پڑھی لکھی نہایت ٹھنڈے اور سلجھے ہوئے مزاج کی تھیں، سارے محلے میں ان کی عزت تھی اور ان کی بات کو اہمیت دی جاتی تھی، وہ اپنے محلے میں آپی جی کے نام سے مشہور تھیں، ان کے گھر کے سامنے زلیخا کا گھر تھا جنہیں سب چھوٹے بڑے زلیخا خالہ کہتے تھے، انہیں محلے کی سن گن لینے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کی بہت بری عادت تھی، زلیخا خالہ کے ساتھ خالدہ کا گھر تھا اور جمیلہ کے گھر سے تین گھر چھوڑ کر سکینہ کا گھر تھا، وہ دونوں آپس میں دیورانی جیٹھانی تھیں، خالدہ کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا زوہیب تھا جبکہ سکینہ کی تین بیٹیاں تھیں اور مریم سب سے بڑی تھی، خالدہ اور سکینہ کی آپس میں کوئی خاص نہیں بنتی تھی کیونکہ دونوں مزاج کی تیز اور جلد غصے میں آ جانے والی تھیں، شدید نوعیت کا جھگڑا تو ان میں کبھی نہیں ہوا تھا لیکن معمولی معمولی باتوں سے وہ ایک دوسرے کے خلاف دل میں گانٹھ باندھ لیتیں، ناراض ہو جاتیں لیکن پھر صلح بھی کر لیتیں، ماؤں کی آپس کی تکرار سے بچے نالاں رہتے، ان کے آپس کے اختلافات کے باوجود بچوں کی آپس میں بہت بنتی تھی، جب بھی ان کی آپس میں کوئی ناراضگی ہوئی ہوتی تو وہ اپنے اپنے بچوں کو ایک دوسرے سے ملنے سے روکتیں لیکن آپی جی کی اکیڈمی میں تو سب پڑھنے آتے تھے اس لئے یہاں وہ جی بھر کر باتیں کرتے کیونکہ آپی جی کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہ ہوتی بلکہ وہ ہمیشہ انہیں آپس میں میل جول رکھنے کی تلقین کرتیں اور ہمیشہ انہیں یہی سمجھاتیں کہ وہ اپنی ماؤں کی طرح آپس میں نہیں جھگڑے گے، اسی لئے وہ سب کی پسندیدہ تھیں، خاص طور پر زوہیب اور مریم تو ان کے بہت قریب تھے، زوہیب ان کے بیٹے عاصم کا دوست تھا جبکہ مریم ان کی بیٹی صبا کی دوست تھی اس لئے ان کی طرف ان کا آنا جانا لگا ہی رہتا تھا، زوہیب مریم سے تین سال بڑا تھا، کمپیوٹر سائنس میں ایم ایس سی کرتے ہی اسے فوراً ایک اچھی کمپنی میں نوکری مل گئی تھی، مریم بی ایس سی کے فائنل میں تھی، زوہیب کو مریم شروع سے ہی بہت اچھی لگتی تھی گو کہ ان کے درمیان کوئی جذباتی تعلق تو نہیں تھا لیکن وہ جب بھی اپنی شریک حیات کا تصور کرتا تو ہمیشہ تصور کے پردے پر مریم کی ہی شبیہ لہراتی، کچھ دنوں سے خالدہ گھر میں اس کی شادی کا تذکرہ کر رہی تھیں چونکہ اس کی خواہش مریم سے شادی کرنے کی تھی لیکن وہ ماں کے شدید ردعمل کے ڈر سے اس موضوع پر ان سے بات نہیں کر پایا تھا۔

خالدہ اور سکینہ میں تو شروع سے کوئی خاص نہیں بنتی تھی لیکن اصل بات جس نے زوہیب کو پریشان کیا ہوا تھا کہ تقریباً دو ماہ سے ان دونوں نے ایک دوسرے سے ملنا جلنا چھوڑا ہوا تھا، ایک دوسرے سے بول چال بھی بند تھی، اصل بات تو اسے پتہ نہیں تھی کہ اس دفعہ اتنی شدید ناراضگی کی کیا وجہ ہے؟ اس لئے اس نے جمیلہ سے بات کی تھی اور انہیں یہ کام سونپا تھا کہ وہ خالدہ سے اس موضوع پر بات کریں اور یہ بھی پتہ کرنے کی کوشش کریں کہ ان کے درمیان کیا ناراضگی ہے۔

''آج تو جمعہ ہے کل سکول بھی جانا ہے، اتوار والے دن خالدہ کی طرف جا کر زوہیب کی

شادی کے متعلق بات شروع کر کے دیکھتی ہوں اور اس کی رائے جاننے کی کوشش کرتی ہوں۔'' وہ دل ہی دل میں پروگرام ترتیب دیتی گھر کے دیگر کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

☆☆☆

آج اتوار تھا جمیلہ کا خالدہ کی طرف جانے کا ارادہ تھا، چونکہ چھٹی تھی اس لئے عاصم اور صبا ابھی تک سو رہے تھے، وہ گھر کے چھوٹے موٹے کام نپٹا کر ابھی فارغ ہی ہوئی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی، انہوں نے دروازہ کھولا تو سامنے زلیخا خالہ تھیں، سلام دعا کے بعد وہ انہیں اندر لے آئیں۔

''ارے بیٹھو جمیلہ! کسی تکلف میں نہ پڑنا، سامنے سے ہی تو آئی ہوں، مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' جمیلہ کو اٹھتے دیکھ کر زلیخا نے روکا۔

''آپ بیٹھیں خالہ، میں ابھی آتی ہوں، یہ سامنے ہی تو باورچی خانہ ہے۔'' وہ جھٹ پٹ ان کے لئے اسکوائش بنا لائیں۔

''جی خالہ! آپ کوئی بات کرنا چاہ رہی تھیں۔'' وہ ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''اصل میں بات یہ ہے کہ خالدہ آج کل زوہیب کے لئے رشتے دیکھ رہی ہے، زوہیب ماشاء اللہ دیکھا بھالا شریف لڑکا ہے، میری بیٹی کو تو تم جانتی ہو جو تین گلیاں چھوڑ کر رہتی ہے اور اس کی بیٹی شبانہ کو بھی جانتی ہو تمہارے ہی سکول میں پڑھتی ہے۔''

''جی...... جی بالکل۔'' جمیلہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں چاہ رہی تھی کہ خالدہ زوہیب کے لئے شبانہ کا رشتہ مانگ لے، خود سے کہتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا اس لئے سوچا کہ تم سے بات کروں۔'' وہ اصل مقصد کی طرف آئیں۔

''تم سمجھ رہی ہو نا میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں۔''

''جی...... جی میں آپ کی بات بہت اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔'' جمیلہ نے پر سوچ انداز میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس کسی طرح یہ رشتہ ہو جائے، زوہیب جیسا لڑکا میری بیٹی کو داماد کی صورت مل جائے تو اور کیا چاہیے، تم خالدہ سے بات کرو گی تو وہ ضرور اس بات پر غور کرے گی اور تمہاری رائے کو اہمیت بھی دے گی۔'' زلیخا کی بات اور ان کے انداز پر وہ ٹھٹک سی گئی تھیں۔

''بس تم نے جلد ہی خالدہ سے ضرور بات کرنی ہے۔'' انہوں نے ایک دفعہ پھر انہیں مخاطب کیا۔

''جی اگر مناسب موقع ملا تو بات کروں گی۔'' جمیلہ نے فی الوقت انہیں ٹالا۔

''اچھا اب میں چلتی ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں اور اپنے گھر کی طرف چل دیں جبکہ جمیلہ خالدہ کی طرف جانے کا ارادہ بدل کر سنجیدگی سے ذہن میں در آتی سوچ پر غور کرنے لگیں۔

☆☆☆

سکینہ جیسے ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو سامنے بیٹھی خالدہ کو دیکھ کر ان کے چہرے پر جھٹ سے مسکراہٹ کی جگہ ناگواری نے لے لی جبکہ جواباً خالدہ کے ماتھے پر بھی قوسی شکن ابھر آئی، جمیلہ کے گھر آمنا سامنا دونوں کو ہی قطع پسند نہ آیا تھا، سکینہ اب واپس تو پلٹ نہیں سکتی تھیں کیونکہ اس طرح تو خالدہ کے سامنے ان کی سبکی ہوتی کہ انہیں یہاں دیکھ کر وہ بیٹھ بھی نہ سکیں۔

''میں اس سے ڈرتی ہوں کیا؟'' انہوں نے دل میں سوچا اور مارے باندھے ان کی جانب سے تھوڑا سا رخ پھیر کر کچھ فاصلے پر رکھے صوفے پر بیٹھ گئیں، جمیلہ کو ان کے تاثرات پر تاسف کے ساتھ ساتھ ہنسی آ گئی۔

خواہ مخواہ میں ان دونوں عورتوں نے چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے آپس میں بیر ہی باندھ لیا تھا اور ان کی لڑائی میں ان کے بچے پس رہے تھے لیکن اس چیز کا ان کو احساس نہیں تھا۔

''آپ نے مجھے یہاں اس کی شکل دیکھنے کے لئے بلایا تھا۔'' تھوڑی دیر بعد ہی سکینہ، جمیلہ کو مخاطب کر کے بولیں، ان کے یوں تڑخ کر بولنے سے خالدہ کو تو تپ ہی چڑھ گئی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ خود کو بہت اعلیٰ بہت توپ چیز سمجھتی ہو ناں۔'' خالدہ کیوں پیچھے رہتیں جھٹ سے میدان جنگ میں کود پڑیں۔

''میں نے آپ دونوں کو اس لئے اکٹھے بلایا ہے کہ آپ دونوں ہمیشہ آمنے سامنے لڑنے کی بجائے اپنے اپنے گھروں سے دوسرے لوگوں کے ذریعے ایک دوسرے کو پیغام بھیجتی رہتی ہیں جس کا لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور چھوٹی سی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور اس طرح بات ختم ہونے کی بجائے بڑھتی جاتی ہے جس سے دلوں میں بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں، اس لئے اب آپس میں جو گلے شکوے ہیں ان کو ایک دوسرے سے بات کر کے ختم کریں، میں چائے لے کر آتی ہوں۔'' جمیلہ رسان سے اپنی بات کہہ کر ڈرائنگ روم سے باہر آ گئیں۔

جمیلہ کی بات پر دونوں لحظہ بھر کے لئے خجالت محسوس کرتی خاموش سی ہو گئیں لیکن تھوڑی دیر بعد ہی دونوں میں اچھی خاصی تو تو میں میں شروع ہو چکی تھی۔

''الٰہی خیر! امی آپ نے بھڑوں کے چھتے پر ہاتھ ڈال دیا ہے اللہ ہی خیر کرے۔'' جمیلہ چائے رکھ کر دوسرے کمرے میں بیٹھے عاصم اور صبا کے پاس آئیں تو عاصم ان سے مخاطب ہوا۔

''بھڑوں کے چھتے پر نہیں شہد کی مکھیوں کے چھتے پر ہاتھ ڈالا ہے اور تمہیں پتہ ہی ہے کہ جب ایک دفعہ شہد کی مکھیاں قابو میں آ جائیں تو پھر شہد کی صورت میں کتنا فائدہ پہنچاتی ہیں، یہی حال ان دونوں کا ہے، دل کی بری نہیں ہیں بس ذرا زبان کی کڑوی ہیں اور دوسروں کی باتوں میں آ جانے والی ہیں، ایک دفعہ ان کے گلے شکوے دور ہو جائیں تو راوی چین ہی چین لکھے گا، انشاء اللہ۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔'' دونوں یک زبان ہو کر بولے تو وہ مسکراتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں، اتنے میں عاصم کے موبائل کی میسج ٹون بجی۔

''کیا حالات ہیں؟'' زوہیب کا میسج تھا۔

''دعا کرو بات چیت جنگ کی صورت اختیار کرنے کی بجائے مذاکرات میں ڈھل جائے۔'' جواباً عاصم نے میسج کیا۔

جمیلہ نے آج ان دونوں کو اپنی طرف بلایا تھا جس کا عاصم اور صبا نے زوہیب اور مریم کو بھی بتایا تھا، اس لئے وہ دونوں اپنے اپنے گھر میں بیٹھے بے چین سے تھے، زوہیب نے تو چونکہ خود جمیلہ سے اس بارے میں بات کی تھی اس لئے اسے تو زیادہ ہی بے چینی تھی۔

''کیا تم نے زلیخا خالہ سے یہ نہیں کہا تھا کہ بیٹے کی نوکری لگتے ہی خالدہ کی گردن میں سریا فٹ ہو گیا ہے، بہت نخرے والی ہو گئی ہے، حالانکہ ایسی بات نہیں ہے، سارا محلہ گواہ ہے کہ مجھ میں نہ پہلے نخرہ تھا اور نہ اب ہے۔''

''ہاں! میں اس بات سے انکار نہیں کرتی کہ میں نے تمہارے بارے میں کچھ کہا لیکن

ابتداء تو تم نے کی تھی نا، مجھے تو غصہ آنا ہی تھا۔''

''لو جی، میں نے کس بات کی ابتداء کی؟ بتاؤ تو ذرا۔'' خالدہ نے سوالیہ نظروں سے سکینہ کو دیکھا۔

جمیلہ چائے لے کر آئیں تو ان کے گلے شکوے جاری تھے اور اب یقیناً وہی بات کھلنے والی تھی جس کی بناء پر وہ ایک دوسرے کے خلاف دل میں کدورت رکھے ہوئے تھیں، وہ چائے کی ٹرے رکھ کر خاموشی سے ان کے پاس بیٹھ گئیں۔

''تم نے زلیخا خالہ کے سامنے کہا کہ میں تو بہت اونچے گھرانے میں اپنے بیٹے کی شادی کروں گی اور سکینہ کی بیٹی تو اس قابل نہیں کہ میں اپنے بیٹے کا رشتہ کروں اس سے۔'' سکینہ جواباً جھٹ سے بولیں۔

''خدا کا خوف کرو، میں نے یہ سب کب کہا ہے۔'' خالدہ حیران ہوتے ہوئے بولیں۔

''بلکہ تم یہ کہا تھا کہ خالدہ کا بیٹا جتنا بھی پڑھ لکھ جائے رہے گا تو خالدہ جیسی چلتر عورت کا بیٹا اور میں تو ایسی عورت کو کبھی اپنی بیٹی نہ دوں۔'' خالدہ بھی دوبدو بولیں۔

''لو بھئی، یہ تو وہ بات ہوگئی، الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے، تو کیا تم نے میری بیٹی کے بارے میں باتیں نہیں کیں؟ اور تو اور اس کے کردار پر بھی انگلی اٹھائی، میں پوچھتی ہوں کیا عیب دیکھا تم نے میری بیٹی میں جو اس پر الزام تراشی شروع کر دی۔'' سکینہ کے لہجے میں دکھ بول رہا تھا، اس کی بات پر تو خالدہ تڑپ ہی گئیں۔

''سکینہ! میری ایک بات یاد رکھنا، ہمارے آپس میں جتنے بھی اختلافات ہوں، شاید تمہارے نزدیک میں بہت بری ہوں گی مگر یہ یاد رکھنا کہ میں کبھی مریم کے بارے میں کوئی بات نہیں کر سکتی کجا کہ اس کی کردار کشی کرلوں، وہ ہمارے خاندان کی عزت ہے، مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز ہے اور مجھے وہ دل سے پسند ہے۔'' خالدہ بولیں تو ان کا لہجہ سچائی لئے ہوئے تھا۔

''اسی لئے تو میں نے زلیخا خالہ کے ذریعے مریم کے رشتے کے لئے پیغام بھجوایا تھا لیکن تم نے اتنی باتیں کیں اور اس کے بعد مجھ سے ناراضگی بھی کر لی تو مجھے بھی غصہ آ گیا کہ اگر تم مجھے نہیں بلاتی تو میں کیوں بلاؤں۔'' انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید وضاحت دی، ان کے اس بات پر جمیلہ نے چونک کر بے یقینی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے ان کو دیکھا تھا، یعنی ان کی بھی یہی خواہش تھی جو زوہیب کی تھی اور سکینہ کو تو ان کی بات پر حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

''لیکن زلیخا خالہ نے تو مجھے ایسا کچھ نہیں بتایا، اصل میں بات یہ ہے کہ میری تو خود یہی خواہش تھی کہ اگر مریم کا رشتہ تمہارے ہاں ہو جائے تو میری بیٹی میرے قریب ہی رہے گی لیکن میں سوچتی تھی کہ پتہ نہیں تم اس بارے میں کیا سوچ رکھتی ہو، اس لئے میں نے زلیخا خالہ سے سرسری سا ذکر کیا تھا کہ وہ تمہارے خیالات جاننے کی کوشش کریں اور کچھ دنوں بعد انہوں نے مجھے یہ سب کہا جو میں نے تمہیں بتایا ہے، جب انہوں نے کہا کہ تم نے مریم کے کردار پر باتیں کیں ہیں تو مجھے تم پر غصہ آیا اس لئے میں تم سے ناراض ہو گئی۔'' سکینہ کے لہجے میں تاسف اور خجالت یک بیک محسوس کی جاسکتی تھی۔

''تو میرا خدشہ صحیح تھا، زلیخا خالہ ان دونوں کے درمیان غلط فہمیاں پال رہی تھیں۔'' جمیلہ نے دل میں سوچا اور ان سے مخاطب ہوئیں۔

''ایک منٹ، اب میری بات سنیں، مزید گلے شکوے ختم کریں اور یہ سوچیں کہ اگر آپ

دونوں نے یہ سب باتیں نہیں کیں تو پھر یہ سب باتیں کس نے اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر آپ تک پہنچائی ہیں؟'' جمیلہ کی بات پر دونوں پر سوچ انداز میں چپ سی کر گئیں اور عین اسی لمحے زلیخا خالہ جمیلہ کے گھر آ گئیں، انہوں نے ان دونوں کو جمیلہ کے گھر آتے دیکھا تو مارے تجسس کے ان سے رہا نہیں جا رہا تھا اس لئے سن گن لینے کے لئے وہ ان کے گھر آئی تھیں۔

جمیلہ نے ایک نظر انہیں دیکھا، معاملہ سمیٹنا زیادہ آسان ہو گیا تھا، جس نے ان کے درمیان غلط فہمیاں ڈالی تھیں وہ اپنی ٹوہ لینے کی عادت سے مجبور خود ہی چل کر ان کے گھر آ گئی تھیں۔

''ادھر ہی آ جائیں خالہ۔'' جمیلہ انہیں ان دونوں کے پاس ہی لے آئیں۔

''اب تک کی باتوں سے مجھے تو یہی سمجھ لگی ہے کہ آپ دونوں اپنی زیادہ تر باتیں زلیخا خالہ کے سامنے کرتی ہیں اور ان کے ذریعے ہی ایک دوسرے تک اپنی بات پہنچاتی رہی ہیں تو اب خالہ تو پاس ہی موجود ہیں ان کے سامنے بات واضح کر لیں۔'' جمیلہ کے کہنے پر یکدم ہی زلیخا خالہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

کچھ لوگ زلیخا جیسے ہوتے ہیں جو چھوٹی سی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور دوسروں کے درمیان رنجشیں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مزید لڑائی جھگڑے کو طول دیتے ہیں لیکن اسی دنیا میں کچھ لوگ آپی جمیلہ جیسے مخلص بھی ہوتے ہیں جو کہ لوگوں میں لڑائی ہوتی دیکھ کر ان میں صلح کرواتے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں جمی میل صاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی کوشش وہ اس وقت بھی کر رہی تھیں۔

''ہاں...... ہاں کیوں نہیں، خالہ سامنے ہی بیٹھی ہے پوچھ لو ان سے، میں نے مریم کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہا، کیوں خالہ؟'' خالدہ نے سکینہ اور زلیخا کو ایک ساتھ مخاطب کر کے کہا تو وہ سکینہ بھی ان سے استفسار کرنے لگیں اور پھر تو پوچھنے کا سلسلہ ہی شروع ہو گیا۔

زلیخا خالہ تو پہلے ہی گھبرا گئی تھیں اب تو ان کے ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے، ان کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں جب آدھی سے زیادہ باتیں تو انہوں نے من گھڑت بنائی تھیں۔

''بھئی مجھے اپنے گھریلو معاملات سے دور ہی رکھو، خود آپس میں تمہارا اتفاق نہیں ہے تو دوسروں کو کیوں درمیان میں گھسیٹتی ہو، مجھے کیا پتہ کرتی ہو گی تم دونوں ایک دوسرے کے خلاف باتیں، مجھے تو کچھ نہیں پتہ۔'' وہ ایک دم سے اٹھیں، جب کوئی جواب نہ بن پایا تو الٹا انہیں ہی سنا کر وہ اپنے گھر کا رخ کرنے لگیں۔

بات اتنی سی تھی اندیشہ ہائے عجم نے اسے بڑھا دیا ہے فقط زیب داستاں کے لئے

برسوں پہلے یہ شعر اقبال نے کسی اور پس منظر میں کہا تھا لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں موجود ایسے کرداروں کے لئے ہی کہا گیا ہو، جمیلہ تاسف سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہیں اور وہ دونوں تو حیرت اور دکھ کی ملی جلی کیفیت میں گھری ہوئی تھیں، کچھ دیر خاموشی چھائی رہی، جمیلہ نے بھی بولنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اب بات تو ان کے سامنے کھل ہی چکی تھی۔

''مجھے تو حیرت ہو رہی ہے، زلیخا خالہ کو میری بیٹی سے کیا دشمنی تھی جو انہوں نے ایسے سوچا۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سکینہ دکھ سے بولیں۔

''مجھے تو خود حیرت ہو رہی ہے، اتنے برسوں کا ساتھ ہے، میں تو دل سے ان کی عزت کرتی تھی اور وہ جو کہتی تھیں مان بھی لیتی تھی کہ اس عمر میں وہ جھوٹ کیوں کہیں گی، افسوس ہو رہا ہے ان کی سوچ اور ذہنیت پر۔'' خالدہ بھی کف افسوس ملتے ہوئے بولیں۔

''اگرچہ یہ آپ دونوں کا ذاتی معاملہ ہے لیکن بات چونکہ میرے گھر میں میرے سامنے چل رہی ہے، اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں کچھ کہہ سکتی ہوں۔'' جمیلہ نے باری باری دونوں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جی آپی جی، آپ ضرور کہیں بلکہ آپ تو ہم سے زیادہ سمجھدار ہیں ہمیں مشورہ بھی دیں۔'' سکینہ فوراً بولیں تو خالدہ نے بھی ان کی تائید کی۔

''بات اصل میں یہ ہے کہ اگر زلیخا خالہ نے باتیں کی ہیں تو انہیں یہ حق کس نے دیا؟ آپ دونوں نے، کیونکہ چھوٹے موٹے اختلافات تو ہر گھر میں ہر رشتے میں ہو ہی جاتے ہیں لیکن اپنے گھر کی بات کو گھر میں ہی نمٹانا چاہیے بجائے اس کے کہ دوسروں کے سامنے واویلا کیا جائے اس سے دوسروں کو آپ کے معاملات میں بولنے کا موقع مل جاتا ہے، اس محلے میں ہم سب کو کئی برس گزر گئے رہتے ہوئے، اتنے موسم آئے گئے ہم اکٹھے ہی ہیں، سب ایک دوسرے کی عادات سے واقف ہیں، اس لئے انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور چھوٹی سی بات کو مزید ہوا دے کر آپ دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا دیا اور یہ بات کہ زلیخا خالہ نے ایسا کیوں کیا تو ہم سب کو ان کی فطرت کا پتہ ہے کہ انہیں ایک دوسرے کی باتیں کرنے کی عادت ہے، یہ سادہ سی بات ہے جو آپ کے سامنے بیٹھ کر کسی کی برائی کر سکتا ہے وہ کسی اور کے سامنے آپ کی برائی بھی کر سکتا ہے، اس لئے ایسے لوگوں سے محتاط رہنا چاہیے، میل جول رکھنے میں کوئی حرج نہیں لیکن ضرورت کے تحت اور اپنے معاملات میں تو قطعاً شامل نہیں کرنا چاہیے اور آپ دونوں نے اپنے بچوں کے رشتے جیسے نازک معاملے میں ان کو شامل کیا بگاڑ تو پیدا ہونا ہی تھا، اس لئے اب آئندہ کے لئے محتاط رہیں۔'' انہوں نے سلیقے سے اپنی بات ان تک پہنچائی کہ انہیں برا بھی نہ لگے اور اپنی غلطی کا احساس بھی ہو جائے۔

انہوں نے دانستہ شانہ والی بات کا ذکر نہیں کیا تھا کیونکہ ضرورت کسی کی کہی بات اچھالنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر معاملہ سیدھی طرح سدھر رہا ہو تو کسی کی پردہ پوشی کر لی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

''بات تو آپ کی صحیح ہے خواہ مخواہ میں چھوٹے موٹے اختلافات پال کر پھر ان کا ڈھنڈورا پیٹنے سے کچھ نہیں ملتا الٹا لوگ الزام تراشی ہی کرتے ہیں، وقتی طور پر ہمدردی کرتے ہیں اور پھر پیٹھ پیچھے برائیاں کرتے ہیں۔'' خالدہ شرمندہ لہجے میں بولی تو سکینہ نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

''چلیں اب اس بات کو یہیں ختم کریں اور ایک دوسرے کی طرف سے دل صاف کر لیں، چائے تو ٹھنڈی ہو گئی ہے میں گرم کر کے لاتی ہوں پھر مل کر پیتے ہیں آپ تب تک اپنے بچوں کی شادی کی تیاریوں پر غور کریں۔'' جمیلہ نے مسکرا کر کہا تو وہ دونوں بھی مسکرا دیں تو وہ چائے کی ٹرے اٹھا کر ڈرائنگ روم سے باہر آ گئیں، صبا اور عاصم دونوں کے کان اسی طرف لگے ہوئے تھے اور بظاہر اندر سے آتی آواز میں سب ٹھیک ہو جانے کی ہی نوید سنا رہی تھیں۔

جمیلہ نے باہر نکلتے ہوئے سامنے صحن میں بیٹھے عاصم اور صبا کی طرف مسکرا کر دیکھا تو وہ دونوں بھی خوش ہو گئے

''پتہ نہیں اب یہ صلح کتنے دن چلے گی اور یہ طوفان کتنے دن خاموش رہتا ہے۔'' عاصم نے سکینہ اور خالدہ کی لڑائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا خدشہ بیان کیا۔

''فکر نہیں کرو، فی الحال طوفان تھم چکا ہے اور دوبارہ متوقع طوفان آنے سے پہلے ہی ہم زوہیب اور مریم کے رشتے کی زنجیر سے اس طوفان پر بند باندھ دیں گے، پھر دیکھنا اختلافات کی صورت میں جتنی بھی طوفانی لہریں بھریں اس زنجیر تک پہنچتے پہنچتے خود ہی نرم پڑ جایا کریں گی۔'' جمیلہ نے معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے عاصم کے انداز میں ہی وضاحت کی تو ان دونوں کے ہونٹوں پر بھی آسودہ مسکراہٹ بکھر گئی پھر وہ چائے گرم کرنے چل دیں جبکہ ان دونوں نے جلدی سے اپنے اپنے موبائل اٹھائے۔

''تمہارے لئے بہت اچھی خبر ہے، شام کو تمہاری طرف آ کر تفصیل سے بتاؤں گی۔'' صبا کا میسج پڑھتے ہی مریم سکون آمیز کیفیت میں گھر گئی تھی۔

''مبارک ہو، مذاکرات کامیاب ہو گئے۔'' دوسری طرف عاصم کے مختصر سے میسج نے زوہیب کو اندر تک سرشار کر دیا تھا۔

بعض دفعہ مختصر اور عام سے الفاظ اندر تک خوشیوں کے پھول کھلا دیتے ہیں کیونکہ ان میں چھپا پیغام اور مفہوم خوشیوں کا پیامبر بن کر آتا ہے۔

جواباً عاصم کو کامیابی کا نشان بنا کر میسج بھیجتے ہوئے دل سے امڈتی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کا گھیراؤ کیا تھا۔

☆☆☆

اشک رحمت حجاب بہہ

حمیرا نوشین

"رطابہ میری پیاری بہنا جلدی سے یہ میری شرٹ پریس کر دو اور ہاں دو کپ چائے ساتھ میں کباب بھی فرائی کر لینا، صولت آیا ہوا ہے ہم نے کہیں جانا ہے۔" عارب نے شرٹ اس کی طرف اچھالی اور جلدی سے حکم صادر کرتا ہوا کمرے سے نکلنے لگا تو رطابہ کی طرف اچھالی ہوئی شرٹ اس کے کاندھوں پر لاڈلے بچے کی طرح سوار ہو گئی۔

"مجھ سے نہیں اتنی خدمتیں ہوتیں، رطابہ یہ کر دو، رطابہ وہ کر دو اب دوست آ رہے ہیں چائے بنا دو پانی پلا دو کمرے کی ڈسٹنگ کر دو، رطابہ نہ ہوئی بے دام غلام ہو گئی مجھ سے نہیں ہوتے یہ سب کام بیگم لے آؤ۔" وہ کورا جواب دے کر پھر سے مووی دیکھنے میں مگن ہو گئی۔

"بیگم تو تمہیں یہاں سے نکالنے کے بعد ہی آئے گی کیونکہ امی نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے پہلے تمہیں رخصت کریں گی بعد میں بہو گھر میں قدم رکھے گی ورنہ میرا تو دل چاہتا ہے کہ جلدی سے اس گھر میں تمہاری ایک عدد بھابھی جلوہ افروز ہو جائے اور میں اپنے ساتھ ساتھ تمہاری بھی خوب خدمت کرواؤں مگر وائے حسرت، فی الحال تو مجھے اپنی پیاری بہنا کی ہی منت سماجت کرنی ہے۔" وہ مسکینیت بھرے لہجے میں بولا تو رطابہ کو اس پر ترس آ گیا اور اسے گھورتے ہوئے کچن کا رخ کیا تو عارب بھی مسکراتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف ہو لیا۔

اُدھر رطابہ نے گریجویشن مکمل کی اور اُدھر چھوٹی خالہ اس کا رشتہ لئے نازل ہو گئیں خالہ کے پڑوس میں بڑی اچھی فیملی رہتی تھی لڑکا وکیل تھا اور والد افسر تھے، چھوٹے بہن بھائی ابھی پڑھ رہے تھے رشتہ ہر لحاظ سے اچھا تھا لڑکے نے ایک دو بار رطابہ کو خالہ کی طرف آتے جاتے دیکھا تو فوراً ماں سے پسندیدگی کا اظہار کیا اور لڑکے کی والدہ وقت ضائع کیے بغیر رطابہ کی خالہ کے پاس سوالی بن کر جا پہنچیں، خالہ کے بچے چونکہ ابھی رطابہ سے چھوٹے تھے اس لئے ان کا تو کوئی حق ہی نہیں بنتا تھا وہ فوراً بڑی بہن کے گھر رطابہ کا رشتہ لے کر پہنچ گئیں اور انہیں ہر طرح سے قائل کرنے لگیں، آرزو کی بھی ان لوگوں سے دو چار بار بہن کے گھر ملاقات ہو چکی تھی انہیں بھی وہ ہر لحاظ سے ٹھیک لگے تھے اس لئے فوراً ہی شوہر سے بات کر کے اپنی پسندیدگی ظاہر کر دی چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا رطابہ کے آگے پڑھنے کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے، بس ذہن میں ماں کا ایک فقرہ لئے خوشی خوشی شوہر کے گھر میں قدم رکھا کہ بیٹی اب تم جہاں جا رہی ہو اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھنا، تمام فکر و پریشانیوں کو بالائے طاق رکھ کر وہ اپنے نئے گھر میں داخل ہو چکی تھی۔

نیا گھر اپنا گھر جس کو وہ خوشیوں کی آماجگاہ سمجھ کر کھلی جا رہی تھی ساس سسر کی اپنائیت، چھوٹی نند کا ساتھ، دیور کی شرارتیں اسے منفی رویوں کی طرف سوچنے ہی نہ دیتے، سب سے بڑھ کر روحیل کا خوبصورت ساتھ جس کی ہمراہی میں

اسے دنیا حسین تر دکھائی دیتی، دو ماہ کا عرصہ پلک جھپکتے گزرا، روحیل نے اسے خوب گھمایا پھرایا اس کی چھوٹی چھوٹی فرمائشوں کو فرض اولین کی طرح پورا کیا، اس کے خوبصورت محبتوں میں ڈوبے جملے زندگی بھر خوش رکھنے کے وعدے، مخمور نگاہیں دن بھر اس کے ہونٹوں پر مسکان بکھیرے رکھتے۔

"پتا نہیں کیسی لڑکیاں ہوتی ہیں جو سسرال کو قید خانہ اور سسرالی رشتوں کو بوجھ سمجھتی ہیں میری دوست اقراء کی شادی میری شادی سے کچھ عرصہ

قبل ہی ہوئی ہے مگر ہمیشہ زبان پر شکوے ہی رہتے ہیں مجھے تو اس کی باتیں زہر لگتی ہیں ایک نمبر کی جھوٹی لڑکیاں ہوتی ہیں جو اپنے سسرال کی خامیوں کو ہی موضوع سخن بنا کر رکھتی ہیں۔'' وہ روحیل کے سینے پر سر رکھے اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھی اور وہ اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے اس کی معصوم باتوں پہ مسکرائے جا رہا تھا کب باتیں کرتی کرتی وہ نیند کی وادیوں میں گئی اسے پتا ہی نہ چلا۔

☆☆☆

شادی کے دو ماہ بعد کھیر پکائی کی رسم ادا کی گئی اور شائستہ خاتون کچن بہو کے سپرد کر کے کھانے پکانے کے جھنجھٹ سے آزاد ہو گئیں۔

''لو بھئی رطابہ بیٹا یہ گھر یہ کچن اب تمہارا ہے اپنا گھر سمجھ کر اسے سنوارو، نکھارو سب تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' ساس کے منہ سے یہ فقرے سن کر اس کا سیروں خون بڑھ گیا چہرے پر خوشی دمکنے لگی، اتنے بڑے گھر کی مالکن صرف میں ہوں یہ میرا اپنا گھر ہے یہاں میری مرضی چلے گی جو دل چاہے پکاؤں جب دل چاہے اس کی سیٹنگ بدلو کیونکہ یہ میرا گھر ہے، خوشی سے سرشار اس نے شائستہ خاتون کے ہاتھ چوم لئے تو وہ بھی دھیمے سروں میں مسکراتی اپنے بیڈ روم کی طرف ہو لیں، اپنے گھر کا خوبصورت احساس لئے وہ خوابوں کے محل میں سفر کر رہی تھی کہ روحیل نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔

''رطابہ اب اٹھ بھی جاؤ ناشتے کی ٹیبل پر سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''مجھے ابھی ناشتہ نہیں کرنا مجھے نیند آ رہی ہے میں بعد میں کر لوں گی۔'' نیند سے بوجھل آواز میں اپنا فیصلہ سنا کر وہ پھر سے نیند کی لپیٹ میں جانے لگی تو روحیل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا کر بٹھا دیا۔

''میڈم آپ کے ناشتے کی بات نہیں کر رہا میں، سب لوگ ٹیبل پر اس انتظار میں ہیں کہ کب تم ان کو ناشتہ سرو کرو۔''

''مگر ناشتہ تو امی بناتی ہیں۔'' وہ حیران ہوئی۔

''امی بناتی تھیں، تمہیں شاید یاد نہیں کہ کل امی نے تمہیں باور کرا دیا تھا کہ یہ گھر اب تمہارا ہے اب اس گھر کی تمام تر ذمہ داری تمہاری ہے اٹھ کر جلدی سے ناشتہ بناؤ، پہلے ہی دن سب کے سامنے شرمندہ کروا دیا۔'' ناراض لہجے میں کہتا وہ کمرے سے باہر نکل گیا، یہ سب سن کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے جلدی جلدی ہاتھ منہ دھو کر کچن کا رخ کیا سب ٹیبل پر اس کے بنائے گئے ناشتے کے منتظر تھے، وہ شرمندہ ہوتی جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔

''بھابھی پلیز جلدی کریں میری وین آنے والی ہے دس منٹ رہ گئے ہیں خالی پیٹ میرا کالج جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' قدرے منہ پھلائے نند نے فرمان جاری کیا تو اس نے پھرتی سے دو سلائس سینک کر انڈا ہاف فرائی کر کے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی ساتھ ہی چائے کا پانی دوسرے چولہے پر رکھ دیا۔

''رطابہ جلدی سے اپنے ابو کے لئے ناشتہ لے آؤ، شوگر کی ٹیبلٹ صبح سے لی ہوئی ہے۔''

''جی امی بس ابھی لے کر آئی۔'' ساس کی آواز پر ہاتھ پاؤں مزید پھول گئے۔

جیسے تیسے کر کے سب کو مطلوبہ ناشتہ کروایا اور سب کچھ ناراضگی و خفگی کا تاثر لئے اپنے اپنے ٹھکانوں پر روانہ ہو گئے اس نے شکر کا سانس لے کر اپنے کمرے کی طرف رخ کیا کہ اب سکون سے اپنی نیند پوری کر لوں گی۔

''بیٹا جلدی سے صفائی کا کام کر کے فارغ ہو جاؤ ورنہ لنچ بھی ناشتے کی طرح لیٹ ہو جائے گا۔''

''مگر امی صفائیوں کے لئے تو بشریٰ (ملازمہ) آتی ہے ناں۔''

''بشریٰ آتی تھی مگر اب نہیں آئے گی میں نے اسے کل ہی فارغ کر دیا تھا سارے گھر کا کوڑا کرکٹ کونوں کھدروں میں کر دیتی تھی، بالکل بھی صفائی سے کام نہیں کرتی تھی وہ تو مجبوری میں اس سے کام لینا پڑتا تھا اب تم آ گئی ہو ناں، اپنے گھر کو سنبھالو، سلیقے و صفائی سے اس کو چمکاؤ پتا چلے کہ بہو نے اپنے گھر کو کیسا سنوار کر رکھا ہے، سدرا کے کمرے کی ڈسٹنگ اچھی طرح کر لینا پتا ہے ناں کتنی نفاست پسند ہے بے ترتیبی اسے ہرگز گوارا نہیں باقیوں کی تو چلو خیر ہے۔'' وہ حکم صادر کیے جا رہی تھیں اور وہ حیرانی و پریشانی سے منہ کھولے ان کی باتیں سنے جا رہی تھی۔

''اور ہاں کھانے میں اپنے ابو کے لئے مونگ کی دال پتلی سی بنانا وہ سادہ کھانا ہی پسند کرتے ہیں، باقی سب کے لئے چکن بنا لینا، چپاتی بالکل نرم اور پتلی ہونی چاہیے ورنہ اشعر کا موڈ آف ہو جائے گا۔'' سب کی پسند و ناپسند سے آگاہ کر کے وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھیں اور وہ اپنے گھر کو سنبھالنے کے چکر میں ایسی گھن چکر بنی کہ اپنے آپ سے ہی بیگانہ ہو گئی، گھر کی صفائی ستھرائی، آرائش، فرمائشی کھانے پکاتے پکاتے وہ ہلکان ہو کر رہ گئی۔

کتنے دن بعد وہ دو دن کے لئے میکے میں رہنے آئی تھی، ماں کی گود کا لمس اسے نیند کی وادیوں میں لے گیا تو آرزو اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر اس کی پسند کا کھانا بنانے چل دیں شام کو وہ سو کر اٹھی تو فریش ہو کر امی کے پاس کچن میں چلی آئی۔

''واہ بڑی پیاری مہک آ رہی ہے۔'' وہ دیگچیوں کے ڈھکن کھول کھول کر دیکھنے لگی۔

''اتنے دنوں بعد میری بیٹی آئی ہے تو اس کی پسند کے کھانے بھی نہ بناؤں۔'' انہوں نے محبت پاش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر سنک میں پڑے برتنوں کو کھنگالنے لگی تو آرزو نے آگے بڑھ کر ٹونٹی بند کر دی۔

''خبردار جو یہاں کسی کام کو ہاتھ لگایا چند دن کے لئے آئی ہو تو اب آرام کرو۔''

''ارے چھوڑیں امی اتنا سا کام کرنے سے کیا ہوتا ہے اور سچ پوچھیں تو اب فارغ رہا ہی نہیں جاتا، ہاتھوں کو ہر دم متحرک رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔'' اس نے پھر سے پلیٹیں کھنگالنی شروع کیں تو وہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

''ارے واہ امی آپ نے بتایا ہی نہیں کہ ہماری پرانی ماسی جو اتنے نخروں سے کام کرتی تھی اس نے ہمیں پھر سے جوائن کر لیا ہے۔'' عارب شرارت سے مسکراتا ہوا کچن میں داخل ہوا تو اس نے پلٹ کر گیلے ہاتھوں سے اس کے بال بکھیر دیئے۔

''یہ ماسی تمہیں اب جوائن نہیں کر سکتی کیونکہ اب اس ماسی کو اس کا اپنا Permanent گھر مل چکا ہے، ہاں تم کہو تو تمہارے لئے نئی ماسی کا انتظام کر دیتی ہوں، روحیل کی بڑی پیاری پیاری کزنز ہیں۔'' امی اس کا مطلب سمجھ کر دھیمے سے مسکرائیں اور وہ شرمانے کی ایکٹنگ کرتا ہوا کچن سے نکل گیا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی، کپڑوں کا ڈھیر لاؤنج میں استری سٹینڈ پر پڑا تھا اس نے کپڑے تہہ لگانا شروع کیے، عارب ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا ساتھ ساتھ رطابہ سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا،

جتنی دیر میں امی کچن سے فارغ ہوئیں اتنی دیر میں وہ سارے کپڑے الماری میں ان کے ٹھکانوں پر رکھ چکی تھی ساتھ ہی عارب کے پورے ہفتے کی پینٹ شرٹس بھی پریس کر کے ہینگ کر دیں۔

''جیو میری بہنا آج دل خوش کیا ہے بغیر کہے اور بغیر رشوت لئے تم نے میرا کام کر دیا۔''

''وہاں سب کے کپڑے پریس کرنا میری ہی ڈیوٹی ہے، امی ابو، اشعر (دیور) اور روحیل کے پورے ہفتے کے کپڑے پریس کر کے رکھ دیتی ہوں، سدرا البتہ اپنے کپڑے خود پریس کرتی ہے۔'' وہ امی کے پاس صوفہ پر آ کر بیٹھ گئی۔

''بہت اچھی بات ہے میری بچی، اس گھر کے مکین ہی اب تمہارے ہیں ان سب کا خیال رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے۔''

''جی امی مجھے اچھی طرح پتا ہے، آپ کو پتا ہے شائستہ آنٹی نے پورا گھر میرے حوالے کر رکھا ہے کسی کام میں مداخلت نہیں کرتیں جیسے چاہوں سیٹنگ بدلوں، جو دل چاہے پکاؤں سب میرے کھانوں کی تعریف کرتے ہیں ابو کو تو میرے ہاتھ کے دال چاول بہت ہی پسند ہیں۔''

''مجھے تم سے یہی امید تھی اور یہ تمہاری ساس کا بڑا پن ہے کہ انہوں نے پورا گھر تمہارے سپرد کر رکھا ہے ورنہ تو ساسیں بہوؤں کو ایک کمرے تک ہی محدود رکھتی ہیں۔''

''صحیح کہہ رہی ہیں امی اگرچہ میں یہ سب کر کے بہت تھک جاتی ہوں مگر اپنے گھر کا خوش کن احساس ساری تھکن پر غالب آ کر راحت بخشتا ہے۔'' وہ معصومیت وسچائی سے بولی تو آرزو نے اس کا ماتھا چوم لیا رطابہ کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

پھر دو دن میکے میں گزار کر جب وہ گھر واپس آئی تو پورا گھر تلپٹ پڑا تھا کوئی چیز ٹھکانے پر نہ تھی۔

''لو بھئی سنبھالو اپنا چولہا چوکا، جب سے تم نے کچن سنبھالا ہے میں تو کھانا پکانا ہی بھول گئی سب نے میرے کھانوں میں وہ مین میخ نکالے کہ الامکان، حالانکہ پہلے میرے ہاتھ کے علاوہ کسی کے کھانے کو پسند ہی نہ کرتے۔'' شائستہ نے اس کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے کہا تو اتنی تعریف نے اس کے پورے جسم میں توانائی بھر دی اور وہ جی جان سے گھر کو سمیٹنے اور گھر والوں کو خوش رکھنے میں مصروف عمل ہو گئی۔

رطابہ کی خالہ جو اس کے سسرال کے نزدیک ہی رہتی تھی آج ملنے آئیں تو اس کی حالت دیکھ کر بول پڑیں۔

☆☆☆

''رطابہ کیا حال کر لیا ہے میری جان، اپنا حلیہ دیکھو کتنی رف ہو رہی ہے تمہاری سکن۔''

''کیا کروں خالہ جانی ٹائم ہی نہیں ملتا۔''

''تو ٹائم نکالو ناں، اس طرح تو تم اپنا حشر نشر کر لو گی اور میری بات سنو یہ کیا پاگل پن ہے پورے گھر کا بار تم نے اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا ہے صحت دیکھو اپنی کتنی کمزور لگ رہی ہو، اپنے اوپر توجہ دینی تم نے بالکل ہی چھوڑ دی ہے، اتنے قریب رہ کر ہفتوں تم اپنی شکل نہیں دکھاتیں اگر میں بھی نہ آؤں تو تمہیں یہ بھی یاد نہ ہو کہ میری ایک خالہ پڑوس میں رہتی ہیں۔''

''خالہ آپ کے گلے شکوے اپنی جگہ مگر آپ یہ بھی تو سوچیں کہ میں اپنی ذمہ داریوں سے غافل بھی تو نہیں رہ سکتی۔''

''غافل رہنے کو کون کہہ رہا ہے مگر تمہارا اپنا بھی تو تمہاری ذات پر حق ہے۔'' وہ چپ ہو گئی تھیں۔

''خالہ کیا ہو گیا ہے آپ کو، کیوں اتنے غصے میں ہیں آپ بھی تو اپنے گھر کا سارا کام کرتی ہیں میں کون سا انوکھے کام کرتی ہوں۔'' اس نے ہنستے ہوئے رس ملائی باؤل میں ڈال کر ان کی طرف بڑھائی جسے انہوں نے بے دلی سے پکڑا۔

''یہ میری بات کا اچھا جواب دیا تم نے، میں تو اپنے گھر میں اکیلی ہوتی ہوں مگر تمہارا تو بھرا پرا گھر ہے، شنذرا کو بھی اپنے ساتھ لگا لیا کرو، شائستہ باجی سارا دن فارغ رہتی ہیں سبزی وغیرہ ہی ان سے بنوا لیا کرو، حالانکہ پہلے تین ٹائم وہی کوکنگ کرتی تھیں، اب کیا ہو گیا ہے ان کو۔''

''شنذرا کالج سے تھکی ہوئی آتی ہے پھر اس نے کوچنگ سنٹر بھی جانا ہوتا ہے ٹائم ہی کہاں ملتا ہے اس بیچاری کو اور آنٹی نے ساری عمر کام ہی کیا ہے اب بہو آ گئی ہے تو ان کے آرام کے دن ہیں، اب میں ان سے کام کرواتی کیا اچھی لگوں گی۔'' رطابہ خالہ سے باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ کپڑے بھی تہہ لگاتی جاتی تھی اس کی بات سن کر ان کے ماتھے کی سلوٹوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

''یہ اچھی کہی تم نے کہ وہ کالج سے تھکی ہوئی آتی ہے، کالج تو تم بھی جاتی تھیں باجی نے پڑھائی کے دوران ہی تمہیں ہر کام میں طاق کر دیا تھا حالانکہ گھر کے کاموں میں تمہاری چنداں دلچسپی نہ تھی پھر بھی انہوں نے تمہیں سب کچھ سکھایا تاکہ اگلے گھر جا کر کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے، اس کی ماں کو کوئی فکر نہیں ہے اس کی، کوئی کم عمر بچی تو نہیں ہے۔'' خالہ کی بات سن کر اس نے چپ سادھ لی لگتا تھا وہ آج خوب دل کی بھڑاس نکال کر ہی دم لیں گی سو وہ بولتی رہیں اور وہ چپ چاپ سنتی رہی۔

☆☆☆

یکے بعد دیگرے عفیرا اور جاذب کی آمد نے اسے مزید مصروف کر دیا اور وہ جو اپنا کبھی کبھار کچھ خیال کر لیا کرتی تھی ان حالوں سے بھی گئی۔

شنذرا کی شادی ہوئی تو آئے روز اس کی میکے میں آمد حال سے بے حال کر دیتی، شائستہ کا حکم ہوتا کہ میری بچی کے آنے پر کسی چیز میں کوئی کمی نہ رہے اور وہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اپنی پوری جان لگا دیتی، سسر کو وقت پر ناشتہ کھانا، شائستہ خاتون کے حکم اشعر کے دوستوں کی فرمائشیں اور روحیل کے خیال رکھنے میں کب دن طلوع ہوتا اور کب رات کے سناٹے گونجنے لگتے اسے خبر ہی نہ ہوتی۔

بچوں کو بھی وہ مکمل وقت دے رہی تھی ہاں اگر نظر انداز ہو رہی تھی تو وہ اس کی ذات تھی اور اسے اپنی کوئی پرواہ نہیں تھی، اس کا گھر اس کے عمدہ سلیقے کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

شنذرا کی طبیعت کچھ دنوں سے ناساز تھی اور وہ میکے رہنے آئی ہوئی تھی، صبح سے بھابھی سے فرمائشی پروگرام شروع ہوتا اور رات تک جاری رہتا، رطابہ پیشانی پر بل ڈالے بغیر مسکراتی ہوئی نند کی خدمتوں میں لگی رہتی، چکن فرائیڈ رائس بنانے کے لئے اس نے جلدی جلدی سبزیاں کاٹیں چکن دھو کر چھلنی میں رکھا ساتھ ہی بھیگے ہوئے چاول ابالنے کے لئے رکھ دیئے، اس کے ہاتھ مشین کی طرح چل رہے تھے کبھی کبھی وہ اپنے آپ پر حیران ہوتی کہ شادی سے پہلے اتنی سست اور کام چور لڑکی میں سسرال میں آ کر کیسی بجلی بھر گئی کہ سب کام منٹوں میں کر دیتی ہے کوئی عذر نہیں کوئی نخرہ نہیں، یہ سب امی کی تربیت کا نتیجہ ہے ان کی نصیحتوں اور سوچ نے میرے ذہن و دل پر تسلط کر رکھا ہے میں کبھی اپنی ماں کی تربیت پر حرف نہیں آنے دے سکتی، امی نے مجھے پورے مان اور بھروسے سے اپنے گھر بھیجا ہے کہ میں اپنی خدمت گزاری و سلیقہ مندی سے سب کے دل جیت لوں اور واقعی مجھ سے آج سبھی خوش ہیں گھر میں کبھی تناؤ کی فضا قائم نہیں ہوئی روحیل کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہ ہوئی سب کو میرا کام پسند آتا ہے کسی کو مجھ سے کوئی شکوہ کوئی گلہ نہیں، کتنی خوش نصیب ہوں میں کہ مجھے قدر کرنے والا سسرال ملا، امی کے لبوں سے وہ اکثر یہ جملے سنا کرتی تھی۔

''عورت کا گھر صرف گھر والے سے، نہیں ہوتا گھر والوں سے ہوتا ہے، مرد تو صبح کا گیا رات کو گھر میں گھستا ہے لڑکی کو رہنا تو سسرال والوں کے ساتھ ہوتا ہے اسے ہمیشہ گھر والوں سے بنا کر رکھنی چاہیے تاکہ گھر میں کسی قسم کی رنجش جنم نہ لے اور اس کی ذات سے دوسرے بھی سکون میں رہیں اور وہ خود بھی ذہنی طور پر سکون رہے گی اور اگر لڑکی ذہنی طور پر پرسکون ہو گی تو مرد بھی ذہنی اذیت سے بچا رہے گا، زندگی خوشگوار ماحول میں گزرے گی اور اس کا اثر آئندہ نسلوں پر بھی پڑے گا۔'' وہ امی کی باتیں یاد کر کے مسکرائی رہی چاولوں کا پانی باہر نکلنے لگا تو چولہے کی آنچ دھیمی کر کے وہ شنذرا کے کمرے میں اس سے یہ پوچھنے چل دی کہ وہ رات کا مینیو بھی بتا دے تاکہ تھوڑی بہت اس کی بھی تیاری کر لے وہ دروازہ کھولنے ہی لگی تھی کہ شنذرا کی بات سن کر ٹھٹک گئی۔

''مکلاوے کے بعد جب میں یہاں سے گئی تو چند دن بعد ہی فرحان کی امی نے مجھ سے میٹھے کی رسم کروانے کے بعد چابیاں میرے ہاتھ میں تھما دیں کہ ''لو بہو آج سے یہ گھر تمہارا ہے سنبھالو اپنا گھر'' میں نے کمال دانشمندی کا مظاہرہ

کرتے ہوئے چابیاں واپس ان کے ہاتھوں میں منتقل کر دیں۔''

''امی آپ اس گھر کی بڑی ہیں ساری عمر اس گھر میں گزاری ہے میں کل کی آئی کیسے اس گھر پر اتنی جلدی اپنا حق جتا سکتی ہوں، یہ گھر آپ کا ہے آپ کے ہوتے ہوئے میں اس گھر کو سنبھالتی کیا اچھی لگوں گی۔'' میری بات سن کر انہوں نے میرا ماتھا چوم لیا۔

''میں بے وقوف تو نہیں تھی جو اپنا گھر سمجھ کر اپنے آپ سے ہی بے نیاز ہو جاتی، بھابھی کی مثال میرے سامنے تھی سارا دن ہمارے اور گھر کے کاموں میں گھن چکر بنی رہتی ہیں، اپنے آپ کو انہیں کبھی آئینے میں دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ملی یہ تو روحیل بھائی کی شرافت ہے جو وہ اتنے رف حلیے میں رہنے والی بیوی کو برداشت کر رہے ہیں، مجھے ایسی محبتیں اور گھر نہیں چاہیے جہاں انسان کی اپنی آزادی اور ذات ہی ختم ہو رہی ہو سارا دن گھر کے کاموں میں الجھ کر رات کو جب شوہر کے آنے کا ٹائم ہو تو میں سر جھاڑ منہ پھاڑ اس کو ملوں اور وہ میری اجڑی صورت دیکھ کر باہر راستے تلاش کرنے لگے نہ بابا نہ مجھے ایسا اپنا گھر نہیں چاہیے، میرا گھر وہی ہوگا جو میرے شوہر کی کمائی سے بنے گا جہاں میں پوری آزادی کے ساتھ حکمرانی کروں گی۔'' شنذرا روانی سے بولتی جا رہی تھی۔

''بہت اچھا کیا کوئی ضرورت نہیں ہے ان بکھیڑوں میں پڑنے کی، ساری زندگی سسرالیوں میں جھونک دو پھر بھی یہ کہاں اپنے بنتے ہیں ساس بہو کا رشتہ ساس بہو کا ہی رہتا ہے، اب میری بہو کو ہی دیکھ لو کیسی چلتر ہے میں نے چابیاں پکڑائیں اور فوراً ہی تھام لیں، پورے گھر پہ قبضہ جما رکھا ہے، ہر چیز مین اس کی مرضی چلتی ہے، جو دل چاہے ہمارے سامنے پکا کر رکھ دے، صبر و شکر کا کلمہ پڑھ کر اپنے اندر اتار لیتے ہیں، ماں نے سمجھا کر جو بھیجا ہوگا کہ جاتے ہی سب کچھ اپنی مٹھی میں کر لینا۔''

''حق...... ہا ہمیں یہ چالاکیاں نہ آئیں کیسے آسانی سے سب کچھ آتے ہی بہو کے ہاتھوں میں تھما دیا۔'' شائستہ خاتون نے گہری سانس بھری اور باہر کھڑی رطابہ اپنی جگہ پتھر کی ہو گئی اس کا سر چکرا کر رہ گیا، اس کے ذہن میں کئی فقرے گردش کر رہے تھے۔

''عورت کا گھر صرف گھر والے سے نہیں گھر والوں سے ہوتا ہے۔''

''میری بچی سسرال والے ہی اب تمہارے ہیں ان سب کا خیال رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے۔''

''ساری زندگی سسرالیوں میں جھونک دو پھر بھی یہ کہاں اپنے بنتے ہیں ساس بہو کا رشتہ ساس بہو کا ہی رہتا ہے اب میری بہو کو ہی دیکھ لو کیسی چلتر ہے میں نے چابیاں پکڑائیں اور اس نے فوراً ہی تھام لیں۔'' لفظوں کی تکرار اس کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہی تھی، وہ اپنے وجود کی کرچیاں سمیٹتی آنکھوں سے تواتر سے بہتے آنسوؤں کو صاف کرتی بے جان وجود کے ساتھ دوبارہ کچن میں داخل ہو گئی، اس کا ذہن عجیب الجھن کا شکار ہوا ہوا تھا وہ اس سوچ میں پڑی ہوئی تھی کہ وہ اپنی بیٹی عفیرا کی تربیت اپنی ماں کی سوچ کی نہج پر کرے یا شائستہ خاتون کی، آنکھوں میں نمی لئے وہ دکھتے دل کے ساتھ مسلسل سوچتے ہوئے باقی ماندہ کام سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

فاطمہ حسان

''شیدے دی ووہٹی اپنے شہری نال بھاگ گئی۔'' یہ فقرہ تین دن سے پنڈ کے ہر فرد کے منہ پر تھا، ہر محفل میں دہرایا جاتا اور آج بھی گویا گفتگو کا موضوع بنا ہوا تھا۔

''بے چارہ شیدا! کسی نوں منہ دکھانے لائق نہیں رہا۔'' امجد نے تاسف سے سر ہلا کر ماتھے پر آیا پسینہ انگلیوں سے پونچھ کر کہا۔

''ہور نہیں تو کیا، بے چارہ تین دن سے کار (گھر) سے باہر نہیں آیا۔''

''اللہ پچھے ایس جئی کڑیاں نوں جناں نوں نہ تے اپنی عزت دی کوئی پروا نا اپنے کار والے دی۔'' (اللہ پوچھے ایسی لڑکیوں کو، جنہیں نہ اپنی عزت کی کوئی پرواہ نا اپنے گھر والے کی)، منشی خدا بخش سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہنے لگا۔

''مینوں تے شروع دن توں اوس دے چال چلن ٹھیک نئیں لگدے سی۔'' (مجھے تو شروع دن سے اس کے چال چلن ٹھیک نہیں لگ رہے تھے) جاوید عرف جیدا نے تاش کا پتہ پھینکتے ہوئے گویا پتے کی بات کہی۔

''صحیح کہا، اے شہر دیاں کڑیاں، ایس تے کوئی بھروسہ نئیں۔''

''آہ...... ہا...... بے چارہ شیدا۔'' امجد سرد آہ بھر کر اوپر آسمان پر اڑتے پرندے کے غول دیکھ رہا تھا، جو اپنے اپنے آشیانے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

اوائل مئی کی تپتی دوپہر کے بعد عصر کا وقت تھا، سنہری دھوپ دیواروں پر چڑھ کر سورج کی تپش کا اثر زائل کر رہی تھی، لیکن ماحول میں ابھی بھی گھٹن اور حبس تھا، اس چھوٹے سے پنڈ کے غربت کی چکی میں پستے غیرت مند جفاکش مزارعے اور کسان دن بھر کے کاموں سے تھکے ہارے معمول کی طرح رفیق عرف فیقے کی دوکان کے آگے بنے چوپال پر بیٹھے اپنی روزمرہ کی گپ شپ میں مصروف تھے، نوجوانوں میں تاش کی بازی لگ چکی تھی اور بڑے زور و شور سے رشید عرف شیدے کی بیوی کے کارنامے پر تبصرہ کر رہے تھے، جو گھر چھوڑ کر منہ اندھیرے نکل گئی تھی، کرم دین قریب ایک چارپائی پر بیٹھا گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا، دل میں جوار بھاٹا سا اٹھ رہا تھا، جانے کیوں وہ مجرم بنا سر جھکائے بیٹھا تھا شاید اس لئے کہ۔

''او چاچا جی!'' فیقے نے ہاتھ اس کے کندھے پر مارا، وہ چونک کر دیکھنے لگا۔

''تیری نوں (بہو) بھی تو شہر کی ہے ناں؟'' اس نے گویا یاد دہانی کروائی، کرم دین کا دل دھک دھک کرنے لگا، بظاہر خود کو پرسکون کرتے وہ سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

''میری مان تو نظر رکھ، ان شہر دی کڑیاں دا کوئی بھروسہ نئیں، کہتے تیری پگ بھی مٹی میں نہ ملا دے۔'' وہ ہمدردانہ انداز میں مشورہ دینے لگا، کرم دین کے دل میں وبال سا اٹھا، مگر لب سیے خاموشی سے سامنے دیکھنے لگا، گاؤں کے کچے پکے گھروں سے دھواں اٹھ رہا تھا، شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے، بغور آسمان کی نارنجی سرخی کو دیکھتے وہ کسی خیال میں کھو سا گیا۔

''احمد کی نئی نویلی دولہن، شیدے کی بیوی کی طرح...... لاحول ولا......'' وہ خود اپنے تصور پر جھرجھری لے کر رہ گیا۔

''کی سوچ رہے ہو کرمو چاچا؟'' امجد حقے کا ایک کش لیتے ہوئے پوچھنے لگا، حقے کی گڑگڑ اور آسمان پر اڑتے اپنے گھر جاتے چیل کوؤں کی کائیں کائیں ماحول کو اپنے اثر میں لے رہے تھے۔

''کج نئیں پتر! مینوں تھکاوٹ ہو رہی

اے، ذرا کار (گھر) جا کے آرام کرلوں تھوڑا۔" وہ پٹکے سے چہرے پر آیا پسینہ پونچھتا اٹھ گیا، کندھے انجانے بوجھ سے جھکے اسے ضعیف بنا رہے تھے۔

"چاچا جی! لگدا اے میری بات سے جی برا ہو گیا اے، پر رب جانے میری نیت بری نئیں، شہر دی پڑھی لکھی کڑیاں دا بھروسہ نیں چنگا۔" فیقے نے ہانک لگائی، کرم دین کے قدم جم سے گئے، دل پر بھاری بوجھ لئے وہ اپنی میلی دھوتی سنبھالتا آگے بڑھ رہا تھا، قدم من من بھر کے ہو رہے تھے، دل میں وسوسوں اور اندیشوں کا سیلاب امڈ رہا تھا اور پاؤں ان دیکھے طوفان سے اکھڑ رہے تھے، معمول کا فاصلہ طے کرتے آج وہ ہانپ سے گئے تھے، لکڑی کا پاٹک عبور کرتے اس کے کانوں میں رضیہ کی تیز آواز آئی۔

"کیوں رے نواب زادی، دھیان کتھے رہندا اے تیرا؟ انا جیا کم کردے تینوں موت پے رہی اے، (دھیان کہاں رہتا ہے تیرا، اتنا سا کام کرتے موت پڑ رہی ہے)۔" وہ خونخوار نگاہوں سے چولہے سامنے چوکی پر بیٹھی امشال کو دیکھتے ہوئے بول رہی تھی، جو سوکھی اوپلوں اور لکڑیوں سے چولہا جلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، دھوئیں کی وجہ سے کھانس کھانس کر اس کا برا حال ہو گیا تھا، کرم دین ایک نظر دونوں پر ڈالتا پرسوچ انداز میں دائیں طرف بنے باڑے میں بندھے مویشیوں کو دیکھنے چلا گیا، جہاں امینہ بالٹی لئے بھینسوں کا دودھ نکال رہی تھی، کرم دین کو آتے دیکھ کر ہلکے سے مسکرائی۔

"سلام ابا، آ گئے آپ۔" آٹھویں پاس امینہ کے لب و لہجے میں بہت ٹھہراؤ تھا، کرم دین محض سر ہلا کر رہ گئے۔

امشال کے کھانسنے اور رضیہ کی غصیلی آواز یہاں تک آ رہی تھی، وہ جلدی جلدی دودھ نکال کر بھینسوں کے آگے چارہ ڈالتی باہر آ گئی، ہاتھ دھو کر بالٹی اندر رکھی اور امشال کی مدد کو آئی۔

"لائیں بھابھی! میں کر دوں۔" وہ قریب پڑی دوسری چوکی گھسیٹ کر بولی۔

"چل ہٹ، پرے ہو۔" رضیہ نے امینہ کو گھورا۔

"کرنے دے، آپے ہی نواب زادی نوں، چار دن دھیان دے گی تے آپے سیکھ جائے گی اونہہ۔" وہ تیز تیز نیلکا چلاتی دھلے ہوئے کپڑوں پر پانی نکال رہی تھی، ساتھ ہی بڑبڑاہٹ بھی جاری تھی۔

"آپا...... میں......" امینہ نے کچھ کہنے کو لب کھولے ہی تھے، مگر آپا کے ترش لہجے نے اس کی بات کاٹ لی۔

"سارا دن اس موئے مبیل (موبائل) تے گل کرندے کج نئیں ہوندا، چار روٹیاں بناتے ہاتھ ٹوٹتے ہے مرن جوگی دے۔" وہ طنزیہ نظر امشال پر ڈالتی آخری چادر نچوڑنے لگی، اسی دوران اندر سے بخار میں پھنکتی، دوائیوں کے زیر اثر سوتی چھوٹی کے رونے کی آواز آئی، وہ کپڑے چھوڑ کر فوراً اندر کو لپکی، امینہ اس کی تیل لگی لمبی بل کھاتی چھوٹی دیکھتی امشال کے قریب کھسک آئی۔

"بھابھی جی!" آواز میں بے بسی تھی، امشال پیڑا بناتی اس کا افسردہ چہرہ دیکھنے لگی۔

"آپا کی باتوں سے جی برا مت کیا کرو، وہ دل کی بری نہیں۔" چھوٹی کے رونے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں اور ساتھ میں رضیہ کی بے زار بڑبڑاہٹ بھی، امشال ایک نظر پیچھے لکڑی کے آدھ کھلے دروازے کو دیکھنے لگی، رضیہ باہر نکل رہی تھی، اس نے فوراً رخ موڑ کر دھیان ہاتھ میں پکڑے پیڑے پر دیا، مگر یہ کیا، توے پر رکھی روٹی جل چکی تھی۔

"بھابھی!" امینہ نے جلدی سے اسے اتارا، مبادہ رضیہ نہ دیکھ لے اور ایک نظر رضیہ کو دیکھا، جو پریشانی سے چھوٹی کا بخار چیک کر رہی تھی۔

"دیکھ کیا رہی اے، چل اٹھ، چھوٹی کا فیڈر بنا دے۔" امینہ کے دیکھنے پر وہ بے زاری سے بخار سے پھنکتی اور بے تحاشہ روتی چھوٹی کو بازو میں جھلاتی بولی، امینہ جلدی سے اندر بھاگی، چھوٹی کا فیڈر بناتے اس نے صحن کا بلب بھی روشن کر دیا، امشال نے اداسی سے زرد ٹمٹماتے بلب کو دیکھا جو صحن روشن کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

☆☆☆

"اری کمبخت کتھے مری پڑی ہو؟" امشال فون کان سے لگائے احمد سے بات کر رہی تھی، جب باہر سے آپا کی تیز آواز آئی، وہ جلدی سے بات ختم کر کے فون رکھنے ہی لگی تھی، مگر آپا کی تیز جانچتی نظروں نے دیکھ لیا، جانے کیوں وہ خود بھی چور سی بن گئی۔

"جدو ویکھو...... مبیل (موبائل)۔" وہ تکیے پر پڑے موبائل کو دیکھنے لگی۔

"ناں تو مینوں دس، تو لگی کس نال رہندی اے۔" وہ مشکوک ہوئی، امشال نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا، مگر آپا ہاتھ اٹھا کر منع کرنے لگی۔

"دیکھ بتا رہی ہوں تجھے، اے بے حیائی پنڈ دے شریف لوکاں اچ نئیں چلدی، پنڈ دے طور طریقے سیکھ، تے چھوڑ دے اے شہر دے لچھن۔"

"آپا! میں تو احمد سے......"

"بس بس۔" رضیہ نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹی، امشال ہونٹ کاٹتی رہ گئی۔

"جیویں میں تے جاندی ای نئی، تسی شہر دی کڑیاں نوں، پڑھئی دے بہانے کی گل چھرے اڑاندے او، مینوں چنگی طرح پتہ اے، (جیسے میں تو جانتی نہیں تم شہر کی لڑکیوں کو، پڑھائی کے بہانے کیا گل کھلاتی ہو، اچھی طرح پتہ ہے مجھے)۔" وہ زہر خند لہجے میں کہتی امشال کے دل میں خنجر گھونپ گئی۔

"آپا! حد کر دیتیں ہیں آپ، کچھ تو اللہ کا خوف کریں۔" وہ بمشکل آنکھوں کی نمی چھپاتی بولی، اتنی توہین، اتنی تذلیل، اس کا چہرہ سرخ ہوا۔

اسی دوران تکیے پر رکھا موبائل جل اٹھا، سائلنٹ پر لگے ہونے کی وجہ سے صرف "زوں زوں" کی آواز ابھری، امشال چور سی بن گئی، رضیہ نے خونخوار نگاہوں سے تکیے پر پڑے "زوں زوں" کرتے موبائل کو دیکھا، جس کی جلتی بجھتی سکرین پر "احمد کالنگ" لکھا آ رہا تھا۔

"لا...... دے ادھر۔" آپا فون لینے کو آگے بڑھی، امشال نے بے ساختہ اسے تکیے سے اٹھایا، جو خاموش ہو کر ایک بار پھر سے "زوں زوں" کر رہا تھا، امشال نے ایک بے بس نظر اس پر ڈالی اور "نو" کا بٹن پش کیا۔

"اِدھر دے یہ۔" آپا نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے برہمی سے کہا۔

"آپا پلیز۔" وہ منت بھرے انداز میں اتنا ہی بول پائی، جس کا آپا پر رتی برابر اثر نہ ہوا اور موبائل اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

"ہن ویکھیں، میں اس کا کی حشر کر دی آں۔" وہ ایک نظر ہاتھ میں پکڑے موبائل پر اور دوسری قہر آلود نظر امشال پر ڈالتی، اپنا پراندہ جھلاتی باہر جانے لگی۔

سے باہر نکلتی رضیہ کو دیکھنے لگی جو موبائل کی سکرین پر انگلیاں مار رہی تھی، جوں ہی اس نے قدم باہر رکھا اس کی نظر سامنے باورچی خانے کے آگے رنگین چارپائی پر ٹیک لگائے کرم دین پر پڑی، جو ٹھنڈی لسی کا گلاس ہاتھ میں لئے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

''کی ہویا ابا؟'' وہ فوراً پاس چلی آئی، کرم دین نے چونک کر ایک نظر اسے دیکھا اور دوسری نظر اس کے ہاتھ میں پکڑے ٹچ اسکرین کے ایک جدید ماڈل کے موبائل کو اور سوالیہ ابرو اچکے۔

''اس نواب زادی دا اے، ہر ویلے چٹی رندی اے اس موے نوں، کلموہی جانے کس کس نال گلاں کر کے ساڈی عزت پلید کر دی اے۔''

وہ باپ کے سرخ ہوتے چہرے کو بغور دیکھتی موبائل کی اسکرین کو اپنے میلے آستین سے صاف کرنے لگی۔

''آپا! انا بڑا الزام، تینوں اچھی طرح پتہ وی اے کہ وہ ایس جئی نئیں، فر وی۔'' باورچی خانے میں کام کرتی امینہ نے دکھ سے کہا۔

''چپ کر تو، بڑی آئی۔'' اس نے چھوٹی کو گھر کا۔

''تجھے کی خبر، شہر دیاں کڑیاں دا، خدانخواستہ جے کل نوں، توبہ توبہ، شہر دیاں کڑیاں دا، کی کراں، زمانہ ای ایہو جیا آ گیا اے، نہ شرم نہ کوئی لحاظ۔'' وہ چور نظروں سے باپ کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھتی ذرا دھیمی ہوئی، امینہ تاسف سے سر ہلا کر رہ گئی اور اندر پلنگ پر بیٹھی امثال کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اندر سما جائے۔

☆☆☆

اس کی شادی کو تین ماہ ہوئے تھے، احمد اس کا یونیورسٹی فیلو تھا، اپنے سلجھے ہوئے عادات و اطوار، مہذب لب و لہجے اور اپنے رکھ رکھاؤ کے باعث وہ اسے پسند کرنے لگی تھی اور جب اس کے جذبوں کو پذیرائی ملی تو اس نے احمد کو گھر رشتہ بھیجنے کو کہا، کیونکہ وہ ایک شریف اور عزت دار گھرانے کی بیٹی تھی، عزت پر سمجھوتا اسے کسی صورت گوارہ نہ تھا، مگر یہاں آ کر اسے پتہ چلا کہ، وہ کتنی بدکردار اور بدچلن تھی، کیونکہ وہ شہر کی ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی، اس نے تھکن سے آنکھیں موند لیں۔

آنسو موتی کی صورت پلکوں سے ٹوٹ کر گلابی رخسار پر پھسل گئے، اس نے ایک ہلکی سی سسکی لی، اس کا دل پھٹ رہا تھا، دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر احمد کی مہربان چھاؤں میں چلی جائے مگر...... آہ...... ہاہ...... اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

احمد نے کبھی اسے سبز باغ نہیں دکھائے، اپنے گھریلو و مالی حالات کے ساتھ ساتھ انہوں نے رضیہ آپا کے بارے میں بھی صاف گوئی سے بتایا تھا جو اپنی چرب زبانی، شکی مزاج اور جھگڑالو طبیعت کے باعث اپنا گھر اپنا میاں چھوڑ کر ننھی عالیہ کو لئے پچھلے چھ ماہ سے میکے آ بیٹھی تھی، اس وقت امثال کو لگا تھا کہ وہ سب سنبھال لے گی، مگر اب وہ تھکنے لگی تھی، اسے اچھی طرح یاد تھا جب شادی کے بعد احمد شہر چلا گیا تو وہ کتنی اداس ہو گئی تھی مگر آپا، اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

ابھی اس کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں اتری تھی کہ آپا نے اسے جھاڑو پوچھے اور چولہے ہانڈی سے لگا دیا، اپنے گھر منہ کا نوالہ بھی اپنی ماں کے ہاتھوں کھانے والی امثال کو یہاں آ کر دن بھر کے کاموں نے نڈھال کر دیا، بے شک امینہ اس کا بہت خیال رکھتی، مگر آپا اس کو بھی

جھڑک دیتیں، وہ دن بھر کے کاموں سے تھک کر چور چور ہوتی، مگر شام کو احمد کی مہربان آواز اس کی ساری تھکن ساری بے زاری بھگا دیتی، وہ اسے دلاسے دیتا اور اپنے ہونے کا بھرپور احساس دلاتا، مگر اب...... اس نے آنسو پونچھتے ہوئے ایک نظر کمرے کے بند دروازے پر ڈالی، اب تو موبائل بھی نہیں رہا تھا، اس کا سانس بند ہونے لگا، کیسے گزریں گے یہ دن؟ کیا ساری زندگی آپا نے اسے یوں طعنے دے دے کر ذلیل کرنا ہے؟

''اے میرے خدا! میری مدد فرما، میرا جرم اتنا بڑا تو نہیں ہے جتنا......''

''مہارانی! ہور کتنی دیر پلنگ توڑنے کا ارادہ ہے؟'' وہ ایکدم آپا کی آواز پر خیالوں کی دنیا سے باہر آئی، آپا کمرے کی چوکھٹ پر کھڑیں میلی آستین کہنیوں تک لپیٹی کھڑی تھیں، امثال نے جلدی جلدی گالوں پر بکھرے موتی انگلیوں کے پوروں سے چن لئے۔

''اساں کہیڑے پہاڑ توڑ دیتے، جے توں ایس جی تسوے بہا رہی اے۔'' وہ اسے آنسو پونچھتے دیکھ چکی تھی، امثال کا دل چاہا، خوب کھری کھری سنائے، مگر جانے کیوں احمد کا خیال آیا اور چپ ہی رہی۔

''چل اٹھ...... روٹی ہانڈی کا بندوبست کر، جانے کس کے وچھوڑے دا روگ منا رہی اے۔'' وہ آخری بات منہ میں بڑبڑا کر چلی گئی اور امثال کے سینے پر مونگ دل گئی۔

☆☆☆

دن بھر کی چلچلاتی دھوپ نے پورے گاؤں کو جھلسا کر رکھ دیا تھا، درختوں کے پتے بالکل ساکن تھے، ماحول میں عجیب گھٹن اور حبس تھا، دھوپ ڈھلتے ہی وہ اوپر چھت پر چلی آئی اور دیوار سے ٹیک لگائے وہ ایک اینٹ پر بیٹھ گئی، سامنے منڈیر پر چیل کوے بیٹھے کائیں کائیں کر رہے تھے، وہ بغور ان کو دیکھتی رہی جو چونچوں میں روٹی کے ٹکڑے لئے اِدھر سے اُدھر اڑ رہے تھے، ان کی کائیں کائیں سے ماحول پر چھایا سکوت ٹوٹ رہا تھا، وہ اڑتے کائیں کائیں کرتے کوؤں کو حسرت سے دیکھتی رہی، عجیب سی اداسی اس کے وجود میں سرایت کر رہی تھی، احمد اور گھر والوں سے دوری، دن بھر کے کام، آپا کی کڑی کسیلی باتیں اور ابا کی مشکوک اور اس کی ذات کا پیچھا کرتیں نگاہیں، اس کا دم گھٹنے لگا، نیلے آسمان پر اڑتے پرندوں کو بغور دیکھتی اس نے ایک سرد آہ بھری۔

''کاش میں بھی کوئی پرندہ ہوتی، اڑ کر اپنے گھر، اپنی ماں، اپنے بہن بھائی اور، اپنے شفیق باپ کے پاس جا سکتی، جن کو چھوڑ کر وہ تین ماہ سے اس گھر میں تھی، احمد کے لئے، احمد کی وجہ سے اور احمد آہ......'' اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''کاش وہ احمد کے پاس ہی جا سکتی۔''

سوچتے سوچتے نیلا آسمان اور اس پر اڑتے پرندے، سب دھندلا سے گئے تھے اور گرم گرم سیال اس کا چہرہ بھگونے لگے، وہ چونک اٹھی، مخروطی انگلیوں سے گالوں کو چھوا، وہاں آنسو تھے، اس نے گھٹنوں پر سر رکھ دیا اور اب اس کا وجود لرز رہا تھا، وہ رو رہی تھی، چپ چاپ، بے آواز۔

''شش...... شش۔'' وہ آواز پر چونکی اور سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔

ساتھ والی چھت پر چیمہ ایک بار پھر کھڑا تھا، اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ڈھیر سارا سرمہ ڈالے، وہ اسے اشارے کر رہا تھا، امثال کو متوجہ پا کر وہ تیل لگے بالوں میں ہاتھ پھیرتا مسکرا رہا تھا، یوں کہ اس کے پیلے دانت نظر آئے، امثال کو کراہیت سی آئی۔

''گل سنو جی۔'' وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس پر مرکوز کیے گلے میں پڑے تعویذ کے دھاگے پر ہاتھ پھیرتا مسکرائے جا رہا تھا، امثال آپا کی پچھلی باتوں کو یاد کر کے اٹھ کر نیچے جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ جانے کیا ہوا چیمہ ''او تیری خیر'' کہہ کر ایکدم بھاگ کر نیچے کودا، امثال ناسمجھی کے عالم میں اردگرد دیکھنے لگی اور پھر...... وہ دھک سے رہ گئی، سامنے ہی کرم دین سیڑھیوں پر کھڑے ہاتھ میں باجرہ اور سوکھی روٹی لئے ہوئے تھے، وہ یقیناً کبوتروں کو دانہ ڈالنے آئے تھے، اس کی آنکھوں میں کون سا تاثر تھا، غصہ، بے یقینی، یا کچھ اور، امثال سمجھ نہ پائی، لیکن کچھ ایسا تو تھا کہ اتنی گھٹن اور حبس کے باوجود وہ جھرجھری لے کر رہ گئی، بے قصور ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو قصوروار سمجھنے لگی، اس کا دل چاہا کہ وہ کسی طرح جادو کی چھڑی گھمائے اور منظر سے غائب ہو جائے، کرم دین چند پل بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر چھت کے ایک کونے میں پڑے کبوتروں کے پنجرے کی طرف بڑھ گیا، امثال اٹھی اور تیزی سے دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتی چلی گئی، کرم دین کے اندر وبال سا اٹھا۔

''ایہو جی کڑیاں نوں تے جیندیاں اے زمین وچ دفنا ونڑا چاہی دا (اس طرح کی لڑکیوں کو زمین میں زندہ گاڑ دینا چاہیے)۔'' اسلم کی آواز کانوں میں گونجی، جو اس نے رشید کی بیوی کے لئے بہت ترشی سے کہے تھے، وہ مڑ کر ایک نظر منشی خدا بخش کی چھت کو دیکھنے لگا، جہاں سے کچھ دیر پہلے چیمہ غائب ہوا تھا اور پھر سیڑھیوں کو دیکھنے لگا، جہاں سے امثال، کانوں میں رضیہ کی آواز اور الفاظ گونج رہے تھے، کچھ دن پہلے کا منظر آنکھوں میں ناچا۔

''ابا! آج میں صاف صاف دس دیواں، برا لگے تے معاف کرنا، اس کڑی دے چھن مینوں اک اکھ نئیں بھاندے، چھت تے کپڑے سکھاونڑ دے بہانے ای کس نال اکھیاں لاندی پئی اے۔'' وہ کمر پر ہاتھ رکھے تیز تیز کان پھاڑتی آواز میں بول رہی تھی، وہ سر جھکائے بیٹی کی باتیں سن رہے تھے، امینہ دم بخود سب سن رہی تھی۔

''میری مان ابا، احمد نال گل کر، اس توں پہلے کہ اسے ساڈے متھے کالک مل دیوے۔'' وہ تیل لگی بالو کی لمبی چوٹی کا جلدی جلدی جوڑا بنانے لگی۔

''بس کر دے آپا۔'' چھوٹی سے رہا نہیں گیا۔

''زبان کو تھوڑا جیا تو لگام دیں، کسی دی عزت پر انگلی اٹھانے سے پہلے کم از کم اپنی بیٹی کا ہی خیال کر لیں۔'' امینہ اس کی ذہنیت پر افسوس کرنے لگی، ابا کچھ بھی بولے بغیر بس چپ چاپ بیٹھے تھے، ایسے جیسے کسی طوفان سے پہلے کی خاموشی ہو۔

''بکواس بند کر، خبردار جے میری دھی رانی دا ناں (نام) چاہنا۔'' وہ امینہ کو کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگی۔

''میں نے خود ویکھا ان گنہگار اکھیوں سے، اس چھچھوے چیمہ نال۔''

''آپا!'' امینہ کا ضبط جواب دے گیا، غصے سے جانے کیوں وہ کپکپا اٹھی، اسی شک کی وجہ سے آپا نے اس کا سکول بھی چھڑوا دیا تھا اور آج......

''اسی شک اور زبان دی وجہ توں اپنا گھر کو بسا نہ سکی تو، کم از کم اس کا کار (گھر) پے رحم کر۔'' رنج سے کہتی وہ رو دینے کے قریب تھی، الفاظ تھے

کہ بندوق کی گولی، آپا نے بے یقینی سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا، ابا نے بھی جھٹکے سے سر اٹھایا، جیسے اسے امینہ سے اس بات کی توقع نہ ہو اور آپا، اس کے منہ پر تو گویا طمانچہ لگا تھا، وہ سن ہو کر بے یقین نظروں سے امینہ کو دیکھے گئی، جسے اتنے سال اس نے کھلایا تھا، پلایا تھا اور بڑا کیا تھا اور آج...... وہ شاک ہی تو تھی۔

''ویکھ لے ابا، اچھی طرح ویکھ لے، کیسے خون چٹا ہو گیا اے۔'' صدمے کی وجہ سے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا، امینہ نے نظریں چرائیں اور آپا ایکدم اشتعال میں آ گئیں۔

''اس حرافہ اور بازاری عورت واسطے، اس واسطے، تو مجھ پہ......'' غصے میں اول فول بکتی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سامنے کھڑی اپنی بہن کا خون کر دے، وہ ایک غیر عورت کے لئے اپنی بہن کو غلط کہہ رہی تھی، اس کی انا کو ٹھیس پہنچی تھی۔

''ابا...... ابا...... سن رہے ہو۔'' وہ کلیجہ پیٹتی اونچی اونچی آواز میں رونے لگی، مگر کرم دین وہ تو جیسے سن ہی نہیں رہا تھا، اس کی نظریں دائیں طرف تھیں، جہاں امثال بھیگے آستینوں، بھیگے پائنچوں والے کپڑوں میں ملبوس ہاتھ میں خالی بالٹی پکڑے سیڑھیوں کے آخری زینے پر کھڑی تھی، جانے کب سے، بے یقین سی، صدمے سے چور۔

☆☆☆

کچے صحن اور کچے کمروں والے گھر کے باہر رات کا آخری پہر تھا، گہرے جامنی آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے، فجر میں ابھی پون گھنٹہ باقی تھا، ماحول میں ہوا کی ہلکی سرسراہٹ تھی، آج چاند کی غالباً تیرہ تاریخ تھی، ہر چیز چاندنی میں نہائی ہوئی تھی، جھینگروں کی آواز ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی، اس گھر کے سارے مکین بے خبر گہری نیند سو رہے تھے، کرم دین صحن میں چاندنی ہونے کے باعث برآمدے میں چارپائی بچھائے سو رہے تھے، اس کی چارپائی اندھیرے میں تھی، جبکہ چارپائی کے نیچے جوتے اور حقہ، چاند کی روشنی میں نہائے ہوئے تھے، اسی دوران باہر کی کچی دیوار کوئی پھلانگ کر اندر آیا اور دھپ کی آواز کے ساتھ صحن میں کودا، کرم دین کچی نیند سے بیدار ہوا اور یوں ہی لیٹے لیٹے آنکھوں کے جھروکوں سے صحن میں دیکھا، جہاں ایک سایہ تیزی سے برآمدے کی طرف لپکا، کرم دین چونکنا ہو گیا، مگر بظاہر بے خبر سویا رہا، وہ سایہ کرم دین کی چارپائی کے قریب آیا، کرم دین نے آنکھیں بند کر لیں اور اسے سوتا سمجھ کر پہلے کمرے کو چھوڑ کر دوسرے کمرے کے آدھ کھلے دروازے کی طرف بڑھا، جہاں امثال اور امینہ سو رہی تھیں، کرم دین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، کچھ دیر بعد اندر سے کھسر پھسر کی آوازیں آنے لگیں، اس سے پہلے کہ کرم دین اٹھتا، دو سائے دبے پاؤں چھت کی طرف چلے گئے، کرم دین پسینے سے شرابور ہو گیا، وہ ایکدم اٹھا، چپل پہننے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی۔

''ایہو جئی کڑیاں نوں زندہ دفنا ونڑا چاہی دا۔'' اسلم کی آواز اس کے کانوں میں گونجی، وہ تیزی سے اندر کمرے کی طرف بڑھا، الماری سے پستول نکال کر وہ دبے پاؤں سیڑھیوں کے زینے چڑھنے لگا۔

''ابا! احمد نال گل کر، اس توں پہلے متھے پہ کالک......''

''شہر دیاں کڑیاں دا بھروسہ نئیں چنگا۔''

''شیدے کی ووہٹی اپنے شہری یار نال بھاگ گئی۔''

''او چاچا، میری مان تو نظر رکھ اپنی نوں

تے۔“

”شہر دیاں کڑیاں دا کوئی بھروسہ نہیں۔“
”شہر دیاں کڑیاں۔“
”شہر دیاں کڑیاں۔“ آواز کی بازگشت اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی، اس کے ہاتھوں میں ٹھنڈا پسینہ امڈ آیا، وہ مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑے پستول پر گرفت بڑھاتا قدم قدم اوپر جا رہا تھا، اوپر سے سرگوشیاں اور امثال کی مدھر ہنسی کی آواز بخوبی اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی، وہ زینہ زینہ چڑھتے بے موت مر رہا تھا، اوپری زینے پر چڑھ کر اس کی نظر چاندنی میں نہائے دو وجود پر پڑی، دونوں کی اس کی طرف پشت تھی، امثال کا سر اس کے کندھے پر تھا اور دوسرے نفوس کا بازو امثال کے کندھے کے گرد حائل تھا، یوں کہ دونوں بے حد قریب تھے، کرم دین کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔
”ایہو جئی کڑیاں نوں......“ وہ اوپری زینہ بھی عبور کر کے چھت پر آیا۔
”ابا اس توں پہلے وہ متھے کالک مل دیوے۔“ رضیہ کی آواز کانوں میں سور اسرافیل پھونک رہی تھی، اس نے ہاتھ میں پکڑے پستول سے امثال کا نشانہ لیا، ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش ہوئی اور ٹھاہ...... ٹھاہ...... کی آواز کے ساتھ تین فائر کر دیئے، اس سے پہلے کہ وہ آنکھیں کھولتا۔
”امثال!“ درد میں ڈوبی ایک مردانہ آواز ابھری اور ساتھ میں امثال کی دلخراش چیخوں نے رات کا سکوت توڑتے اس کچے گھر کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا، نیچے گرے وجود نے بے یقینی سے کرم دین کے ہاتھ میں پکڑے پستول کو دیکھا اور ایک نظر اپنے پیٹ پر رکھے ہاتھوں کو، جو نم تھے، کسی گرم سیال سے، وہ خون میں لت پت نیچے گر چکا تھا، اس کا چہرہ اب چاند کی روشنی میں بالکل واضح تھا، کرم دین صدمے اور بے یقینی سے دو قدم الٹا چلتا پیچھے دیوار سے جا لگا، امثال نیچے خون میں لت پت وجود سے لپٹی اونچی اونچی آواز میں چلا رہی تھی، کرم دین کے وجود میں سنسنی سی دوڑنے لگی، فائر کی آواز اور امثال کی چیخیں، پورا گھر جاگ اٹھا، رضیہ اور امینہ ناسمجھی کے عالم میں اوپر بھاگ آئیں۔
چاند کی روشنی میں ان کی نظر پیچھے خون آلود وجود اور اس پر جھکی امثال پر پڑی۔
”ابا!“ امینہ بے یقینی سے منہ کھولے اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی۔
”ویکھ ابا، میں ناں کہندی تھی کہ شہر دی......“ رضیہ کی بات ابھی منہ میں ہی تھی کہ امینہ کی چیخ نے اس کا دل دہلا دیا، وہ گھبرا کر آگے بڑھی اور لاش پر نظر پڑتے ہی وہ ڈھے سی گئی، خون میں لت پت وجود یقیناً اپنی آخری سانسیں لے چکا تھا اور کرم دین۔

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے گرے وجود اور بین کرتی ان تین عورتوں کو دیکھنے لگا، پھر اس کی نظر ان تین عورتوں میں اس پر پڑی، جو شہر کی تھی، وہ رو رہی تھی، زار و قطار، مگر اس کی آواز کرم دین تک نہیں آ رہی تھی، وہ اردگرد کی کوئی آواز نہیں سن سکتا تھا۔

پیروں تلے زمین تھی نہ سر پہ آسمان، وہ خلا میں تھا، من من بھر کے الٹے قدم چلتا وہ بغور بنا پلک جھپکے اس شہر کی لڑکی کو دیکھ رہا تھا، جس کا سہاگ وہ اجاڑ چکا تھا، اپنے ہاتھوں سے۔
سرپرائز دینے کے چکر میں، احمد خود ایک سرپرائز کی نذر ہو گیا تھا۔

☆☆☆

میری ذات ذرہ بے نشاں

شبانہ شوکت

”افوہ امی! مجھے تو ایک بھی ایسا ڈریس نہیں پسند آ رہا جو ساشا کی منگنی میں پہن کر جاؤں۔“ ہمیزہ نے ہاتھ میں پکڑا سوٹ ایک طرف پٹخا اور گرنے کے سے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئی تھی، سونیا نے اس کے اردگرد بکھرے ملبوسات کو دیکھا اور تحمل کا مظاہرہ کیا۔
”پہننا تو انہی میں سے کوئی ایک پڑے گا، اب ہم ان کے اسٹینڈرڈ تک تو پہنچ نہیں سکتے، تم کتنا ہی مہنگا سوٹ کیوں نہ پہنو، ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، سو جو ہے اسی میں کام چلاؤ۔“
”نہیں امی، میں یہ نہیں پہن سکتی، آپ مجھے نیا سوٹ دلوائیں۔“ وہ ضدی لہجے میں کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔
”کہاں سے دلواؤں، اتنے پیسے نہیں ہیں میرے پاس۔“ سونیا کو غصہ آ گیا۔
”تو میں کم از کم یہ پہن کر تو نہیں جانے والی۔“
”تو مت جاؤ بلکہ بہتر یہی ہے کہ نہ جاؤ، کیونکہ تم اپنی حیثیت سے بڑھ کر بھی پہن اوڑھ لو گی تو وہاں تمہیں وہ بھی کم ہی لگے گا۔“
”اچھی قیمت کے ہوں تو کیوں کم لگیں گے، ہر نصیب ہر چیز کے لئے ترستے ہی رہو۔“
”دوسروں کا محل دیکھ کر اپنی جھونپڑی نہیں جلا لیتے بلکہ ہر حال میں گزارہ کرتے ہیں۔“ اس کے تلخی سے کہنے پر سونیا برہم ہو گئی تھیں۔
”آپ کر رہی ہیں نا؟“
”ہاں کر رہی ہوں اور بہت خوش ہوں، بلاوجہ کڑھ کڑھ کر اپنی قسمت بدلی نہیں جا سکتی سو بہتر یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس جگہ پیدا کیا ہے، وہیں اس کی رضا میں راضی رہ کر اطمینان سے زندگی گزاری جائے۔“
”ہیلو ایوری باڈی۔“ دروازہ کھول کر منیب

نے اندر جھانکا تھا، ہمیزہ سلگ ہی تو گئی تھی۔

''اس کی کمی تھی پہنچ گیا یہ بھی۔''

''کیا بڑبڑا رہی ہو؟'' وہ اس کے ہلتے ہونٹ دیکھ چکا تھا۔

''تمہیں اس سے مطلب؟'' وہ موڈ خراب ہونے کی وجہ سے بدلحاظ ہو رہی تھی۔

''مجھے ہی تو سارے مطلب ہیں، سب کچھ جو تم سے جڑا ہوا ہے۔'' اس نے آہستگی سے خود کلامی کی۔

''تم میرے ساتھ کچن میں چلو منیب، میں تمہیں اچھی سی چائے پلاتی ہوں اور کچھ کام بھی ہے تم سے، وہیں بات کر لیتے ہیں۔'' سونیا اسے وہاں سے ہٹانا چاہتی تھیں کیونکہ ہمیزہ اپنے خراب مزاج کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی بھی کر سکتی تھی۔

''یہ تو بڑا نیکی کا کام کریں گی آپ لیکن ذرا محترمہ کے بگڑے مزاج کا بھی تو ریزن پتا چلے۔'' وہ وہیں اٹکا ہوا تھا، سونیا نے مختصراً صورتحال بتائی۔

''اس میں کیا مسئلہ ہے، ربیعہ سے بات کر لو، ہو سکتا ہے اس کے پاس کوئی اچھا سوٹ ہو یا وہ تمہیں ارجنٹ تیار کر دے۔'' بات ہمیزہ کے دل کو لگی تھی، منیب اور ربیعہ اس کے خالہ زاد تھے، باپ کا سایہ سر پر نہ ہونے کے سبب کم عمری میں ہی مشقت میں پڑ گئے تھے، منیب بھی پڑھنے کے ساتھ ساتھ جاب کرتا تھا اور ربیعہ باقاعدہ سلائی سیکھ کر اب اجرت پر لوگوں کے کپڑے سیتی تھی بلکہ ایک بوتیک کے لئے بھی کام کرتی تھی، اسے بہت اچھی Designing آتی تھی، نیٹ سے ڈیزائن اتار کر ایسے ایسے لباس تیار کرتی کہ عقل دنگ رہ جاتی کہ یہ اس چھوٹی سی لڑکی کا کمال ہے۔

ہمیزہ بائیک پر منیب کے ساتھ ان کے گھر آ گئی، خالہ اسے دیکھ کر خوشدلی سے مسکرائیں، ربیعہ بھی خوش ہو گئی۔

''چلو کسی بہانے تم آئیں تو۔'' وہ اسے بٹھا کر اپنے تیار کردہ ڈریسز دکھانے لگی، ایک ڈبل شرٹ والا سوٹ دیکھ کر وہ اٹک گئی (اس وقت ڈبل شرٹ کا فیشن تھا) کوپر اور فان کلر کے کمبنیشن میں بہت خوبصورت لباس تھا۔

''اس پر تو بہت لاگت آئی ہو گی؟''

''ارے نہیں، یہی تو کمال ہے۔'' ربیعہ ہنس پڑی تھی۔

''یہ کوپر والا سوٹ میرا عید والا ہے، اس کے اوپر یہ فان کلر کا کپڑا لا کر میں نے ڈبل شرٹ اور دوپٹہ بنایا تو یہ بالکل الگ لگنے لگا ہے، تم بھی مجھے اپنے سوٹ دکھانا، میں تمہیں بھی اسی طرح کا بنا دوں گی۔''

اس کے ہنر کی داد نہ دینا زیادتی تھی، ہمیزہ خوب تعریف کر کے وہ سوٹ لے آئی، میچنگ سینڈل میں ربیعہ سے ہی لے لی البتہ پرس اور جیولری کے لئے منیب ہی کے ساتھ گئی تھی، اس کے پاس ٹوٹل دو ہزار روپے تھے، جن سے مطلوبہ چیزیں نہیں آئیں، منیب نے ہی باقی رقم ادا کی تھی، باقی کا دن وہ اپنی تیاریوں میں لگی رہی، دوسرے دن ساشا نے اسے بلوانے کے لئے گاڑی بھجوا دی تھی، وہ حنظلہ کے ساتھ وہاں گئی تھی، توقع کے مطابق فنکشن بہت شاندار تھا، ساشا اور اس کا منگیتر بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے، کھانے کے فوراً بعد وہ اٹھ گئی۔

''ساشا مجھے اجازت دو، امی نے مجھے گیارہ بجے تک کی اجازت دی تھی اور اب ساڑھے گیارہ ہو رہے ہیں دو فون آ چکے ہیں امی کے۔''

''تھوڑا سا اور تو رکتیں ہنی۔'' ساشا نے اصرار کیا۔

''نہیں اب جانے دو، پلیز ساشا۔''

''اچھا میں دیکھتی ہوں، کون فری ہے۔''

اس نے فون پر بات کی۔

''تھینکس گاڈ موسیٰ آ رہا ہے۔''

''موسیٰ، تمہارے بھائی نا؟'' ہمیزہ نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا، ساشا اکثر اپنے بھائی کا ذکر کرتی تھی، جو امریکہ میں زیر تعلیم تھا۔

''یس مائے سویٹ برادر موسیٰ۔''

''وہ کب آئے وہ؟''

''دو ہی تو دن ہوئے ہیں، وہ آ گیا ہے۔''

وہ سامنے دیکھتے ہوئے بے ساختہ اٹھی تھی، ہمیزہ نے بھی اٹھتے ہوئے گردن گھمائی اور کچھ دیر اسی زاویے پر ساکت رہ گئی تھی، وہ ایسی ہی چھا جانے والی پرسنالٹی کا مالک تھا۔

شاندار سراپے کے ساتھ، یونانی نقوش سے سجا وہ بے حد خوبصورت چہرہ، وہ تو ساشا کو ہی بہت خوبصورت سمجھتی تھی پر اس کے بھائی نے تو اسے بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا، ساشا نے باہمی تعارف کروایا تو اس نے ہمیزہ کی طرف دیکھ کر سر کو ہلکے سے خم کیا تھا، ہمیزہ نے بھی اسی طرح سر کو جنبش دی اور رخ پھیر لیا، اس بندے کو تو مزید دیکھنے کا مطلب تھا مسمرائز ہو جانا۔

''تم ڈراپ کرو گے ہمیزہ کو؟''

''آف کورس اور کوئی فری بھی نہیں ہے اور پھر تمہاری فرینڈ کے لئے مجھے ہی آنا پڑا۔''

''تھینکس مائے برادر۔'' ساشا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہمیزہ اور حنظلہ، موسیٰ کے پیچھے چلتے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھے تھے، موسیٰ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا، یہاں تک کہ گھر آ گیا، گاڑی سے اتر کر ہمیزہ نے اس کا شکریہ ادا کیا، وہ ہلکا سا مسکرایا، ہمیزہ نے گھبرا کر رخ ہی پھیر لیا اور آگے بڑھ کر بیل بجانے لگی، اسے زندگی میں پہلی بار دل ہاتھوں سے نکلتا ہوا محسوس ہوا تھا، یہ احساسات تو اس کے کبھی نہیں ہوئے تھے، بلاشبہ ساشا کا بھائی چھا جانے والی پرسنالٹی کا مالک تھا، اٹھتے بیٹھتے اس کا وہ مسکراتا ہوا چہرہ اس کے حواسوں پر سوار رہتا تھا، دو دن بعد وہ پھر دکھائی دے گیا، ساشا کو لینے وہی آیا تھا۔

یونیورسٹی سے باہر آتے ہوئے ساشا حیران تھی۔

''حد ہو گئی یار Unbekiaveable موسیٰ اور میری خاطر اپنے کام چھوڑ کر مجھے لینے آیا ہے۔'' اسے دیکھتے ہی وہ شروع ہو گئی۔

''خیر تو ہے بھائی، تم میرے ڈرائیور کب سے بن گئے؟'' وہ جواب دیئے بغیر مسکراتا رہا، ایک گہری نگاہ ہمیزہ پر ڈالی تھی۔

''ہنی تم بھی چلو نا ہمارے ساتھ، تمہیں بھی ڈراپ کر دیں گے۔''

''نہیں وہ پوائنٹ آ گیا ہے، میں چلتی ہوں۔'' وہ جلدی سے ساشا سے مل کر پوائنٹ کی طرف بڑھی تھی کہ موسیٰ کی آواز کان میں پڑی۔

''ہنی سو سویٹ نیم۔'' اس کا دل یوں دھڑ دھڑانے لگا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا، وہ مڑی بھی نہیں، ظاہر بھی نہیں ہونے دیا کہ اس نے کچھ سنا ہے، مگر کہنے والے کو بخوبی پتا تھا کہ وہ جسے سنانا چاہتا ہے، سنا چکا ہے، پھر بارہا اس سے سامنا ہوا، ساشا کی شادی کی شاپنگ ساتھ ساتھ چل رہی تھی تو ایک دو دفعہ وہ سونیا سے اجازت لے کر اسے بھی ساتھ لے گئی تھی، دونوں بار موسیٰ ہی ساتھ تھا، اس کی بولتی آنکھیں، شوخ مسکراہٹ ہر بار اسے پزل کر دیتی تھیں، انہی دنوں جب ان

کے فائنل سمسٹرز کو ختم ہوئے ہفتہ بھر ہوا تھا، موسیٰ کا رشتہ لئے ساشا اور اس کے والدین چلے آئے، سونیا اور شہزاد تو حیران رہ گئے تھے، اپنے سے اتنے اونچے لوگوں میں رشتے داری کا تو انہوں نے تصور بھی کبھی نہیں کیا تھا، ان سے سوچنے کی مہلت بھی یوں مانگی کہ ساشا کی ایکسائٹمنٹ اور ہمیزہ کے ساتھ چھیڑا چھاڑی نے انہیں شک میں ڈالا تھا کہ کہیں نہ کہیں ان کی بیٹی بھی انوالو تو نہیں، ایک طرف منیب تھا ان کے بھائی کا بیٹا، ان کا سگا بھتیجا، جس کے لئے بچپن سے بھائی، بھابھی نے کہا ہوا تھا، فی الحال وہ جاب لیس تھا لیکن تگ و دو میں تو لگا ہوا تھا، دوسری طرف موسیٰ تھا الیٹ کلاس سے تعلق رکھنے والا، بہت ہی پڑھا لکھا، ماڈ، خوبصورت، اسٹیبلشڈ بزنس مین، جس کے رشتے کے لئے آنکھ بند کر کے ہاں کر دینی چاہیے تھی ہر زبان کا پاس بھی کوئی چیز تھی، پھر شہزاد جہاندیدہ انسان تھے، انہوں نے سونیا سے ایک بار ہمیزہ سے رائے لینے کے لئے کہا تھا، ہمیزہ نے بغیر کوئی ٹائم ضائع کیے موسیٰ کے حق میں رضا مندی دی تھی، تو ان کے دل کو گواہی سچی تھی، وہ لوگ ایسے ہی نہیں آئے تھے۔

''تمہارے ابو نے تمہارے بچپن میں تمہارے لئے منیب کو سلیکٹ کر لیا تھا، اب وہاں کیا کہیں گے۔''

''میں نے منیب کے لئے کبھی کچھ محسوس نہیں کیا اور اگر اللہ تعالیٰ نے میرے لئے اتنا ہائی فائی اسٹینڈرڈ کا رشتہ بھیجا ہے جو میرے خوابوں کی تعبیر ہے، تو میں تو اس رشتے سے کبھی انکار نہیں کرونگی، رہا منیب کا مسئلہ تو وہ آپ لوگوں کا مسئلہ ہے، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔'' اس کے خود غرض لہجے پر سونیا اسے دیکھتی سوچتی رہ گئیں کہ آخر وہ گئی کس پر تھی، ماں باپ کی پریشانی کا کوئی احساس نہیں کہ بچپن کے طے شدہ رشتے کو جواب دے دینے سے ان کے لئے خاندان میں کتنے مسائل پیدا ہو سکتے تھے، اسے بس اپنی خوشیوں سے غرض تھی، منیب کو علم ہوا تو وہ اس کے پاس چلا آیا۔

''تمہیں میرے جذبات کا کوئی خیال نہیں؟''

''مثلاً کیا خیال ہونا چاہیے؟'' اس نے آگے سے سوال کیا، وہ سینے پر ہاتھ باندھے بہت اطمینان سے کھڑی تھی، منیب کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر افسردگی سے مسکرایا تھا۔

''تم بہت مطمئن دکھائی دے رہی ہو، ہونا بھی چاہیے، لیکن کتنا ہی روپیہ پیسہ کیوں نہ ہو، محبت کی اپنی اہمیت ہے، وہ تمہیں وہاں سے مل پائے گی۔''

''آف کورس، آفٹر آل یہ پروپوزل موسیٰ کی ہی مرضی سے آیا ہے۔'' اس نے تیکھی چتون سے جتایا۔

''اللہ کرے جو تم سوچ رہی ہو، ویسا ہی ہو۔''

''دعا کا شکریہ۔'' وہ آگے بڑھ کر برش اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگی تو وہ واپس مڑ گیا، تھکے تھکے قدموں سے، ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ۔

☆☆☆

شادی توقع کے عین مطابق بہت شاندار ہوئی تھی، بری کی ہر چیز اس کی پسند کے مطابق لی گئی تھی اور کیا اعلیٰ بری آئی تھی، خاندان کے جو لوگ منیب کے رشتے سے منع کر دینے پر باتیں بنا رہے تھے، موسیٰ اور موسیٰ سے متعلق ہر چیز کو دیکھ کر انگلیاں دانتوں تلے دبانے پر مجبور ہو گئے تھے، منیب بھی شکستہ دل کے ساتھ سہی پر شریک ہوا تھا، جسے سدا اپنی دلہن کے روپ میں سوچا، وہ کسی اور

کی دلہن بن بیٹھی تھی اور کیا دلہن بنی تھی کہ چاند کو بھی شرما دیا تھا، دل کی خوشی چہرے کی خوبصورتی کو مزید بڑھاوا دے رہی تھی، ان کے ولیمہ والے دن ساشا کی بارات ہوئی تھی، سب بخیر و خوبی ہو گیا تھا وہ اپنی نئی زندگی میں بہت خوش تھی، ایسی لگژری لائف میں اتنی آسان زندگی جینا اس کے خوابوں کا وہ حصہ تھا جو حسین تعبیر کی طرح حقیقت بن گیا تھا، ہنی مون کے لئے موسیٰ اسے یورپ کے ٹرپ پر لے کر گیا تھا، بہت خوشگوار دن تھے، محل جیسے گھر کی ہر آسائش سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اس کا پچھلی زندگی کے متعلق سوچنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا، اس نے جم اور کلب جوائن کر لئے تھے، اتنی مصروفیت میں اسے امی سے بھی ملنے کا وقت نہیں ملتا تھا دن ہفتوں ہفتے مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلتے چلے گئے وہ دو بیٹوں کی ماں بن گئی، بیٹے بہترین اسکول میں جانے لگ گئے، کہیں کوئی کمی نہیں تھی وہ اپنی مصروفیات میں خوش تھی کہ اس دن موسیٰ کے دوست وقاص کی بیوی شانزہ نے جو ہمیزہ کی بھی دوست بن چکی تھی، اس سے استفسار کیا۔

''تمہیں موسیٰ کے نئے افیئر کا کچھ پتا ہے؟''

''نئے افیئر، تم کیا کہہ رہی ہو، میں سمجھ نہیں پائی۔'' اس نے بہت حیرت سے شانزہ کو دیکھا تھا۔

''مجھے پہلے سے ہی لگ رہا تھا کہ تم لاعلم ہو، بہت زبردست افیئر چل رہا ہے موسیٰ کا شاز مین کے ساتھ، وہ اس وقت ٹاپ ماڈل ہے، موسیٰ اس کے فیشن شو میں گیا تھا اور اس کا اسیر ہو کر لوٹا ہے، اب تو وہ دونوں بہت کلوز ہو چکے ہیں، اتنے کہ ہوٹل کے ایک ہی بیڈ روم کو شیئر کر رہے ہیں۔'' ہمیزہ کا منہ تھوڑا سا کھل گیا تھا، شاک پر شاک، اسے تو کچھ خبر ہی نہیں ہوئی کہ موسیٰ بدل رہا ہے، وہ اور موسیٰ ایک ساتھ ہوتے ہی کتنا تھے کہ اسے علم ہو پاتا، وہ تو بزنس کے لئے شہروں شہروں، ملکوں ملکوں جاتا رہتا تھا۔

''اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ہماری کلاس میں اس طرح کی دوستی چلتی رہتی ہے، بس اسے مزید آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔''

''اس طرح کی دوستی، بیڈ رومز کی شراکت داری تک بڑھ جانے والی دوستی، وہ مزید آگے کیا بڑھے گی۔'' وہ سوچتے ہوئے چونکی تھی۔

''یہ تم نے کہا کہ نئے افیئر کے متعلق، کیا موسیٰ کے اس پہلے بھی کوئی افیئرز تھے؟'' شانزہ یوں مسکرائی جیسے اس نے نہایت بچگانہ بات کر دی ہو۔

''موسیٰ تو ہمیشہ سے ایسی دوستیاں رکھنے کا عادی ہے صرف تم ہو جسے اس نے بیوی کا درجہ دیا ہے، پتا تھا نا کہ تم یوں تو نہیں ملنے والی تو شادی ہی سہی۔''

وہ اور بھی پتا نہیں کیا کیا کہتی رہی اور وہ سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ سنتی رہی، وہ تو یہی سمجھتی رہی تھی کہ موسیٰ کو اس سے طوفانی محبت لاحق ہوئی تھی اور وہ آج بھی اس کی محبت میں مبتلا ہے، کبھی اسے روک ٹوک نہیں کی، بچوں کی تربیت کے حوالے سے کوئی باز پرس نہیں، وہ اس سب کو اس کی محبت سمجھتی رہی جو کہ اصل میں اس کی بے پرواہی، بے توجہی تھی، اس کے پاس تو غالباً اتنی فرصت تھی ہی نہیں کہ وہ اس پر اور بچوں پر ایسی کوئی توجہ دیتا۔

☆☆☆

''یہ شاز مین کون ہے اور تمہارے ہی ساتھ اتنی کیوں پائی جاتی ہے؟'' اس نے موقع ملتے ہی موسیٰ پر اٹیک کیا تھا۔

"میری دوست ہے اور اسے میرے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے اس لئے وہ میرے ساتھ پائی جاتی ہے۔" اس نے اتنے اطمینان سے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے جواب دیا تھا کہ وہ کتنی ہی دیر تو بول ہی نہیں پائی تھی۔

"یہ کس قسم کی دوستی ہے جو بغیر کسی جائز تعلق کے......" موسیٰ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"یہ میرا مسئلہ ہے، تمہارا نہیں، تمہارا اور میرا تعلق تو جائز ہے نا، یہ سوچ کر خوش رہا کرو، تمہیں سب کچھ مل رہا ہے، اس لئے آرام سے رہو، میرے معاملات میں بولنے سے پرہیز کیا کرو، میں نے اس کی اجازت کسی کو نہیں دی۔"

"تم میرے ساتھ بے وفائی کرتے رہو اور میں چپ کر کے دیکھتی رہوں؟"

"میں ان فلسفوں کو نہیں مانتا، تمہیں تمہارا حق مل جاتا ہے، تمہارے لئے کافی ہونا چاہیے، تم میری بیوی ہو اور آئندہ بھی میری بیوی کہلانا چاہتی ہو تو خاموشی سے رہو، میں جیسا ہوں، ویسا ہی رہوں گا، تم سوچ لو، میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو بھی اور نہیں رہنا چاہتیں تو بھی، میں تمہارے لئے اپنی دوستی، اپنی مصروفیات نہیں چھوڑ سکتا نہ ہی آئندہ تم مجھ سے یہ کورٹ لگا کر پوچھ گچھ کرو گی، دیٹس اٹ آل۔" وہ بہت بلندی سے گری تھی کہ کرچی کرچی ہو گئی تھی، وہ تو اس خوش فہمی میں تھی کہ موسیٰ اس کی محبت میں حیثیتوں کے فرق کو بھلا کر اسے بیاہ لایا ہے مگر نہیں، حقیقت یہ تھی کہ اسے ایسی ہی بیوی چاہیے تھی جو اس کی رنگ رلیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے گزارہ کرتی رہے، اس کے پاس اب راستہ بھی کیا تھا، واپسی کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی، ان آسائشات کو چھوڑ کر جانا آسان تھا نہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر، اب تو ان بچوں کی خاطر اپنی عزت کی

سے شکایت نہیں کر سکتی تھی، وہ تو اللہ تعالیٰ سے بھی شکوہ نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ سے اس نے صرف دولت مانگی تھی، محبت تو نہیں، دولت تو اسے بے حساب مل گئی تھی بلکہ موسیٰ کی بیوی ہونے کی حیثیت سے عزت بھی بے پناہ تو پھر صرف محبت کے لئے کیا رونا، موسیٰ کی بے وفائی کا بھی کیا گلہ، اس کے پاس جو چیز تھی نہیں وہ اسے کیا دیتا کہیں قریبی مسجد سے آذان کی آواز آ رہی تھی، وہ چونکی، اذان تو پانچ وقتوں میں گونجتی تھی پر اس کے کانوں سے کب ٹکراتی تھی۔

صبح فجر کے وقت تو وہ ابھی گہری نیند میں جانے کا آغاز ہوتا تھا، اس کی صبح تقریباً دو بجے ہوتی تھی، پھر تیار ہو کر ناشتہ کر کے، کبھی کہیں، کبھی کہیں جاتے، میوزک، گپ شپ، پارٹیز میں بھلا کبھی اذان سنائی دیتی ہے اور جب اذان ہی نا سنائی دے تو نماز کا سوچنے کا بھی کسی کو خیال کیسے آتا، شادی سے پہلے بھی وہ باقاعدہ نماز نہیں پڑھتی تھی، مگر یہ حال بھی نہیں تھا کہ سالوں سے نماز ہی نہ پڑھی ہو، کبھی کبھی کی نماز ادا کر کے دعا مانگنے سے اس کے رب نے اسے یوں نوازا تھا کہ اس کی دلی مراد پوری کر دی تھی، اسے ایک امیر اور خوبصورت شوہر عطا کیا تھا تو اب بھی تو وقت تھا کہ وہ اپنے رب سے گڑگڑا کر موسیٰ کے راہ راست پر آ جانے کی دعا کرتی تو اللہ تعالیٰ اس کی یہ خواہش بھی پوری کر دیتا، کیا شک تھا کہ وہ دعا کو قبول کرنے والا توبہ سے خوش ہو کر بخش دینے والا پروردگار اسے یہ سکون بھی عطا کر دیتا، خطا کار سہی مگر اللہ تعالیٰ تو بڑے بڑے گناہگاروں کو بخش دینے والا ہے، شرط سچی نیت کی ہے سو وہ ایک بار پورے اخلاص سے اپنے لئے سکون، سچی خوشی مانگنے والی تھی، وہ ایک بار پھر سجدے میں جھک گئی تھی۔

☆☆☆

فرمان رسول ﷺ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"لوگو! میری مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے آگ جلائی اور جب آس پاس کا ماحول آگ کی روشنی سے چمک اٹھا تو کیڑے پتنگے اس پر گرنے لگے اور وہ شخص پوری قوت سے ان کیڑوں پتنگوں کو روک دیتا ہے لیکن پتنگے ہیں کہ اس کی کوشش ناکام بنائے دے رہے ہیں اور آگ میں گھسے پڑ رہے ہیں، اسی طرح میں تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر آگ سے روک رہا ہوں اور تم ہو کہ آگ میں گرے پڑ رہے ہو۔"

رابعہ رزاق، سیالکوٹ

حضرت محمد ﷺ کی ازواج مطہرات

۱۔ حضرت خدیجہؓ، یہ رسول اکرمؐ کی سب سے پہلی بیوی ہیں، نکاح کے وقت آپ کی عمر چالیس برس جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مبارک پچیس برس تھی۔

۲۔ حضرت سودہؓ، یہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ ہیں، آپ کے پہلے شوہر کا نام سکران بن عمرو تھا۔

۳۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ، آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی ہیں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نکاح کے وقت آپ کنواری تھیں اور ازواج مطہرات میں سب سے کم عمر بھی آپ ہی تھیں۔

۴۔ حضرت حفصہؓ، آپ حضرت عمرؓ کی بیٹی ہیں، آپ بہت سخی اور عبادت گزار خاتون تھیں۔

۵۔ حضرت زینب بنت خزیمہؓ، آپ بہت سخی اور نہایت عبادت گزار خاتون تھیں، آپ غریبوں کی ماں کے نام سے بھی مشہور تھیں، آپ کے پہلے شوہر کا نام عبداللہ بن جحشؓ تھا۔

۶۔ حضرت اُم سلمہؓ، آپ کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی غریب محتاج کو خالی ہاتھ نہ لوٹاتیں، آپ کے پہلے شوہر کا نام ابوسلیمہؓ تھا۔

۷۔ حضرت زینب بنت جحشؓ، آپ بہت مالدار خاتون تھیں آپ کا پہلا نکاح حضرت زیدؓ سے ہوا تھا، پردے کا پہلے پہل حکم ان کی شادی پر ہی آیا تھا۔

۸۔ حضرت اُم حبیبہؓ، ہجرت مدینہ میں یہ بھی شامل تھیں اور حبشہ گئی تھیں، حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے نصرانی سے مسلمان ہونے کے بعد آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے پیام دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبول کرنے پر نکاح کا بندوبست بھی خود نجاشی نے کیا۔

۹۔ حضرت جویریہؓ، یہ ایک لڑائی میں جو (نبی معطلق کی لڑائی کے نام سے مشہور ہے) میں قید ہو کر آئی تھیں، حضرت جویریہؓ کے پہلے شوہر کا نام مسافع بن صفوان تھا۔

۱۰۔ حضرت میمونہؓ، ان کے پہلے شوہر کا نام خویطب تھا۔

۱۱۔ حضرت صفیہؓ، یہ ایک لڑائی میں قید ہو کر آئی تھیں اور ایک صحابی کے حصے میں دی گئی تھیں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے مول لے کر آزاد کر دیا اور پھر نکاح فرمایا، یہ حضرت ہارون کی اولاد میں سے ہیں، ان کے پہلے شوہر کا نام کنانہ بن ابی الحقیق تھا، یہ پہلے یہودی تھیں۔

ریحانہ احمد، سکھر

مسکراتی کرنیں

☆ علم کے پیالے کو اپنے ہونٹوں سے لگا لو جوں جوں علم کے قطرے تمہارے جسم میں پہنچیں گے تمہارے دل و دماغ روشن ہو جائیں گے یہ ہی وہ روشنی ہو گی جو تمہیں منزل مقصود تک پہنچائے گی ڈھونڈ ڈھونڈ کر تاریکی کو علم کی روشنی سے روشن کرو پاکستان کو شمع علم سے جگمگاؤ۔

☆ سب سے اچھا کام وہ ہے جو دوسروں کے لئے کیا جائے۔

☆ علم کو دوسروں تک پہنچانا بھی نیکی ہے۔

☆ جو شخص علم کو پھیلاتا ہے وہ صدقہ دیتا ہے۔

☆ جو شخص اخلاق سے محروم ہے وہ اچھا مسلمان نہیں ہے۔

صبا رانا، کوٹ چھٹہ

عظمت کی باتیں

O احسان کرو خواہ ناشکرے پر کیونکہ وہ میزان میں شکر گزار کے احسان سے عاری ہے۔ (حضرت علیؓ)

O نظر اس وقت تک پاک ہے جب تک اٹھائی نہ جائے۔ (بوعلی سینا)

O کامیابی کا زینہ ناکامیوں کی بہت سی سیڑھیوں سے بنتا ہے۔ (ارسطو)

O اس چھوٹی سی دنیا میں نفرتوں سے بچو اس لئے کہ زندگی کم بلکہ بہت کم ہے۔ (سقراط)

O مصیبت میں آرام کی تلاش مصیبت کو اور بڑھا دیتی ہے۔ (حضرت امام جعفر صادق)

فریحہ رحیم، خانیوال

باتوں سے خوشبو آئے

☆ زندگی میں اگر ایک دوست مل گیا تو بہت سے دو مل گئے تو بہت زیادہ ہیں تین مل ہی نہیں سکتے۔

☆ سچی محبت نایاب ہے اور دوستی اس اس سے بھی نایاب ہے۔

☆ محبت ایک جادو ہے جو وجود کو سحر زدہ کر دیتی ہے۔

☆ محبت ایک ایسا آئینہ ہے کہ ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتا ہے۔

☆ محبت کا لطف محبت کرنے میں ہے۔

زیبا منصور، رحیم یار خان

صدقہ

اپنے بھائی کو دیکھ کر تو متبسم ہوتا ہے تو یہ صدقہ ہے۔

لوگوں کو نیکی کی طرف بلانا اور برائی سے روکنا بھی صدقہ ہے۔

کسی بھٹکے کو سیدھا راستہ بتا دینا بھی صدقہ ہے۔

کانٹا یا پتھر وغیرہ کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔

اپنے ڈول میں پانی بھر کر اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔

نغمانہ حبیب، راولپنڈی

اے دوست تیری دوستی

دوستی کیا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف آراء ہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں دوستی وفا کا نام ہے، کچھ کا خیال ہے دوستی دھوکا، فریب، نفرت کا نام ہے اور کچھ اسے محبت کے ترازو میں تولتے ہیں۔ محبتوں کا گلدستہ اپنی تمام تر رعنائی اور خوشبو لئے زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، دوستی روح کی شاعری ہے، جس کا ایک مصرعہ آپ لکھتے ہیں اور دوسرا آپ کا دوست، دوستی میں وفا کا ہونا بہت ضروری ہے، وفا کے بارے میں شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

خلوص دل ہی نہیں ربط باہمی کے لئے
وفا بھی شرط ہے اے دوست دوستی کے لئے

اس دنیا کا ہر اصول ہے کہ ہر نئی چیز اچھی معلوم ہوتی ہے، مگر دوستی جتنی پرانی ہو گی اتنی ہی پائیدار ہو گی، سچا دوست وہی ہوتا ہے جو دوسرے دوست کو اس کی برائیوں سے آگاہ کرتا ہے، دوستی ایک نازک پھول ہے جسے بداعتمادی کی ذرا سی گرمی بھی مرجھا دیتی ہے، ایسا کانچ کا برتن ہے جو ذرا سی ٹھیس سے چور ہو جاتا ہے اس لئے خلوص دوستی کی شرط اول ہے۔

عاصمہ حیدر، قصور

چمن چمن خوشبو

☆ جس دروازے سے شک اندر آتا ہے محبت اور اعتماد اس دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں۔

☆ بیماریوں میں بڑی بیماری دل کی ہے اور دل کی بیماریوں میں بڑی بیماری دل آزاری ہے۔

☆ انسان کو باد صبا کی طرح ہونا چاہیے کہ ہر کوئی اس کے آنے کا انتظار کرے۔

☆ اتنا اونچا مت اڑو کہ سورج کی گرم شعاعیں تمہیں پگھلا دیں اور تم ایک بے جان شے کی مانند زمین پر آ گرو۔

☆ انسان اتنا غلط نہیں جتنی ان کی سوچ اور رویے غلط ہیں۔

☆ بارش چیتے کی جلد کو بھگو سکتی ہے مگر اس کے دھبے نہیں دھو سکتی۔

☆ طنزوں کے تیر چلانے کے بعد دل جوئی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا نہ خود کو نہ دوسروں کو۔

میراب راشد، وہاڑی

آل عمران

''اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت وصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو ور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

اقامت دین کا یہ کام ہی تحریک اسلامی کا مقصد وجود اور فرض منصبی ہے یہی رضائے الٰہی کا ذریعہ اور حصول جنت کا ضامن ہے، اس مقصد کی تذکیر، مختلف انداز سے، جس کی تفصیل ہمارے لٹریچر میں موجود ہے، ہر وقت ہوتی رہنی چاہیے۔

سائرہ نعمان، کھاریاں

قیمتی جوہر

☆ ہر رات کے بعد دن ضرور طلوع ہوتا ہے اور جو رات صبر سے گزاری جائے اس کی سحر بہت حسین ہوتی ہے۔

☆ انسان کو باد صبا کی طرح ہونا چاہیے کہ ہر کوئی اس کے آنے کا انتظار کرے۔

☆ بارش چیتے کی جلد کو بھگو سکتی ہے مگر اس کے دھبے نہیں دھو سکتی۔

☆ اتنا اونچا مت اڑو کہ سورج کی گرم شعاعیں تمہیں پگھلا دیں اور تم ایک بے جان شے کی مانند زمین پر آ گرو۔

☆ ڈیوڑھی پر چراغ اس وقت تک روشن رکھو جب تک گھر کے سارے افراد واپس نہ آ جائیں۔

☆ اعتماد اس پرندے کا نام ہے جو صبح کاذب میں ہی روشنی کے احساس سے چہچہانے لگتا ہے۔

صباحت علی، منڈی بہاؤالدین

☆☆☆

میری ڈائری سے

صائمہ محمود

نغمانہ حبیب: کی ڈائری سے ایک غزل

محبت اک ادھورا سا خواب ہے
جو نہ دکھا تو نصیب ہے جو دکھ گیا تو کمال ہے
محبت اک انوکھا سا کھیل ہے
گر پا لیا تو فتح ہوئی جو نہ پا سکے تو زوال ہے
محبت اک ادھوری سی بات ہے
جو نہ کہہ سکے تو ادب میں صرف گر جو کہہ دیا تو مجال ہے
محبت اک ادھوری برسات ہے
جو جھڑی لگی تو لگی رہی جو رک گئی تو مثال ہے
محبت اک انوکھا سا طلسم ہے
جو طاری ہوا تو یوں ہوا مزار یار پہ دھمال ہے

عاصمہ حیدر: کی ڈائری سے ایک نظم

تمہیں جاناں اجازت ہے
کہ ان تاریک راہوں پر
تھکن سی خود میں پاؤ تو
اندھیروں نے کبھی دل ڈوب جائے تو
میرے جلتے ہوئے لمحوں
میرے کنگال ہاتھوں سے چھڑا کے اپنے ہاتھوں کو
فضا کی نغمگی سے تم نئے گیتوں کو چن لینا
حسیں پلکوں کی نوکوں پر نئے کچھ خواب بن لینا
کوئی گر پوچھ لے میرا تو اس سے ذکر مت کرنا
میرے جیون کی جلتی دوپہر سے بے غرض ہو کر
تم اپنی چاندنی راتوں میں جگنو پالتے رہنا
میری تنہائیوں کی وحشتوں کی فکر مت کرنا
تمہیں یہ بھی اجازت ہے
میری ہر یاد کو دل سے کھرچنا اور مٹا دینا
کہ جب چاہو بھلا دینا
مگر اتنی گزارش ہے
اگر ایسا نہ ہو جاناں
تو اچھا ہے

میرب راشد: کی ڈائری سے خوبصورت نظم

اگر ہو ممکن
کبھی جو آؤ
تو میرے کمرے
کی سب کتابیں
الٹ پلٹ کر تلاش کرنا
مری پرانی سی ڈائری میں
ورق ورق پہ لکھا ہے
وہ نام تیرا!
اگر ہو ممکن
تو اس حقیقت کی آگہی پہ
یقین رکھنا کہ خواہشوں کو
جو میں نے حرفوں میں ڈھال رکھا
محبتوں میں کمال رکھا
تمہیں اجازت ہے
مرے حرفوں کے سب صحیفے
وہ ہجر لمحوں کے نقش سارے
جو لکھ چکا ہوں
جلا کے رکھ دو، یا پھاڑ ڈالو
تمہیں یہ حق ہے
میں آخری حرف وقت آخر
جو لکھ رہا ہوں
مری نگاہوں کے زرد آنسو
گواہی دیں گے
کہ میں نے کتنی اذیتوں سے
یہ دن گزارے
مگر حقیقت تو یہ ہے جاناں
کہ میری چاہت کو تم بھی بالکل سمجھ نہ پائی

یہی کہوں گا
مری صداقت اسی میں ہے
کہ
مجھے محبت تمہی سے ہے

سائرہ نعمان: کی ڈائری سے ایک غزل

چھوڑ کر تجھ کو گیا وہ بھی کہ جس پر مان تھا
کیوں مکیں کہتے ہو اس کو وہ تو اک مہمان تھا
وہ تو شہرت کے حوالے سے تھا حاتم طائی سا
لوٹنا اس آدمی کو کس قدر آسان تھا
کہتے ہیں کہ بیٹیاں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں
جس نے مسلی ہیں یہ کلیاں وہ ایک شیطان تھا
کس لئے پھرتی ہے صحراؤں میں بل کھاتی ہوئی
دھوپ جو دے کر گیا تجھ کو وہ سائبان تھا
دل سے کچے گھر کو وہ اشکوں کی بارش دے گیا
جو میرا دل تھا میری آنکھیں تھا میری جان تھا
لے گیا جذبوں کی پونجی وہ تو اک نادان تھا
روح میں خانم سکوں کا اک خزانہ آ گیا
سایہ ہے جس کا تیرے دل پر وہ اک قرآن تھا

صباحت علی: کی ڈائری سے خوبصورت غزل

نئے رستوں پہ چلنا چاہتا ہوں
ہوا کا رخ بدلنا چاہتا ہوں
نہ کرو مجھ پر اندھیروں کو مسلط
میں سورج ہوں نکلنا چاہتا ہوں
کسی کے تجربوں کا کیا بھروسہ
میں خود کو تو بدل سکتا نہیں ہوں
میں خود کو بدلنا چاہتا ہوں
زمانے کو بدلنا چاہتا ہوں
پہن رکھا ہے کانٹوں کا لبادہ
مگر پھولوں پہ چلنا چاہتا ہوں
میں ہوں فیضان لفظوں کا سمندر
خزانوں کو اگلنا چاہتا ہوں

فرح سلیم: کی ڈائری سے ایک نظم

''کونج''

پرے دل کی ڈوری تھام کہ
میں چلی پل صراط پر
مرے آس پاس اندھیرا ہے
ہر جانب سایہ تیرا ہے
مجھے خبر نہ ارد گرد کی
آنکھوں میں بیٹھی تتلیاں درد کی
میری ساجن سونی شام دے
آ تو بھی دل کی دوری تھام لے
تو بدل دے رنگ جدائیوں کے
آ ملن کے لمحے
سنگ میرے گزار دے

نسرین فیصل: کی ڈائری سے ایک نظم

''اعتبار''

اک اداس کمرے میں
رات کے اندھیرے میں
سوچ کے دریچوں میں
یاد کے جھروکوں میں
اک دیا سا جلتا ہے
سوچتا ہوں کس طرح
اس نے زندگانی کو
دکھ بھری کہانی کو
معتبر بنایا ہے
مختصر بنایا ہے
پھر تمام سوچوں کی
کرچیاں سمٹ گئیں
فاصلوں میں بٹ گئیں
اس لئے تو کہتا ہوں
پیار سے جدائی میں
فنا کا شوق ہے تو پھر
مئے کشی ضروری ہے
خودکشی ضروری ہے
قضا سے خوف ہے تو پھر
کبھی کسی کی چاہت پہ
اعتبار مت کرنا
اور

پیار مت کرنا

عظمیٰ ساجد: کی ڈائری سے خوبصورت نظم

اذیتوں کے تمام نشتر
میری رگوں میں
اتار کر
وہ بڑی محبت سے پوچھتا ہے
تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا ہے؟

فریدہ عابد: کی ڈائری سے ایک نظم

میں زندگی کی اداس وسعتوں میں الجھ گیا ہوں
میں لمحہ لمحہ بکھر گیا ہوں
میرے لہو میں سمٹے جانے کی اک خواہش
سی اک رہی ہے
ہر ایک تمنا سلگ رہی ہے
تمہیں شریک سفر بنا لوں
لیکن میں دنیا کو جانتا ہوں
کہ میری سوچیں حقیقتوں کے
لہو سمندر میں نہا چکی ہے
میں سوچتا ہوں
تیرے سہارے
خواب ریشمی ہیں
تو میرا کھدر رفاقتوں کا
بھرم کہیں بھی نہ رکھ سکے گا

منزہ سجاد: کی ڈائری سے خوبصورت نظم

''تمہی تو ہو''
تنہائی میں جس کی خاطر روئے
وہ حسین یادم ہی تو ہو
محفل میں ہنسے جس کی خاطر
وہ خوبصورت بات تم ہی تو ہو
جس کے پیچھے بھاگے عمر بھر
وہ حسین خواب تمہی ہی تو ہو
جس خواہش کے لئے بھٹکے در بدر
وہ دلفریب تعبیر تم ہی تو ہو
کیا کہوں تم میرے لئے کیا ہو
میری زندگی، میری ہر خوشی تم ہی تو ہو

عالیہ وحید: کی ڈائری سے ایک غزل

محبتیں بے حساب دینا
کبھی تو خط کا جواب دینا
پہلے قربتوں سے نہال کرنا
پھر دوریوں کے عذاب دینا
وہ بے وفائی میں باوفا ہے
کوئی تو اس کو خطاب دینا
وہ لاکھ دشمن جاں بنے
تم نہ دشمنوں سا جواب دینا
وہ سنگ ہاتھوں میں لے کے آئے
تم تب بھی اس کو گلاب دینا
جو نفرتوں کے امین ٹھہرے
انہیں چاہتوں کے سراب دینا
اتنا آساں نہیں ہے گل
بے خواب آنکھوں کو خواب دینا

صباحت ناصر: کی ڈائری سے ایک غزل

تیری یادیں سنبھال رکھتے ہیں
تم تو یہ بھی کمال رکھتے ہیں
تم بھی اپنے عروج پر رہنا
خود کو ہم لازوال رکھتے ہیں
ان کے بارے میں یہ سنا ہے کہ وہ
مورنی جیسی چال رکھتے ہیں
سال میں چاہے چار دن ہی سہی
ربط ان سے بحال رکھتے ہیں
آزماؤ تم اپنی نفرت کو
ہم محبت کی ڈھال رکھتے ہیں
آج ملنے وہ آئیں گے فرحان
موت کو کل پہ ٹال رکھتے ہیں

☆☆☆

رابعہ رزاق ---- سیالکوٹ

س: عین غین بھیا دل کا دروازہ کس طرف ہوتا ہے؟

ج: آنکھوں کی طرف۔

س: عین غین بھیا سر پر کتنے بال ہوتے ہیں؟ اگر آپ کے ہیں تو گن کر بتائیں؟

ج: جتنے آسمان پر ستارے نظر آتے ہیں اگر آپ کی آنکھیں ہیں تو گن لیں۔

س: عین غین بھیا سنا ہے آپ اپریل میں اپنی سوویں سالگرہ منا رہے ہیں؟ کیا واقعی؟

ج: یہ آپ کو خواب آیا ہے۔

س: عین غین یکم اپریل کو ''ان'' سے کیا شرارت کروں؟

ج: ''ان'' کے سامنے آ جانا وہ ڈر جائیں گے۔

ریحانہ احمد ---- سکھر

س: ''مدت ہوئی ہے آپ کو پریشان کئے ہوئے'' اگلا مصرع لکھیں تو جانیں؟

ج: اس لئے پھر تنگ کرنے آ گئے ہیں ہم۔

س: انو غنو جی کل آپ کو انگلیوں پہ کون نچا رہا تھا؟

ج: وہی جو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں پر آپ کو نچا رہا تھا۔

س: میرے بی اے کے پیپرز سر پر ہیں کوئی جلدی سے ایسا وظیفہ بتائیں پیپرز بھی دے دوں اور فیل بھی نہ ہوں؟

ج: محنت کا وظیفہ کرو۔

س: اصول اور فضول میں کیا بنیادی فرق ہے؟

ج: اگر اصول آپ کو اچھا انسان بناتا ہے تو اصول ہے وگرنہ فضول ہے۔

صبا رانا ---- کوٹ چھٹہ

س: عقلمندی اور بیوقوفی میں کتنا فاصلہ ہے؟

ج: بہت کم۔

س: کبھی کی دن بڑے کبھی کی راتیں، آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: نیک خیال ہے۔

فریحہ رحیم ---- خانیوال

س: مائیکل جیکسن کی روح یہ بتا کل تو لنڈے بازار کی طرف کیوں جا رہا تھا؟

ج: مائیکل جیکسن مر گیا؟ اچھا ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا۔

س: ہائے ٹونی ناراض تو مت ہو بات سنو نجانے کیوں تم بڑے اپنے اپنے سے لگتے ہو؟

ج: لگتا ہے ٹونی کا خط تم نے غلطی سے مجھے بھیج دیا ہے ویسے یہ ٹونی تمہیں اپنا کیوں لگتا ہے کہیں تم بھی تو......؟

س: سن وے بلوری اکھ والیا...... بھلا کیا؟

ج: آگے پورا گانا سن لو۔

س: میرا شعور بہلتا نہیں ہے لفظوں سے؟

ج: خانیوال بہت دور ہے کیا کروں۔

زیبا منصور ---- رحیم یار خان

س: صرف ایک بات پوچھنا تھی اگر محبت پر ٹیکس لگ جائے تو؟

ج: گرلز کالجوں کے دروازے سے رش ختم ہو جائے گا۔

نعمانہ حبیب ---- راولپنڈی

س: مسٹر عبداللہ ایک مدت بعد اس محفل میں حاضر ہوں کیا سماچار ہیں کیسے رہے اتنا عرصہ کیا کبھی ہماری یاد آئی؟

ج: دوبارہ خوش آمدید، سماچار سننے ہیں تو ٹی وی لگالو۔

س: تمہاری سوال پہ سوال کرنے کی عادت نہ گئی پچھلی بار آمنہ کاظمی نے پوچھا دنیا تمہیں اس موڑ پہ لے آئے گی تمہارا جواب تھا کس موڑ پر جواب دیا کرو سوال نہ کیا کرو؟

ج: یہ تم آمنہ کاظمی کی طرف سے کیوں پوچھ رہے ہو کہیں......؟

س: میری روح کی دھرتی پر ہی دکھوں کی فصل کیوں لگتی ہے؟

ج: دھرتی پر جس کا بیج بوؤ گے وہی فصل اگے گی۔

س: اجاڑنے والے بھی کیوں اکثر بھول جاتے ہیں؟

ج: اگر بھولیں نہ تو ان کا جینا حرام ہو جائے۔

عاصمہ حیدر ---- قصور

س: ہیلو مسٹر عین غین تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے ایک ہاتھ سے کیوں نہیں؟

ج: ایک ہاتھ سے بھی بج سکتی ہے ذرا ہاتھ زور و سے اپنے منہ پر تو مارو۔

س: اے مسٹر عورت یہ کب کہتی ہے "لگیاں دے دکھ وکھرے"؟

ج: جب کوئی تم جیسا ایک ہاتھ سے تالی بجانے کی کوشش کرتا ہے۔

س: ارے دل دے جانی ناراض ہو گئے ہون تینوں لگن تے فیر میں پوچھاں؟

ج: میں نے ناراض کیوں ہونا ہے تالی تو تم نے بجائی ہے۔

میرب راشد ---- وہاڑی

س: عین غین جی قربانی کے جانور کو تو اس لئے سجایا جاتا ہے کہ اس کا آخری وقت قریب ہوتا ہے، مگر دلہن کو اس طرح سجانا کیا ظاہر کرتا ہے؟

ج: کہ دولہے کا وقت قریب ہے۔

س: عین غین جی میری ساس مجھے اس واسطے اپنا بیٹا نہیں سمجھتیں کیونکہ پھر میں ان کی بیٹی کا بھائی لگوں گا پلیز اس کا کوئی حل بتایئے؟

ج: تم بھی اپنی ساس کو ماں نہ سمجھنا ورنہ ان کی بیٹی تمہاری بہن لگے گی۔

س: لگتا ہے بڑھاپے نے آپ کے جواب دینے کی سکت پر قبضہ جمالیا ہے اگر ایسا ہے تو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہم مر گئے ہیں کیا؟

ج: اسی کی تو فکر ہے۔

س: کہتے ہیں کہ کسی کو ذلیل کرنا ہو تو اسے الیکشن میں کھڑا کر دیں یا پھر پاکستانی کرکٹ ٹیم کا کپتان بنا دیں، ان دونوں میں سے آپ کون سی سیٹ لینا پسند کریں گے؟ (صرف اپنی بات کرنی ہے)

ج: میں تو کرکٹ ٹیم کا کپتان بننا پسند کروں گا کیونکہ الیکشن میں کھڑے ہو کر جو تمہارے ساتھ ہوا ہے اس کے بعد تو میری توبہ۔

سائرہ نعمان ---- کھاریاں

س: عین غین جی آداب محبت؟

ج: تسلیم۔

س: محبت میں دل ہی کی چلتی ہے دماغ کیوں نہیں؟

ج: اگر دماغ کی چلتی ہوتی تو تم ایسے سوال نہ کرتے۔

☆☆☆

شہر

ایک دیہاتی شخص نے اپنے دوست سے کہا۔

"چلو یار شہر کی سیر کر کے آتے ہیں؟"

دوسرا شخص بولا۔

"نہیں میں ایک بار شہر گیا تھا لیکن اب دوبارہ نہیں جاؤں گا۔"

پہلا شخص بولا۔

"کیوں بھلا ایسی کیا بات ہو گئی؟"

دوسرا شخص بولا۔

"شہر میں جگہ جگہ جو ہدایات لکھی ہوتی ہیں ان پر عمل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، پچھلی بار میں شہر گیا تو ایک جگہ تحریر تھا، "یہاں مت تھوکئے" مجھے مجبوراً وہاں تھوکنا پڑا، آگے بڑھا تو لکھا ہوا تھا "ردی کاغذ اس میں ڈالئے" میں نے سڑک سے ردی کاغذ اٹھا کر ڈال دیئے" ایک اور جگہ لکھا ہوا تھا "رفتار چالیس میل فی گھنٹہ" اب تم ہی بتاؤ مجھ جیسا بوڑھا آدمی اتنا تیز کیسے دوڑ سکتا ہے مرتا کیا نہ کرتا میں نے دوڑ لگا دی اور پھر شہر جانے سے توبہ کر لی۔"

فرح سلیم، علی پور

بہت ہے

خطا تو ہو گئی پر آپ نے بھی
ذرا سی بات پر ڈانٹا بہت ہے
کلاشنکوف سے تو مت ڈراؤ
مجھے تو ایک ہی چانٹا بہت ہے

نسرین فیصل، جہلم

چلو اب مسکراؤ

ایک کاہل شخص کے مکان میں آگ لگ گئی، لوگ بجھانے دوڑے لیکن وہ مزے سے بیٹھا رہا، اس پر ایک شخص نے کہا۔

"تعجب ہے تمہارے گھر میں آگ لگ گئی ہے اور تم آرام سے بیٹھے ہو۔"

کاہل آدمی نے اطمینان سے کہا۔

"آرام سے کہاں بیٹھا ہوں بارش کے لئے دعا کر رہا ہوں۔"

☆☆☆

ڈاکٹر۔

"آپ اچھے ہو جائیں گے لیکن مجمع میں جانے سے پرہیز کیجئے۔"

مریض۔

"لیکن میں اپنے پیشے سے مجبور ہوں۔"

ڈاکٹر۔

"پیشہ کیا ہے؟"

مریض۔

"جیب تراشی۔"

☆☆☆

استاد کلاس کو بجلی کے بارے میں پڑھا رہا تھا۔

"فرض کرو کہ میں پنکھے کا بٹن آن کروں اور پنکھا نہ چلے تو اس کا کیا مطلب ہے؟"

"یہ کہ آپ نے بجلی کا بل ادا نہیں کیا۔"

شاگرد نے معصومیت سے جواب دیا۔

عظمیٰ ساجد، گوجرانوالہ

ہنسنا منع ہے

ایک آدمی اپنے گدھے کو نہلا رہا تھا، دوسرے نے پوچھا۔
''ارے بھئی آج گدھے کو کس خوشی میں نہلا رہے ہو؟''
پہلے آدمی نے کہا۔
''آج گدھے کی شادی ہے۔''
دوسرے شخص نے کہا۔
''ہمیں اس خوشی میں کیا کھلاؤ گے؟''
پہلا شخص بولا۔
''جو دولہا کھائے گا وہی تم کھا لینا۔''

فریدہ عابد، ملتان

رنگ حنا

سجناں رات اندھیری ہے
سکھیاں بھی بیتری ہیں
بس کمی اک تیری ہے

....

تو اک ایسا لٹیرا ہے
میرے دل میں ٹھہرا ہے
اعتبار بھی بس تیرا ہے

منزہ سجاد، سکھر

ہنی مون

شادی کے بعد میاں بیوی ایک صحت افزاء پہاڑی مقام پر ہنی مون پر گئے تو ہوٹل کے منیجر نے نام پوچھے بغیر اندراج کر لیا یہ دیکھ کر بیوی حیران رہ گئی اور کہنے لگی۔
''منیجر صاحب! آپ کو میرے شوہر کا نام کیسے معلوم ہے؟''
منیجر صاحب بولے۔
''آپ کے شوہر ہر سال ہمارے ہوٹل میں ہنی مون مناتے ہیں۔''

عالیہ وحید، فیصل آباد

بہت خوب

بیوی بہت تیزی سے گاڑی چلا رہی تھی، شوہر نے اس سے کہا۔
''تم تیزی سے گاڑی کو موڑتی ہو تو مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔''
بیوی نے ہنستے ہوئے کہا۔
''اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے تم بھی موڑ پر میری طرح آنکھیں بند کر لیا کرو۔''

صباحت ناصر، سرگودھا

دور اندیشی

ایک صاحب اپنے دوست کے سامنے اپنی بیگم کے خلاف دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔
''کبھی کبھی اس کی اوٹ پٹانگ باتیں سن کر میرا دل چاہتا ہے کہ اسے اٹھا کر اوپر کی منزل سے نیچے پھینک دوں، مگر مصیبت یہ ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔''
''کیوں؟''
دوست نے کہا۔
''یقیناً اس کا وزن زیادہ ہوگا۔''
''نہیں۔''
ان صاحب نے چڑ کر کہا۔
''سوچتا ہوں اگر وہ بچ گئی تو میرا کیا ہوگا؟''

عفت آفتاب، جھنگ

یقین

اگر آپ کے ریڈیو کی باریک سی سوئی رات کی تاریکی میں ہزاروں میل دور کی آواز آپ تک پہنچا سکتی ہے اور اگر سارنگی کے بیٹھے سر سمندروں، پہاڑوں، صحراؤں، دریاؤں اور پرشور شہروں سے پرے پہنچ سکتے ہیں تو پھر آپ کو یقین کیوں نہیں آتا کہ خدا بھی تو آپ کی دعا سن سکتا ہے۔

رابعہ رزاق، سیالکوٹ

اجازت

جانے کون ہو تم پھر بھی میں
کتنی دیر سے دیکھ رہا ہوں
دروازے کا اک پٹ کھولے
ناول پڑھتے یوں بیٹھی ہو
جیسے گھر میں تم تنہا ہو
کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟

ریحانہ احمد، سکھر

اقتباس

صبح ناشتے میں نفسیات، دوپہر کھانے میں نفسیات، اونگھنے میں نفسیات، چھینکنے میں نفسیات، او ہو کیا تمہارے ملک میں اس مضمون سے زیادہ دلچسپی لی جا رہی ہے، افسانوں سے لے کر گورکنی تک نفسیات گھسی ہوئی ہے، گورکن کھودتے کھودتے سوچ میں گم ہو جاتا ہے کہ آخر عورتوں نے اس پیشے کو کیوں نہیں اپنایا، سمجھ میں نہیں آتا تو قبر ادھوری چھوڑ کر یونیورسٹی کی راہ لیتا ہے، یونیورسٹی ہال یونیورسٹی اور وہاں سے فرائڈ فرائڈ کا نعرہ لگاتا ہوا واپس آتا ہے اور پہلے سے بھی زیادہ تندہی سے گورکنی میں مصروف ہو جاتا ہے۔

صبا رانا، کوٹ چھٹہ

چاند

اپنی روشنی پورے آسمان پر
پھیلا دیتا ہے
لیکن
دل کے داغ
صرف
اپنے سینے تک محدود
رکھتا ہے
یہ جذبے
سرکش ہیں، باغی ہیں
توڑ دیں گے دیواریں رستے کی
کہ
دل کے جذبے ہار مانتے نہیں
اور عقل کا فلسفہ
شکستہ پیچھے کہیں رہ جاتا ہے

فریحہ رحیم، خانیوال

وقت مختلف لوگوں کی نظر میں

☆ وقت کو پیچھے سے مت پکڑو، اسے آگے سے روک کر اس پر قابو پانے کی کوشش کرو۔
☆ وقت خام مسالے کی مانند ہے جس سے آپ جو کچھ چاہیں بنا سکتے ہیں۔ (امام غزالیؒ)
☆ وقت ایک ایسی زمین ہے جس میں محنت کیے بغیر کچھ پیدا نہیں ہوتا، اگر محنت کی جائے تو یہ زمین پھل دیتی ہے اور بیکار چھوڑ دی جائے تو اس میں خاردار جھاڑیاں اگ آتی ہیں۔ (افلاطون)
☆ وقت ضائع کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ وقت بھی آپ کو ضائع کر رہا ہے۔ (ارسطو)
☆ وقت روئی کے گالوں کی مانند عقل و حکمت کے چرخے میں کات کر اس کے قیمتی پارچہ جات بنا لو ورنہ جہالت کی آندھیاں اسے اڑا کر دور پھینک دیں گی۔ (فیثا غورث)
☆ وقت دولت کی مانند ہے جس کا اسراف واجب نہیں یاد رکھو تم دولت کما سکتے ہو وقت میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ (فرینکلین)
☆ آپ مسرور ہوں یا مغموم تکلیف اور مصیبت سے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ آپ کے پاس وقت نہ ہو۔ (نپولین بونا پارٹ)

زیبا منصور، رحیم یار خان

☆☆☆

بیاض

تسنیم طاہر

عفت آفتاب ---- جھنگ

دل کی گلیوں کے سبھی راستے ازبرا ہیں ہمیں
اک ذرا نظر کی چوکھٹ سے پرے آنے دے
ہم تیرے نام پہ لکھ دیں گے زندگانی اجر
بس دو اک لمحہ اظہار وفا آنے دے

....

ہم بھی اترنیا گے تیرے دل پہ وحی کی صورت
گماں کی تپتی میں عہد یقین کی صورت

....

ہم نے جن سے پیار کیا اور جن کے ناز اٹھائے
ان لوگوں نے شیشے گھر پر پتھر ہی برسائے

رابعہ رزاق ---- سیالکوٹ

جب سے اترا ہے وہ آسیب کی مانند مجھ میں
جوگی بن کر ہیں کئی خواہشیں محو رقصاں

....

بڑھے ہی آ رہے ہیں پھر کسی طوفان کی صورت
لگا کر ہی یہ دم لیں گے ٹھکانے آشیاں میرا
بہت سا گولہ و بارود بھی ہمراہ لائے ہیں
چلے ہیں پھر یاروں جلانے آشیاں میرا

....

خودی کے ساتھ زندہ ہوں ابھی تک اس لئے یارو
کسی کو بھی میرا یہ بانکپن اچھا نہیں لگتا
کریں گے موسم گل میں چمن زاروں کو ویرانے
چمن والوں کو شاید اب چمن اچھا نہیں لگتا

ریحانہ احمد ---- سکھر

مجھے اس کا غم نہیں کہ بدل گیا زمانہ
میری زندگی تم سے ہے کہیں تم بدل نہ جانا

....

بڑا کٹھن ہے راستہ جو آ سکو تو ساتھ دو
یہ زندگی کا فاصلہ مٹا سکو تو ساتھ دو
بڑے فریب کھاؤ گے بڑے ستم اٹھاؤ گے
یہ عمر کا ساتھ ہے نباہ سکو تو ساتھ دو

....

ملے وہ زخم کہ کوشش سے بھی چھپا نہ سکے
کہ اب کے سال تو جبرا بھی مسکرا نہ سکے
یہاں تو لوگ عجیب نفرتوں میں زندہ ہیں
ہمیں تو پیار کے لمحے بھی راس آ نہ سکے

صبا رانا ---- کوٹ چھٹہ

درد انعام میں بخشا ہے تیری یادوں نے
ڈوبتے دل کو دیا جب بھی سہارا ہم نے

....

کچھ بات ہے تیری باتوں میں
یہ بات کہاں تک آ پہنچی
ہم دل سے گئے دل ہم سے گیا
یہ بات کہاں تک آ پہنچی

....

کبھی سائباں نہ تھا بہم کبھی کہکشاں تھی قدم قدم
کبھی بے مکاں کبھی لامکاں میری آدھی عمر گزر گئی
اسے پا لیا اسے کھو دیا کبھی ہنس دیا کبھی رو دیا
بڑی مختصر ہے یہ داستاں میری آدی عمر گزر گئی

فریحہ رحیم ---- خانیوال

اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے

....

خامشی جرم ہے جب منہ میں زبان ہو اکبر
کچھ نہ کہنا بھی ہے ظالم کی حمایت کرنا
مصائب میں الجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے
مجھے ناکامیوں پر اشک برسانا نہیں آتا

....

خطہ ارضی کو خود جنت بنا سکتے ہیں ہم
ولولہ دل میں امنگوں کا اگر پیدا کریں

زیبا منصور ---- رحیم یار خان

شعلہ حسن سے جل جائے نہ چہرے کا نقاب
اپنے رخسار سے پردے کو ہٹائے رکھنا

....

چہرہ ہر صورت کو اپنی شکل میں ڈھال گیا ہے
شہر کے آئینوں سے باقی سارے عکس نکال گیا ہے
اب تو شاید دکھ وفا سن کر بھی میرا دل نہ دھڑکا
یاد کا جھونکا پھر اس پھول میں خوشبو ڈال گیا ہے

....

فراق یار کے لمحے گزر ہی جائیں گے
چڑھے ہوئے دریا اتر ہی جائیں گے
تو میرے حال پریشان کا کچھ خیال نہ کر
جو زخم تو نے لگائے ہیں بھر ہی جائیں گے

نعمانہ حبیب ---- راولپنڈی

ی دو دلوں کی میت کہانی ہے
پیشانی پہ میرا بھی نام لکھنا ہے
سجاؤں گی جب میں چوڑیاں ہاتھوں میں
مہندی میں سجناں تیرا نام لکھنا ہے

....

وہ داستان محبت کرنے کے بیاں ہنر جانتا تھا
اس لئے لوگ آج اسے بڑا کہانی کو مانتے ہیں

....

کل تو کسی سے کہہ رہا تھا
ہوا بہت خنک ہے آج دوست
تجھے کب معلوم ہوا تھا کہ
شامل اس میں میرے چند آنسو بھی ہیں

عاصمہ حیدر ---- قصور

اوراق پریشاں کے شعلوں کے دہکنے سے
پھولوں کے مہکنے سے چڑیوں کے چہکنے سے
ذہن کے گلستاں میں یہ بات ہے آئی
شاید کہ بادصبا نے لی ہے انگڑائی

....

جو یادگار پل ہمارے سنگ گزرے ہیں
کبھی تو کسی موڑ پر ہم تمہیں یاد آئیں گے
اچھا لگتا نہیں مجھ کو ہم نام تیرا
کوئی تجھ سا ہو تو نام بھی تجھ سا رکھے

....

بیٹھے سوچتے ہیں مگر کچھ یاد نہیں آتا
جانے کب سے آباد تو دل کے نگر میں ہے
کوئی تصویر نہ ابھری تیری تصویر کے بعد
ذہن خالی ہی رہا کاسہ سائل کسی طرح

میرب راشد ---- وہاڑی

جھیل سی اپنی طبیعت ہے ذرا سی بات پر
ذہن میں الفاظ جم جاتے ہیں کائی کی طرح

....

جانے کیوں یہ گماں رہتا ہے
کہ وہ نظر آئے گا سرراہ چلتے وقت
خدا لکھ دے گا اسے میری قسمت میں
کسی قبولیت کی گھڑی میں شام ڈھلے وقت

....

کس طرح مجھے ہوتا گماں ترک وفا کا
آواز میں ٹھہراؤ تھا لہجے میں روانی
بہت کم لوگ واقف ہیں سخن آثار لمحوں سے
جسے محسوس کرتے ہیں اسے لکھا نہیں جاتا

سائرہ نعمان ---- کھاریاں

ہو لاکھ کوئی شور مچاتا ہوا موسم
دل چپ ہو تو باہر کی فضا کچھ نہیں کہتی

....

شعور اب تک اسی شے کی کمی ہے
وہی جو چاہیے تھا چاہیے ہے

....

جنگلوں میں شام اتری خون میں اذیت قدیم
دل نے اس کے بعد انہونی کا ڈر رکھا نہیں

صباحت علی ---- منڈی بہاؤالدین

یہ تیرا عز سفر یہ میرے ہونٹوں کا سکوت

اب تو دنیا نے کہے گی شکایت کی تھی
میں سمجھ لوں گا میں نے اک انساں کے عوض
اک بے جان ستارے سے محبت کی تھی

....

میرے قلم سے لکھی گئیں
نہ میری زبان سے ادا ہوتی ہیں
جو نظر سے کہنے کی بات ہے
کسی حرف نہیں نہ سمائے گی

....

کوئی پھول چھتا ہے کس طرح
کوئی ڈھول ہوتا ہے کس طرح
تجھے تو وقت کی بات ہے
زندگی ہی بتائے گی
فریح سلیم ---- علی پور

آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا
پتھر کہتا ہے مجھے میرا چاہنے والا اکثر
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

....

حاصل زندگی عشق وہ ایک لمحہ ہے
عمر بھر جو کبھی حاصل نہیں ہونے پاتا

....

نہ اعتبار خدا ہے نہ اعتماد خودی
گھلا ہوا ہے عجب زہر سا فضاؤں میں
یہ کیا ستم ہے کہ اک شہر میں رہتے ہوئے
نہ تم ملو کبھی ہم سے نہ ہم دکھائی دیں
نسرین فیصل ---- جہلم

ریت میں پھول اگے دھوپ میں جاگی ٹھنڈک
دشت احساس میں پھیلا تیری یادوں کا گلال

....

دل داغ داغ ہے تو بہاروں کا کیا قصور
دھوکا فصیل رنگ پہ خود ہو گیا ہمیں

....

قافلہ جیسے اجالوں کا یہیں اترے گا
وقت سے پہلے چراغ اپنے بجھائے ہم نے
عظمیٰ ساجد ---- گوجرانوالہ

خوابوں کے جزیروں میں اتر آتے ہیں اکثر
وہ لوگ کہ اب جن سے ملاقات بھی کم ہے

....

مل کے اس شخص سے میں لاکھ خموش سے چلوں
بول اٹھتی ہے نظر پاؤں کی پائل کی طرح

....

یہ اور بات ہے تھک ہار کے وہ سویا ہے
جو تم ملو گے تمہیں رتجگے بھی دے گا وہ
فریدہ عابد ---- ملتان

بس ایک تیرے بچھڑنے کی دیر تھی
سمٹ کے آ گیا لمحوں میں کرب صدیوں کا

....

دکھوں کی ریت کا وہ پھیلا ہے کرب سوچوں میں
کہ سکھ رتوں میں بھی یہ دل اداس رہتا ہے

....

ہے ایک عمر سے جاری یہ رتجگوں کا سفر
ہماری آنکھوں میں نیندوں کا ذائقہ نہ رہا
منزہ سجاد ---- سکھر

اے دوست میرے ظرف محبت کی داد دے
ہے دل کی چوٹ لب پہ تبسم بنی ہوئی

....

بے کار چاہتوں کے تقدس میں وہ مجھے
کچھ نہ ہوا تو ہدیہ تنہائی دے گیا
بخشا ہے ٹھوکروں کے سنبھلنے کا حوصلہ
ہر حادثہ خیال کو گہرائی دے گیا

....

جانے کیا بات تھی اس روز کوئی در نہ کھلا
عمر مسافر تھا اور ایسا کہ ٹھکانہ چاہے
عالیہ وحید ---- سرگودھا

اپنی چاہت میں خود کو کئی خط لکھے
ان کو کھولا پڑھا تہہ کیا رکھ دیا

☆☆☆

حنا کا دستر خوان

افراح طارق

پیچ ٹوپڈ پنیر سلاد

اشیاء

آڑو	دو عدد گول
ایپل جام	ایک کھانے کا چمچہ
مکس ڈرائی فروٹ	نصف کپ
کریم	ایک کھانے کا چمچہ
چینی	پانچ کھانے کے چمچ
پنیر	ڈیڑھ کپ

ترکیب

آڑو کے چار پیس کر لیں، ایک دیگچی لیں اس میں چار چمچے چینی اور چار چمچے پانی ڈال کر چولہے پر رکھ کر ایک ابال دلائیں، اس کے بعد اس میں آڑو ڈال کر پکا لیں، احتیاط سے کہ آڑو ٹوٹنے نہ پائیں، جب چینی کا پانی خشک ہو جائے تو دیگچی چولہے سے نیچے اتار لیں۔

ایک پیالی لیں اس میں کریم ایک چمچہ چینی، پنیر اور جام ڈال کر ساتھ ہی ڈرائی فروٹ بھی ڈال دیں پھر ان سب کو آپس میں مکس کر لیں، آڑو ٹھنڈے ہو جائیں تو انہیں ایک باؤل میں رکھ کر اس میں کریم اور پنیر کا آمیزہ اس طرح بھریں کہ وہ چوٹی کی طرح ہو جائے، لذیز پیچ ٹوپڈ پنیر تیار ہے۔

مزے دار سلاد

اشیاء

کاہو (سلاد کا پودا)	ایک پھول
شملہ مرچ	ایک عدد
ٹماٹر	تین عدد
پنیر	آدھا پاؤ
گوشت کے ٹکڑے	ایک پاؤ
تیل	تین کھانے کے چمچے
سیب کا جوس	تین کھانے کے چمچے
نمک	نصف کھانے کا چمچہ
کالی مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
چینی	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب

کاہو کے پھول سے پتوں کو علیحدہ کر کے ان کو اچھی طرح صاف کر کے ایک طرف رکھ لیں، ان پتوں کو ایسے برتن میں ڈال کر رکھیں جس میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوں تا کہ ان پر لگا ہوا پانی بھی نیچے گر جائے اور پتیاں بالکل خشک ہو جائیں۔

شملہ مرچ کا تمام گودا اور بیج اس میں سے نکال لیں اور اس طرح باقی صرف خول رہ جائے گا، پھر اس خول کی لمبائی کے رخ ٹکڑے کر لیں اور اس طرح کہ ایک ٹماٹر کے آٹھ ٹکڑے بن جائیں، پنیر اور ابلے ہوئے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لین اور سلاد کے پتے کاٹ لیں پھر سلاد کے پتے، ٹماٹر، پنیر، گوشت، ہری مرچ کے ٹکڑے ایک بڑے پیالے میں ڈال لیں، اس کے بعد ان چیزوں میں تیل، سیب کا جوس، نمک، کالی مرچ، چینی ڈال دیں ان تمام کو اچھی طرح ملا دیں، سلاد تیار ہے، یہ سلاد چار افراد کے لئے کافی ہے۔

دہی و سبزیوں کا سلاد

اشیاء	
دہی	آدھا کلو
آلو ابلے ہوئے	تین عدد
پیاز باریک کتری کٹی ہوئی	ایک پیالی
کھیرا	دو عدد
نمک کالی مرچ پسی ہوئی	حسب ذائقہ
مرغی ابلی ہوئی	چند ٹکڑے

ترکیب

مرغی کے باریک ٹکڑے کر لیں، ابلے ہوئے آلو کش کر لیں، ایک عدد کھیرا، کش کر لیں، دوسرے کھیرے کے پتلے ٹکڑے کر لیں، ایک کھلے منہ کے پیالے میں دہی ڈال کر پھینٹ لیں، دہی میں آلو اور کٹی ہوئی پیاز ڈال کر پھینٹیں، ساتھ نمک اور کالی مرچ شامل کر دیں، دہی میں مرغی کے ٹکڑے اور کش کیا ہوا کھیرا ڈال کر یکجا کر لیں، ڈش میں دہی کا آمیزہ ڈالیں، دہی کے آمیزے پر کٹا ہوا کھیرا رکھ دیں، عمدہ ترین اور لذت سے بھرپور سلاد تیار ہے، تناول فرمائیں۔

پوٹیٹو سلاد جرمن

اشیاء	
آلو	چھ عدد
ٹماٹر سلائس کیا ہوا	ایک عدد
آٹا	چار بڑے چمچے
پانی	ایک چوتھائی کپ
پنیر	ایک پاؤ
سرکہ	آدھا کپ
تازہ دھنیا کے پتے	ایک بڑا چمچہ
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
سیاہ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
کھیرا سلائس کیا ہوا	ایک عدد
پیاز سلائس کیا ہوا	ایک عدد
لیموں و پودینہ کے پتے	سجاوٹ کے لئے
شکر	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب

سب سے پہلے آلوؤں کو ابال لیں اور ٹھنڈا ہونے لگے تو انہیں چھیل لیں، اس کے بعد انہیں باریک سلائس کی شکل میں کاٹ کر ایک بڑے پیالے میں ڈال دیں اور پھر اس میں شکر اور آٹا شامل کر لیں، اس کے بعد اس میں نمک اور سیاہ مرچ بھی ڈال دیں اور پھر بتدریج اس میں سرکہ اور پانی بھی ڈالتے جائیں اور چمچہ چلاتے جائیں، جب گاڑھا ہو جائے تو اس مکسچر کو آلو والے پیالے میں انڈیل دیں، کھیرا، ٹماٹر، لیموں اور پودینہ کے پتے سے سجا کر پیش کریں، بہت ہی عمدہ اور ذائقے سے بھرپور صحت بخش سلاد تیار ہے۔

بارلے ود چکن سلاد

اشیاء	
بارلے (جو)	ایک کپ
مکھن	دو کھانے کے چمچے
چکن ٹکڑے	آدھا کلو گرام
سیاہ مرچ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ضرورت
سلاد کے پتے	چند عدد
پانی	حسب ضرورت
ادرک پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
سیسم آئل	سات ملی لیٹر

ترکیب

مرغ کے ٹکڑے اور بارلے (جو) پانی میں ڈال کر ہلکی آنچ پر پکا لیا جائے اور جب تھوڑا سا پانی رہ جائے تو اسے چھان لیں اور گوشت کے ٹکڑے نکال کر پلیٹ میں رکھ لیں، اس کے بعد اسے اس پانی میں پکا لیں جو پھینک دیں اور پھر اس میں ادرک اور پیاز ڈال کر پکنے کے لئے رکھ دیں، کچھ دیر بعد اسے اتار لیں اور گوشت کے ٹکڑوں کو پلیٹ میں ڈال کر پسی ہوئی سیاہ مرچ اور نمک چھڑک دیں، پھر اس کے اوپر سرکہ ڈال دیں، اس کے بعد اس پر سیسم آئل چھڑک دیں اور خوب اچھی طرح سے ہلائیں اور پھر اس پر سلاد کے پتے ڈال کر نان کے ساتھ تناول فرمائیں، بہت ہی مزے دار اور پر لطف سلاد تیار ہے۔

ریڈ بین سلاد

اشیاء	
ریڈ بین فلنگ کے لئے	پندرہ گرام
ریڈ بین سرخ پھلیاں	پانچ گرام
پیاز لچھے دار کاٹیں	چند عدد
سوڈا واٹر	تین سو ملی لیٹر
سلاد کے پتے	چند عدد
وائٹ گرینولٹیڈ شوگر	چھ گرام
ادرک کٹا ہوا	دس گرام
مونگ پھلی کا تیل	ڈیڑھ لیٹر
سرکہ	چالیس لیٹر
سیسم آئل	دس ملی لیٹر
چینی	بیس گرام
سیاہ مرچ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ضرورت

ترکیب

سب سے پہلے ریڈ بینز یعنی سرخ پھلیوں کو دھو کر صاف کر لیں اور پھر ان کو ایک گہرے برتن میں ڈال دیں، پھر اس قدر پانی ڈالیں کہ اس سے پھلیاں اچھی طرح سے ڈھک جائیں، ہلکی آنچ پر ابال لیں اور صرف اس قدر ابالیں کہ پھلیاں نرم ہو جانی چاہیں، سوڈا ڈالنے سے پھلیاں جلد اور کافی نرم ہو جاتی ہیں، اس کے بعد پھلیوں کو کچومر نکال کر ان کا پیسٹ بنا لیں اور پھر اس پیسٹ کو کپڑے کی تھیلی میں ڈال دیں، پھر اسے بند کر کے زور سے دبائیں اور اس میں موجود تمام مواد نکال دیں۔

پھر مونگ پھلی کے تیل کو ایک ساس پین میں گرم کر لیں اور جب تیل اچھی طرح سے گرم ہو جائے تو پھر اس میں بین پیسٹ ڈال کر فرائی کر لیں، یہاں تک کہ پیسٹ خشک ہو جائے اور لیس دار بھی ہو جائے، اس کے بعد تیز چھری سے اس کے ٹکڑے کر لیں اور اس پر سلاد کے پتے ڈال دیں، اس کے بعد سرکہ اور چینی ایک پیالے میں ڈال کر اسے اچھی طرح سے مکس کر کے چینی سی بنا لی جائے اور پھر لچھے دار کٹا ہوا پیاز پیسٹ کے ٹکڑوں پر پھیلا دیا جائے، اس کے بعد اس پر سرکے والی چینی ڈال دی جائے اور اس پر کٹا ہوا ادرک اور سیسم آئل ڈال دیں، اس کے بعد نان اور روسٹ گوشت کے ساتھ پیش کریں، سلاد کی عمدہ ترین اور لذت سے بھرپور ڈش تناول فرمائیں۔

کبابی مٹن

اشیاء	
مٹن	آدھا کلو
دہی	آدھا کپ
پسی ہوئی پیاز	نصف کپ
پسی ادرک	ایک چائے کا چمچ
پسا لہسن	ایک چائے کا چمچ
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ

ترکیب

تیل کے علاوہ تمام اشیاء کو مٹن میں ملا کر آدھے گھنٹے کے لئے رکھ چھوڑیں پھر اسے ابال لیں، جب گوشت گل جائے تو گرم تیل میں مٹن تل لیں، جب سنہری ہو جائے تو نان کے ساتھ پیش کریں۔

منفرد چنے، حلوہ پوری اور آلو

اشیاء

چنے کے لئے

سفید چنے رات کو بھگو دیں	آدھا کلو
پیاز درمیانی	دو عدد
ٹماٹر باریک کاٹ لیں	دو سے تین عدد
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ کٹی ہوئی	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک، لہسن پیسٹ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
سفید زیرہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت
سبز الائچی	چھ عدد
کشمش	تین کھانے کے چمچے
بادام بھگو لیں	دس عدد
گرم مصالحہ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
دال مسور بھگو دیں	تین کھانے کے چمچے
ہرا دھنیا، ہری مرچیں	حسب ضرورت

ترکیب

چنے کو ابال لیں، پیاز کو کاٹ کر ابال کر پیس لیں، دیگچی میں تیل گرم کریں الائچی ڈال کر کڑ کڑائیں اب اس میں پیاز کو ڈال کر بھونیں، جب پیاز اچھی طرح بھن جائے تو اس میں ادرک، لہسن پیسٹ اور ٹماٹر ڈال کر بھونیں، جب بھن جائے تو نمک لال مرچ، زیرہ پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر ڈالیں اور ایک منٹ تک بھونیں، جب بھن جائے تو بادام چھیل کر ثابت ہی ڈال دیں، ساتھ دال، کشمش اور دو کپ پانی ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر پکائیں، جب دال گل کر مصالحہ کی طرح بن جائے اور تیل اوپر آ جائے تو گرم مصالحہ پاؤڈر، ہرا دھنیا اور ہری مرچیں ڈال دیں اور سرو کریں، نہایت مزے دار چنے تیار ہیں۔

حلوے کے لئے:۔

سوجی	آدھا کپ
چینی	آدھا کپ
گھی	آدھا کپ
کھویا	آدھا کپ
ناریل پسا ہوا	آدھا کپ
پستہ کٹا ہوا	دو کھانے کے چمچے
پانی	دو کپ
کیوڑا	چند قطرے
چاندی کے ورق	حسب ضرورت
انڈے	دو عدد

ترکیب

پانی میں چینی ڈال کر اتنی دیر پکائیں کہ شیرہ تیار ہو جائے دوسرے پین میں گھی گرم کریں اور سوجی کی رنگت گولڈن ہونے تک فرائی کریں، جب سوجی گولڈن ہو جائے تو شیرہ ڈال کر پکائیں، ایک الگ پین میں انڈے پھینٹ کر فرائی کریں، جب شیرہ خشک ہو جائے تو کھویا، ناریل اور فرائی انڈے ڈال دیں اور بھونیں، جب بھن کر گھی الگ ہو جائے اور حلوہ پیندہ چھوڑنے لگے تو پستے اور کیوڑہ ڈال دیں اور اتار لیں، سرونگ ڈش میں نکالیں اور چاندی کے ورق لگائیں۔

فوزیہ شفیق

السلام علیکم!

آپ کے خطوط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں، آپ سب کی صحت و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ۔

مارچ آیا، رت بدلی، درختوں پر چمکتے نئے سر سبز پتے، خوش رنگ پھول، بہار کی نوید سنا رہے ہیں، فطرت ازل سے اپنا یہ عمل جاری و ساری رکھے ہوئے ہے، موسم بدلتے رہتے ہیں، ہر دن کے بعد رات اور ہر رات کے بعد نیا سورج طلوع ہوتا ہے، لیکن اگر نہیں بدلتے تو وہ حالات ہیں۔

تہذیب و تمدن کے بڑے بڑے دعوؤں کے باوجود وحشت و بربریت کا سلسلہ جاری ہے، سائنسی اور مادی ترقی کی انتہا کو چھوتی ہوئی اس دنیا میں اگر آج سب سے زیادہ غیر محفوظ ہے تو وہ انسان ہے، خود کو سپر پاور کہلانے والوں نے عراق، افغانستان، لیبا میں شاطرانہ چالوں سے اس کو تباہی کے کنارے پہنچا کر اب اپنی نگاہیں شام پر گاڑ رکھی ہیں، دوسری طرف ہمارا یہ حال ہے کہ ہم ابھی تک اپنے وجود کا تشخص اور تعین ہی نہیں کر پا رہے، پاکستان جو ہماری پناہ گاہ ہے، ہمارا وطن ہماری جنت ہے، اسے کرپشن لوٹ مار، کھاؤ اور کھانے دو کی پالیسی اپنا کر دن بدن کمزور کرتے چلے جا رہے ہیں۔

دنیا ترقی کی انتہاؤں کو چھو رہی ہے اور ہم ابھی تک اپنے تعصبات سے ہی باہر نہیں نکل پا رہے، موجودہ حکمرانوں کو ملک کی بھاگ دوڑ سنبھالے بھی ڈھائی سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، لیکن کہیں مثبت پیش رفت تو کیا ہوتی، حالات مزید ابتری کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، پتا نہیں اہل اقتدار کو اس صورت حال کا کب اندازہ ہوگا، کہتے ہیں کہ انتہا کو پہنچ جانے کے بعد تبدیلی آتی ہے، اس وقت ہم جن بدترین حالات گزر رہے ہے، کیا ممکن ہے کہ عنقریب کوئی ایسی تبدیلی آئے جو ہماری زندگیوں کو سہل بنا دے؟

آیئے درود پاک، استغفار اور کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حضور سر بسجود ہو کر دعا کریں۔

کہ اللہ پاک ہمارے وطن کو مشکلات سے نکال کر اس کو ایماندار نیک اور صالح قیادت عطا کرے جو صرف اور صرف پاکستان کے لئے سوچے اس کے لئے مخلص ہو اور اس کی فلاح کے لئے خود کو وقف کرے آمین یارب العالمین۔

آیئے آپ کے خطوط کی محفل میں چلتے ہیں، یہ پہلا خط ہمیں میاں چنوں سے حمیرا ادریس کا موصول ہوا ہے وہ لکھتی ہیں۔

فروری کا شمارہ سادہ مگر پرکشش سرورق سے مزین ملا، حمد و نعت اور پیارے نبی کی پیاری باتوں سے مستفید ہو کر آگے بڑھے اور انشاء نامہ ''رباعی سے رکابی تک'' پڑھ کر لطف اندوز ہوئے اس مرتبہ سندس جبیں نے ایک دن حنا کے ساتھ گزارا، خاصی خود پسند سی لگی محترمہ، خیر آگے بڑھے اور اس تحریر کی طرف بڑھے، جو آج کل ہمارے دل و دماغ پر حاوی ہونے لگی ہے جی ہم

بات کر رہے ہیں اُم مریم کی تحریر ''دل گزیدہ'' کی، کمال کی لفاظی بہترین ڈائیلاگ ڈیلیوری اور دلکش منظروں سے سجی اس تحریر کی تیسری قسط انتہائی شاندار تھی، بہت خوب اُم مریم آپ کی تحریر کے سحر نے ایک مرتبہ پھر ہمیں جکڑنا شروع کر دیا ہے، اللہ کرے اور زور قلم زیادہ، اُم مریم کے بعد جس مصنفہ کی تحریر نے اپنی طرف بے ساختہ متوجہ کیا وہ تھا صوفیہ چشتی کا مکمل ناول ''طواف محبت'' تحریر کا عنوان بے ساختہ اپنی طرف متوجہ کرنے والا تھا جبکہ ناول کی کہانی بھی اچھی تھی بس ایک چیز جو کہ ناگوار گزری وہ تحریر میں انگلش کا بے جا استعمال تھا، نہ جانے مصنفین کو یہ احساس کیوں ہوتا ہے کہ ہم اگر انگریزی زبان کا استعمال نہیں کریں گے، تو ہماری تحریر ادھوری لگے گی، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں، اچھا بھلا روانی میں پڑھتے پڑھتے انگلش کا فقرہ ایسے ہی محسوس ہوتا ہے جیسے بریانی کھاتے کھاتے منہ میں کنکر آ جائے۔

نایاب جیلانی کا سلسلے وار ناول ''پربت کے اس پار کہیں'' بھی اب دلچسپ ہوتا جا رہا ہے جبکہ سدرۃ المنتہیٰ کے ناول نے تو روز اول سے ہمیں اپنے لفظوں میں قید کر رکھا ہے، بلاشبہ اس ناول کا شمارہ سدرۃ المنتہیٰ کی بہترین تحریروں میں ہوگا، اُم ایمان کا نام مکمل ''زندگی تیرے دم سے'' پسند آیا، ارے واہ جی واہ افسانوں میں ہماری پیاری راج دلاری، عالی ناز صاحبہ تشریف لائیں ایک عرصے بعد اپنے مخصوص رنگ میں، بہت خوب افسانہ پڑھ کر مزہ آ گیا، عالی ناز پلیز آپ ایسی ہی ہلکی پھلکی تحریر لکھا کریں سنجیدہ تحریر آپ پر سوٹ نہیں کرتی، سویرا فلک کا افسانہ بھی بہتر تھا، ناولٹ میں تحسین اختر کی تحریر بے حد پسند آئی جبکہ فرح طاہر کے ناولٹ کی تیسری اور آخری قسط تھی لیکن کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ پائی، مستقل سلسلے میں حاصل مطالعہ میں رابعہ رزاق، صبا رانا اور زیبا منصور کا انتخاب بہترین تھا بیاض میں سبھی دوستوں کی پسند اچھی لگی، جبکہ میری ڈائری میں، مریم ماہ منیر، عابد محمود، فریدہ عابد اور منزہ سجاد کا انتخاب لاجواب تھا، رنگ حنا ہمیشہ کی طرح مسکراہٹوں کے خزانے بانٹے، عین غین ایک عرصے بعد خوشگوار موڈ میں نظر آئے، حنا کی محفل میں، دستر خوان تو ہوتا ہی مزے دار ہے جبکہ فوزیہ آپی حسب معمول دوستوں کو اکٹھا کیے اپنی محبتیں فراخ دلی سے بانٹتی نظر آئیں، دیکھتے ہیں اس مرتبہ ہمیں خوش آمدید کہتی یا پھر ردی کی ٹوکری کی نظر کرتی ہیں۔

حمیرا ادریس خوش آمدید آپ کو بے پناہ محبتوں کے ساتھ، فروری کے شمارے کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ آپ کی تعریف وتنقید ان سطور کے ذریعے مصنفین کو پہنچائی جا رہی ہے ہم آئندہ بھی آپ کی محبتوں کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

فرزانہ حبیب: کراچی سے تشریف لائی ہیں وہ لکھتی ہیں۔

سب سے پہلے آپ کے بزم سے طویل غیر حاضری کے لئے معذرت، سولہ دسمبر 2015ء کو میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئی ہوں اس کے بعد نئی زندگی میں تھوڑا ایڈجسٹ ہونے کے لئے ٹائم چاہیے تھا، دعا کیجئے گا کہ قلمی سفر کے ساتھ زندگی کے اس شاہراہ سفر میں بھی خوشیاں اور قلبی سکون نصیب ہو آمین۔

اب آ جاتے ہیں فروری کے شمارہ کی طرف تمام قارئین کی مشکور ہوں جنہوں نے میرے اس ناول ''مجھے آواز دے لینا'' کو بھی پسندیدگی کی سند بخشی۔ابھی میں طفل مکتب ہوں آپ سب کی

قیمتی رائے مجھے جلا بخشتی ہے، خاص طور پر مہرالنساء، سمعان آفندی اور ثمینہ بٹ اور جن لوگوں نے ای میلو اور فیس بک کے ذریعے میرے ناول کے بارے میں رائے دی ان سب کا ڈھیروں شکریہ سب سے پہلے اسلامیات سے دل کے ایوان کو روشن کیا، پھر اپنے پسندیدہ مصنفہ اُم مریم کے ناول ''دل گزیدہ'' کی طرف بڑھے نام ہی دل کو چھو لینے والا ہے دوسری قسط نے ہی اپنے سحر میں جکڑ لیا، ویلڈن اُم مریم۔

''پربت کے اس پار کہیں'' نایاب جیلانی کا انوکھا اور سفر نامہ پر مبنی یہ ناول بڑی خوبصورتی سے اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے اس میں عمکیہ کا کردار مجھے اپنی ذات کے قریب نظر آتا ہے، معاملہ فہم، حالات پر قابو پانے کی صلاحیت مگر اندر سے حساس، پلیز اس کے ساتھ انصاف کیجئے گا اور اس کے اپنوں کے لئے خلوص کے جذبے کو خوشگوار صلہ سے نوازیے گا، ابن انشاء کی ''رباعی سے رکابی'' تک پڑھ کر لب ایکدم مسکرا اٹھے، پر مزاح مگر حقیقت سے قریب ترین، ''طواف محبت'' ابھی زیر مطالعہ ہے، صوفیہ چشتی صاحبہ ادب کی دنیا میں نیا نام لگ رہی ہیں مگر مصنفہ کی کوشش بہتر ہے، فوزیہ جی! آپ سے ایک پیار بھری شکایت ہے کہ میں نے شاعری سلیکشن کے لئے کئی نظمیں اور غزلیں بھیجی مگر ایک بھی شائع نہیں ہوئی، پلیز اس پر بھی نظر ثانی کریں۔

فرزانہ حبیب سب سے پہلے تو آپ کو زندگی کا نیا سفر شروع کرنے پر ادارہ حنا کی طرف سے دلی مبارک باد قبول کیجئے، اللہ تعالیٰ آپ کو بہت سی خوشیاں عطا کرے آمین۔

فروری کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ آپ کی شاعری ہمارے پاس محفوظ ہے، انشاء اللہ جلد شائع کریں گے، آپ کی محبتوں اور تحریروں کے ہم منتظر رہیں گے شکریہ۔

اُم رباب: ساہنگھڑ سے لکھتی ہیں۔

فروری کا شمارہ پانچ کو ملا، ٹائٹل کچھ خاص پسند نہیں آیا، حمد ونعت اور پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں سب سے پہلے پڑھی پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا جزاک اللہ۔

ہمیشہ کی طرح انشاء نامہ بھی بے حد پسند آیا، سلسلے وار تحریروں میں سب سے پہلے سدرۃ آپی کے ناول ''اک جہاں اور ہے'' کی طرف بھاگے پڑھ کر دلی سکون ملا نہ جانے سدرۃ آپی کے قلم سے لفظوں کا اک دریا ہے جو بہتا جا رہا ہے اس سے ہم جتنا بھی مستفید ہو سکے کم ہے ہر کردار اتنا پاورفل ہے اپنی اپنی جگہ کہ اللہ اگر کسی ایک کا بھی ذکر نہ ہو تو عجیب سی تشنگی محسوس ہونے لگتی ہے، واپس پلٹے تو اُم مریم کے ناول ''دل گزیدہ'' کی تیسری قسط پڑھی، پسند آئی، اُم مریم کی تحریر کی نمایاں خوبی جوائنٹ فیملی سسٹم ہے اور مریم اتنی خوبصورتی سے کرداروں کو جو ابتدا میں مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے ہیں اینڈ میں بڑی خوبصورتی سے ایک مالا میں اکٹھا کر دیتی ہیں، ''طواف محبت'' جی ہاں مریم کے بعد جو تحریر نظر آئی وہ یہی تھی، صوفیہ سرور چشتی ایک نیا نام ہے یقیناً، لیکن اپنی پہلی تحریر میں ہی چونکا گئی اپنے پڑھنے والوں کو، یقیناً آگے چل کر صوفیہ حنا میں بہترین اضافہ ثابت ہوں گی، فوزیہ آپی کی خوبی ہے کہ وہ نہ جانے کہاں کہاں سے مصنفین کو پکڑ کر لاتی ہیں اور ہمیں پڑھنے کے لئے بہترین تحریریں مہیا کر دیتی ہیں، دوسرا مکمل ناول ام ایمان کا تھا، ''زندگی تیرے دم سے'' اچھی کوشش کی مصنفہ نے لیکن کہانی کو کچھ زیادہ طویل کر دیا، ناولٹ میں فرح طاہر کا ''خواب خواہش اور آرزو'' اپنے اختتام کو پہنچا، فرح آپ نے بھی اپنی تحریر کو بلاوجہ

طویل کرکے بور کیا، ورنہ اگر اس کی ایک ہی قسط ہوتی تو شاید زیادہ متاثر کن ہوتی۔
تحسین اختر بھی کافی عرصہ بعد اپنی تحریر ''سوز دل'' کے ساتھ آئی، تحسین آپ کا ایک مخصوص انداز ہوتا تھا محبتوں پر لکھنا کیا وہ آپ بھول گئی؟

افسانے اس مرتبہ دو تھے عابی ناز نے بازی مارلی ''مقرر ہیں ہم'' نام پڑھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس بار ہمیں چلبلی اور شرارتی سی عابی ناز پڑھنے کو ملے گی، آپ کا لکھنے کا یہ انداز ہمیں بے حد پسند آیا ہے نہ جانے کیوں ہمیں آپ میں فائزہ چندا کی جھلک نظر آتی ہے، اپنا یہ انداز برقرار رکھیئے گا۔

اب آخری بات کروں گی اپنے سب سے پسندیدہ ناول ''پربت کے اس پار کہیں'' کی بہت خوب نایاب آپ اپنی تحریر کے ذریعے ہمیں خوبصورت وادیوں کی سیر کروا رہی ہیں سچ میں بہت سی جگہوں کا نام تو ہم آپ کی تحریر میں پڑھا ہے اور بے ساختہ دل چاہتا ہے کہ ہم بھی وطن عزیز کے ان خوبصورت مقامات کو جا کر دیکھیں۔
ناول میں میرا پسندیدہ کردار نشرہ اور اسامہ ہے جبکہ مورے کی عمکیہ کے لئے نفرت بلاجواز ہے اس صورت میں جبکہ وہ گھر کے ہر مسئلے کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے، جہاندار کا کردار خاصا پراسرار ہے یوں لگتا ہے جیسے وہ کسی خاص مقصد کے لئے سردار کبیر بٹو کے گھر میں آیا ہے، مجموعی طور پر نایاب کا یہ ناول بے حد دلچسپ ہے، بے چینی سے اگلی قسط کا انتظار ہے، ناول کے اینڈ پر مدیحہ تبسم کے والد محترم کی وفات کی خبر پڑھی، دلی افسوس ہوا دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے آمین۔
مستقل سلسلے سبھی بے حد اچھے تھے، حاصل مطالعہ میں سب دوستوں کی پسند بہترین تھی جبکہ بیاض اور میری ڈائری میں ہر ایک نے اپنا اپنا انتخاب لاجواب بھیجا، کس قیامت کے یہ نامے، جو ہمیشہ کی طرح پسند آئے، آپی میں پہلی مرتبہ شراکت کر رہی ہوں امید ہے آپ مایوس نہیں کریں گی۔

اُم رباب خوش آمدید، آپ اتنی دور سے تشریف لائیں، آئیں اور ادھر اطمینان سے بیٹھیں، یہ آپ سب قارئین کی اپنی محفل ہے ہم کیوں آپ کو مایوس کرنے لگے، فروری کے شمارے کے لئے آپ کی پسندیدگی اور محبتوں کا شکریہ اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا شکریہ۔

آسیہ وحید: فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔
فروری کا شمارہ سادہ سے ٹائٹل کے ساتھ پسند آیا، اسلامیات ہمیشہ کی طرح ایمان افروز تھا، ایک دن حنا کے ساتھ میں سندس جبیں کے ساتھ تھا پسند نہیں آیا، اپنی تحریروں کی نسبت اس میں خاصی روکھی پھیکی نظر آئیں، خط لکھنے کی وجہ ام مریم کا ناول ''دل گزیدہ'' ہے بہت شکریہ ادارہ حنا کا اس نے ام مریم کی تحریر دوبارہ پڑھنے کے لئے قارئین کو دی، ناول دونوں ہی اچھے تھے، مگر صوفیہ سرور چشتی کی تحریر نے زیادہ متاثر کیا، اُم ایمان نے بھی اچھا لکھا، فرح طاہر نے ناولٹ کا اختتام اچھا کیا، جبکہ تحسین اختر کی تحریر کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔

مدیحہ تبسم کے والد صاحب کی وفات کے متعلق پڑھ کر دلی رنج ہوا۔
آسیہ وحید خوش آمدید، فروری کے شمارے کے لئے آپ کی پسندیدگی کا شکریہ، اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا ہم منتظر رہیں گے شکریہ۔

☆☆☆